ترقی اردو بیورو
وزارت تعلیم حکومت ہند

تحریکِ خلافت

قاضی محمد عدیل عباسی

تحریکِ خلافت

قاضی محمد عدیل عباسی

ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی

پہلا ایڈیشن ——— 1000 ——— 1978ء ——— 1900 (شک)

© ترقی اردو بورڈ، وزارت تعلیم اور سماجی بہبود، حکومت ہند، نئی دہلی۔

TAHREEK-E-KHILAFAT
BY
QAZI MOHD. ADEEL ABBASI

قیمت: 12/- روپے

پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، بیورو فار پروموشن آف اردو، ویسٹ بلاک-8،
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی 110022 نے جے۔کے۔آفسیٹ پریس، جامع مسجد، دہلی سے چھپوا کر
ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی کے لیے شائع کیا۔

پیش لفظ

کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں مختلف سائنسی، علمی اور ادبی کتابیں لکھی جائیں اور دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے شائع کیے جائیں۔ یہ نہ صرف زبان کی ترقی کے لیے بلکہ قوموں کی معاشی اور سماجی ترقی کے لیے بھی ضروری ہے۔ اُردو میں اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتابوں، بچوں کے ادب، لغات اور سائنسی کتابوں کی ہمیشہ کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ حکومتِ ہند نے کتابوں کی اس کمی کو دور کرنے اور اردو کو فروغ دینے کے لیے ترقی اردو بورڈ قائم کر کے اعلا پیمانے پر معیاری کتابوں کی اشاعت کا ایک جامع پروگرام مرتب کیا ہے، جس کے تحت مختلف سائنسی و سماجی علوم کی کتابوں کے ترجمے اور اشاعت کے ساتھ لغات، انسائکلوپیڈیا، اصطلاحات سازی اور بنیادی متن کی تحقیق و تیاری کا کام ہو رہا ہے۔

ترقی اردو بورڈ اب تک بچوں کے ادب کے علاوہ بہت سی نصابی، علمی، ادبی اور سائنسی کتابیں شائع کر چکا ہے جنھیں اردو دنیا میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے، یہاں تک کہ بعض کتابوں کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن بھی شائع ہو رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی اشاعتی پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ اسے بھی علمی اور ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

(ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ عباس شارب)
پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، بیورو فار پروموشن آف اردو،
وزارتِ تعلیم اور سماجی بہبود، حکومتِ ہند

اپنی مرحومہ شریکِ حیات

نجم النساء بیگم

کے نام

فہرست

دیباچہ	12
پہلا باب:۔ مسئلہ خلافت کی نوعیت	15
دوسرا باب:۔ مسلمانوں کی روحانی اذیت کے اسباب	21
1 ۔ مسئلہ خلافت کا تقدس	21
2 ۔ ترکی اور بلادِ یورپ	21
3 ۔ سلطان عبدالحمید	28
4 ۔ معلمینِ امت	29
5 ۔ حرمین الشریفین	30
6 ۔ ایک اور وجہ	30
تیسرا باب:۔ میدانِ عمل	36
1 ۔ قانونی جدوجہد	37
2 ۔ خلافت کمیٹی کا قیام	37
3 ۔ جمعیۃ علماء ہند	39
4 ۔ علمائے ربانی اور جہاد بالسیف۔ ہندوستان میں متحدہ جمہوری حکومت کا تخیل	40
چوتھا باب:۔ جنگ عظیم اور ہندوستانی سیاست	51
1 ۔ عالمگیر جنگ 1914 —— 1918ء	52

2 ۔ جنگ میں ترکی کی شرکت 52
3 ۔ دوران جنگ ہندوستان کا حال 54
4 ۔ سرسید اور سیاست ہند 57
5 ۔ علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج 61
6 ۔ دوران جنگ برطانیہ کا طرز عمل اور ناکام مقابلہ 63
7 ۔ لکڑی کا صندوق 65
8 ۔ ریشمی رومال 66
9 ۔ حکومت برطانیہ کے وعدے 67
10 ۔ مولانا محمد علی کی نظر بندی 69
11 ۔ مولانا ابوالکلام آزاد 71
12 ۔ عارضی صلح یا التوائے جنگ 74
13 ۔ راہ عمل کی تلاش 76
14 ۔ مسز بسنٹ اور ہوم رول 78
15 ۔ لیڈر کی آمد 79
16 ۔ رولٹ بل 81
17 ۔ سوامی شردھانند کی جامع مسجد میں تقریر 84
18 ۔ جلیانوالہ باغ کا قتل عام 86
19 ۔ رابندر ناتھ ٹیگور کا رد عمل 88
20 ۔ جنگ استقلال افغانستان 88
21 ۔ راولپنڈی کانفرنس 92
22 ۔ امیر امان اللہ خاں 93
23 ۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس 94
24 ۔ یوم دعا 99
25 ۔ خلافت کمیٹی اور مہاتما گاندھی 102
26 ۔ مولانا محمد علی کی رہائی اور اجلاس کانگریس امرت سر 102

27 ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس 103
28 ۔ عرب میں انگریزوں کی ریشہ دوانی 106
29 ۔ صلح کانفرنس لندن 108
پانچواں باب :۔ تاج برطانیہ کی وفادار رعایا کی عرضداشتیں 111
1 ۔ انجمن مویدالاسلام فرنگی محل کا جلسہ 111
2 ۔ مقیم لندن حضرات کی عرضداشت 112
3 ۔ وزیر ہند کا جواب 113
4 ۔ یہودی اور فلسطین 114
5 ۔ اخبارات کے تبصرے 115
6 ۔ تمام دنیا میں وفد لے جانے کا خیال 117
7 ۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تجویز 117
8 ۔ دارالعلوم دیوبند کا رویہ 118
9 ۔ وفد خلافت اور مہاتما گاندھی 118
10 ۔ وفد خلافت کی کارگزاریاں 120
11 ۔ مسٹر لائیڈ جارج سے ملاقات 121

چھٹا باب :۔ مذہب کی راہ سے مسلمانوں کو سیاست میں لانے کے لیے
مولانا آزاد کی کوشش 127
1 ۔ بیعت امامت 127
2 ۔ تحریک ہجرت 131
3 ۔ ہندوستان میں جوش وخروش 139
4 ۔ میرٹھ خلافت کانفرنس 140
5 ۔ دیوبند کا عظیم الشان جلسہ 142
6 ۔ 19 مارچ 1920ء ۔ یوم خلافت 143
7 ۔ لاہور میں ڈاکٹر کچلو کی معرکتہ الآرا تقریر 145

8 ۔ علمائے صوبہ متحدہ کا عظیم الشان جلسہ 146
ساتواں باب :۔ اعلان وفاداری کا انجام 148
1 ۔ حالات یورپ و ترکی 148
2 ۔ اناطولیہ 148
3 ۔ تھریس 149
4 ۔ یونان کا حملہ 149
5 ۔ معاہدہ سیورے (ترکی کے ساتھ شرائط صلح) 151
آٹھواں باب :۔ مہاتما گاندھی کا اعلان جنگ 153
1 ۔ مہاتما گاندھی کی قیادت 153
2 ۔ دور خود شناسی 155
3 ۔ گورنمنٹ کو الٹی میٹم 155
4 ۔ دھماکے کا وقت آرہا ہے 157
5 ۔ یکم اگست 1920ء "زیرو آور" 157
6 ۔ پانچ سو علماء کی جانب سے ترک موالات کا فتویٰ 159
7 ۔ لوکمانیہ تلک 161
8 ۔ کلکتہ میں کانگریس کا اسپیشل اجلاس 162
9 ۔ ناگپور کانگریس 163
10 ۔ امن سبھا 165
11 ۔ ضلع کانگریس کانفرنس الٰہ آباد 166
12 ۔ مولانا محمود حسن کی آمد اور جمعیۃ علمائے ہند کی کارگزاری 167
13 ۔ جمعیۃ علماء کا دوسرا سالانہ اجلاس 168
14 ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام 169
نواں باب :۔ تحریک عروج پر 174
1 ۔ نیا ہندوستان 174
2 ۔ علی گڑھ پر دھاوا 176

3۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ پر مولانا آزاد کا دھاوا 177
4۔ ایک کروڑ روپے کی فراہمی کی کہانی 179
5۔ کھدر کی اسکیم اور پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ 180
6۔ مہاتما گاندھی کا ملک گیر دورہ 181

دسواں باب:۔ حکومت کا ردعمل 183
1۔ کراچی کا مقدمہ 183
2۔ عدالت سیشن کی کارروائی 186
3۔ افغانی ہوّا 186
4۔ حکومت کا رویہ 191
5۔ خواتین 192
6۔ چند مثالیں 193
7۔ مولانا آزاد کا پیغام 196
8۔ باپ کا خط بیٹے کے نام 196
گیارھواں باب:۔ جنگ ترکی و یونان 199
1۔ سمرنا پر یونانی قبضہ 199
2۔ مصطفیٰ کمال کا تدبّر 210
3۔ اماسیہ کا اہم جلسہ 202
4۔ ترکی کی فوجی حالت اور یونانیوں کے مظالم 203
5۔ مصطفیٰ کمال برخاست 204
6۔ بولشویکوں سے تعلقات 201
7۔ ترکانِ اناطولیہ کا جوش 208
8۔ اختصار فتویٰ شیخ الاسلام با جلاس مجلس جدید
مشیران سلطنت و داماد فرید پاشا 210
9۔ فتویٰ حجۃ الاسلام جناب شیخ الاسلام قسطنطنیہ 211

۱۰ - یونان کا حملہ	212
۱۱ - یونان کا دوسرا حملہ	213
12 - یونان کا تیسرا حملہ	214
13 - ترکی وفد کے نتائج	215
14 - فرانس سے جنگ	218
15 - لوزان کانفرنس	218
16 - معاہدہ سیورے میں ترمیم	219
17 - تحریک خلافت کا اثر فتح ترکی پر	221
دسواں باب: تحریک خلافت کا دوسرا دور	225
1 - حکومت بمبئی کا کمیونک اور مہاتما گاندھی کا جواب	225
2 - بردولی میں سول نافرمانی	227
3 - پرنس آف ویلز کی آمد	228
4 - حکومت کا رویہ اور تحریک میں نیا خون	230
5 - آنکھوں دیکھا حال	231
6 - آگرہ صوبائی خلافت و کانگریس کانفرنس	234
7 - احمد آباد کانگریس	237
8 - مسٹر محمد علی جناح	239
9 - اندرا گاندھی	240
۱۰ - صلح کی بات	240
۱۱ - احمد آباد کانگریس کے بعد	241
12 - آل پارٹیز کانفرنس	241
13 - بردولی میں پھر سول نافرمانی	242
14 - چورا چوری کا واقعہ	243
15 - گاندھی جی کی گرفتاری	244

16۔ گاندھی اور رہائی 245
17۔ کونسلوں میں داخلہ 247
18۔ ترکی کا حال 247
19۔ شبہات ۔ کانگریس میں اختلاف آراء 248
20۔ گاندھی جی کی رہائی 250
21۔ ملاپ کانفرنس 250
22۔ خلافت کانفرنس بلگام 253
تیرھواں باب:۔ خلافت کا خاتمہ 254
1۔ احیائے خلافت اسلامیہ کی ایک اور کوشش 258
2۔ خلافت کانفرنس لکھنؤ 265
3۔ ایک آخری سوال 268
4۔ تحریک خلافت کے انعامات و تاثرات 269
5۔ وطنی جذبہ 271
6۔ انگریز سے دشمنی 274
7۔ سادگی اور خود آگاہی 276
8۔ عصر جدید 276
ضمیمہ کتابیں جو مطالعے میں آئیں

دیباچہ

جب مجھ سے فرمائش کی گئی کہ یک ہفتہ وار اخبار میں "تحریک خلافت" پر ایک سلسلۂ مضامین لکھوں تو میں نے فوراً اسے منظور کر لیا اور بطور تمہید چند قسطیں "تاریخ ترکی پر ایک اچٹتی نظر" کے عنوان سے لکھ بھی دیں۔ خیال تھا کہ اس کے بعد بس قلم برداشتہ لکھ دوں گا، کیونکہ میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ چونکہ خود اس تحریک میں شریک تھا اور بہت سا آنکھوں دیکھا حال ہے اس لیے دقت کیا ہوگی لیکن پھر کچھ دنوں دوسرے کاموں میں لگے رہنے کے بعد جب اچانک اس وعدے کی تکمیل کا ایک دن خیال آیا اور خیالات کو مجتمع اور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ کام بے حد مشکل ہے۔

"تحریک خلافت" پر قلم اٹھانے کے معنی یہ تھے کہ عصر قدیم کی رعنائیوں اور عصر جدید کے طلوع ہونے والے آفتاب کی تابناکیوں کا مطالعہ کیا جائے —— بستی جیسے دور افتادہ مقام پر نہ اس کے لیے کتابیں میسر تھیں اور نہ اخبارات اور نہ میرے پاس اتنا وقت تھا کہ میں تلاش میں سفر کروں۔ اس لیے جو کچھ میسر ہو سکا اسی پر اکتفا کرنی پڑی۔

جہاں تک تحریک خلافت کی تاریخ کا سوال ہے دیکھا گیا ہے کہ اکثر مصنفین و مؤرخین اس پر سرسری گزر گئے اور جس نے کچھ لکھا بھی تو تاریخ تو کجا ہے ابھی تک موجود نہیں۔ اس کے تحقیقاتی مطالعہ کے لیے اخبارات کی فائلیں درکار تھیں لیکن بجز مشرق اور زمیندار لاہور کے چند پرچوں کے جو ایک عزیز کے ہاں محفوظ تھے ہمدم (لکھنؤ) سیاست (امرتسر) مدینہ (بجنور) اور بندے ماترم (لاہور) وغیرہ کی کوئی فائل نہ مل سکی۔ یہاں تک کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اخبارات کی کل فائلیں جلا دی گئی ہیں۔ البتہ گاندھی جی کی زندگی پر بہت لوگوں نے لکھا ہے اور اس سے کافی امداد ملی۔ کیونکہ 1918ء سے 1925ء تک گاندھی جی کی زندگی اور تحریک خلافت ایک ہی دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں۔

اسلامی خلافت کا تصور اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ اسلام کا۔ لیکن آج وہ ایک بھولا ہوا سبق ہے۔ ممکن ہے اس کا یاد دلانا بعض لوگوں کے نزدیک نہ صرف غیر ضروری بلکہ زمانہ حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں نامناسب ہو لیکن اس سلسلے میں دو باتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اوّل یہ کہ جو لوگ اسلام کی ہر ہر چیز پر عقیدہ رکھتے ہیں ان کے لیے ان واقعات سینہ کی یاد تازہ رکھنا ضروری ہے جو اصولاً صحیح اقدار ہوتے ہوئے محرومی کا شکار ہو گئے اور جن پر عمل درآمد ہو یا نہ ہو بطور عقیدہ ان کا ذہنوں میں رہنا بس لازمی ہے۔ تحریک خلافت کا یہ پہلو بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ اسی سے ہمارے ملک میں آزادی کامل کی بنیاد پڑی اور ہندو مسلم اتحاد کا بیج بویا گیا۔ اوّل مرتبہ ہندوستان برطانیہ کی رعایا ہونے پر فخر کرنے کی ذلت سے نکلا اور باشندۂ ملک نے خودداری اور خود اعتمادی کی فضا میں اپنے کو ہندوستانی کہنے پر فخر کرنا دریافت کیا۔ تحریک خلافت ایک مشعل تھی جس نے ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا اور اس اجالے میں اس نے اپنے آپ کو دیکھا اور پایا۔

یہ صحیح ہے کہ تحریک خلافت کے روح رواں مہاتما گاندھی تھے لیکن اس طرح یہ بھی صحیح ہے کہ تحریک خلافت نے گاندھی جی کو ہندوستان کو متحد کرنے اور اسے آزادی کامل کی منزل کی جانب گامزن کرانے کا مواد فراہم کیا اس لیے جن لوگوں کو تحریک آزادی ہند کی تاریخ سے دلچسپی ہے ان کو تحریک خلافت کا بنظر غائر مطالعہ کرنا چاہیے۔

یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ میری غرض ہندوستان کے اندر تحریک خلافت کا ذکر کرنا ہے۔ در جنگ یونان و ترکی اور عوامل خلافت اس بحث سے متعلق ہیں۔ ان کے علاوہ اور جو امور آئے ہیں اور جن کا تعلق بیرون ہند سے ہے ان پر سے سرسری گزر جانا ہی مناسب نظر آیا۔ ان کا تذکرہ صرف اس لیے کیا ہے کہ یا تو ان کا تعلق اندرون ہند تحریک خلافت و تحریک آزادی سے تھا یا حالات ترکی پر وہ اثر انداز ہوئے۔ اس عظیم کام کا بوجھ اٹھانے کے لیے میرے کندھے کمزور تھے لیکن میں نے ہمت کر کے اس کو انجام دیا۔ اگر اسے نقش اوّل تصور کر کے کسی صاحب عزم میں نقش ثانی کی ترغیب پیدا ہو تو میں اسے اپنی کامیابی تصور کروں گا۔

میں حکیم ابوالکلام صاحب گورکھپور، جناب واحد صاحب مالک واحد لائبریری گورکھپور، سید محمد یسین صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ، جناب صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب دارالمصنفین اعظم گڈھ، مقبول احمد صاحب پرنسپل خیر انٹر کالج بستی، مولانا عبدالحمید صاحب سابق ناظم اہل حدیث کانفرنس اور ان تمام لوگوں کا شکر گذار ہوں جنھوں نے کتابیں فراہم کیں اور اخبارات و رسائل مہیا کیے اور میری ہمت افزائی کی۔ خاص طور پر عزیزی حامد علی صاحب میونسپل کمشنر گورکھپور نے میری معاونت کی۔ عزیز موصوف کی ذاتی وسیع لائبریری واقع کوٹھی گلفشاں محلہ قاضی پور سے مشرق کے اکثر اور زمیندار کے کچھ نایاب پرچے مجلد شکل میں اور بہت سی کتابیں ملیں جن کے بغیر یہ کتاب مکمل نہیں

ہو سکتی تھی میں عزیز موصوف کی اس معاونت کے لیے دعاگو ہوں

میں نے یہ کتاب اپنی مرحومہ شریک حیات کے نام معنون کی ہے۔

میری شادی 21 اپریل 1918ء کو نجم النساء بی بی سے ہوئی تھی۔ اس وقت میری عمر 18-19 سال اور اس کی عمر 16-17 سال تھی 1920ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد میں نے یونیورسٹی آف الہ آباد میں داخلہ لیا اور ناگپور کانگریس کے بعد ترک موالات کی تحریک میں شریک ہو گیا۔ ترک تعلیم کے بعد جب میں گھر پہنچا تو وہاں غصہ اور نا امیدی کا ایک طوفان پایا اور میرے اوپر ہر طرح کا دباؤ اس تحریک سے الگ رہنے کے لیے ڈالا جا رہا تھا۔ میں بہت مغموم تھا اور چپکے چپکے بھاگ کر جیل جانا چاہتا تھا لیکن میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا تم اتنے مغموم اور رنجیدہ کیوں رہتے ہو؟ میں نے کہا تم گھر کا رنگ ڈھنگ دیکھ رہی ہو میں بھاگنا اور جیل جانا چاہتا ہوں۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے بلا یک لمحہ توقف کے کہا "تو پھر بھاگ جاؤ اور جیل چلے جاؤ" میں نے کہا "لیکن میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے، بھاگ کر کہیں جاؤں تو کیسے" اس نے بڑی خندہ پیشانی سے فوراً کہا "کل مجھے جو دس روپے دے گئے ہیں اس کو لے لو اور بھاگ جاؤ" حالانکہ رسم و رواج وقت کے مطابق یہی اس کی کل پونجی تھی۔ یہ رقم میرے لیے ایک نعمت سے کم نہیں تھی۔ میں رات میں بھاگ کر نکل گیا اور کانپور مولانا حسرت موہانی کے پاس پہنچا وہاں سے بجنور "مدینہ" اخبار میں گیا۔ احمد آباد کانگریس کے بعد اخبار "زمیندار" لاہور کا بحیثیت چیف ایڈیٹر چارج لیا اور گرفتار ہو کر ایک سال لاہور سنٹرل جیل میں رہا — زندگی میں آسودگی نفس کے بہت سامان ملے لیکن یہ دس روپے جو اس نے دیے تھے اور جس وقت اس نے مجھے تحریک میں کودنے اور جیل جانے کی ترغیب دی تھی حالانکہ وہ ایک اردو خواں پردہ نشین کمسن لڑکی تھی اور اس وقت جیل کا خیالی منظر بڑا ہولناک تھا مجھے ہمیشہ یاد رہا 15 دسمبر 1972ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی یاد سے اس کتاب کو نسبت دینے میں انسب ترین سمجھتا ہوں۔

محمد عدیل عباسی

پہلا باب

مسئلۂ خلافت کی نوعیت

خلافتِ مرکزیہ اسلامیہ کا تصور اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ اسلام کا۔ فروری 1920ء میں بنگال کی صوبائی خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مبسوط خطبۂ صدارت میں مسئلۂ خلافت کی شرعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اسلام کا قانونِ شرعی یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ و امام ہونا چاہیے۔ خلیفہ سے مقصود ایسا خود مختار مسلمان بادشاہ اور صاحبِ حکومت و مملکت ہے جو مسلمانوں اور ان کی آبادیوں کی حفاظت اور شریعت کے اجرا و نفاذ کی پوری قدرت رکھتا ہو اور دشمنوں سے مقابلہ کے لیے پوری طرح طاقتور ہو........"

"صدیوں سے اسلامی خلافت کا منصب سلاطینِ عثمانیہ کو حاصل ہے۔ اور اس وقت از روئے شرع تمام مسلمانانِ عالم کے خلیفہ و امام وہی ہیں۔ پس ان کی اطاعت و اعانت تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ جو ان کی اطاعت سے باہر ہوا اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور اسلام کی جگہ جاہلیت مول لی، جس نے ان کے مقابلہ میں لڑائی کی یا ان کے دشمنوں کا ساتھ دیا اس نے خدا اور اس کے رسول سے لڑائی کی۔ اسلام کا حکم شرعی ہے کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھا جائے۔ اس میں عراق کا ایک حصہ اور بغداد بھی داخل ہے پس اگر کوئی غیر مسلم حکومت اس پر قابض ہونا چاہے یا اس کو خلیفۂ اسلام کی حکومت سے نکال کر اپنے زیرِ اثر لانا چاہے تو یہ صرف ایک اسلامی ملک کے نکل جانے کا مسئلہ نہ ہوگا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک مخصوص سنگین حالت پیدا ہو جائے گی یعنی اسلام کی مرکزی سرزمین پر کفر کا اثر چھا جائے گا۔ پس اس حالت میں تمام مسلمانانِ عالم کا اولین فرض ہوگا کہ وہ اس قبضہ کو وطن سے ہٹانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی تمام قوتیں اس کام کے

لیے وقف کریں۔

"اسلام کے مقامات مقدسہ میں بیت المقدس اسی طرح محترم ہے جس طرح حرمین شریف۔ اس کے لیے لاکھوں مسلمان اپنی جان کی قربانیاں اور یورپ کے آٹھ صلیبی جہادوں کا مقابلہ کر چکے ہیں۔ پس تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقام کو دوبارہ غیر مسلموں کے قبضہ میں نہ جانے دیں۔ بالخصوص مسیحی حکومتوں کے قبضہ واقتدار میں۔ اور اگر ایسا ہو رہا ہے تو اس کے خلاف دفاع کرنا صرف وہاں کی مسلمان آبادی ہی کا فرض نہ ہوگا بلکہ بیک وقت دفعہ تمام مسلمانان عالم کا فرض ہوگا[1]

مشہور نو مسلم انگریز مصنف و مترجم قرآن مسٹر محمد مارماڈیوک پکتھال سابق ایڈیٹر بمبئی کرانیکل نے ڈاکٹر سید محمود کی کتاب "خلافت اور اسلام" کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"مذہب اسلام حیات انسانی کا مکمل قانون ہے اور تہذیب و شائستگی کا مخزن ہے جو ابھی تک اپنے عروج کو نہیں پہنچا ہے۔ خدا کے قوانین جو بنی نوع انسانی پر کلیتاً حکمران ہیں اور وہ قوانین جن کی پابندی پر انسانی زندگی کی اخلاقی ترقی مبنی ہے سوائے قرآن شریف کے اور کسی کتاب میں صراحت کے ساتھ درج نہیں ہیں۔"

"اسلامی تہذیب قوانین الٰہی پر مبنی ہے، خلیفہ اس کا دنیوی سردار ہے خواہ اہل عرب ہو یا غیر اہل عرب۔ خواہ اس کا دار الحکومت بغداد ہو، مدینہ ہو یا قسطنطنیہ اور اسلامی تہذیب اور ترقی کا مرکز ملک کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے۔"[2]

اب پچاس سال گزرنے کے بعد جب خلافت کا وجود بھی باقی نہیں ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ یہ مسلمانوں کا مذہبی مسئلہ نہ تھا اور تمام ہندوستانیوں نے اسے غلط سمجھا تھا تو یہ بڑی جسارت کی بات ہوگی۔ اسلام کے مذہبی مسائل وقت کے ساتھ بدلا نہیں کرتے۔ معذوری دیگر چیز ہے۔

تحریک خلافت کی قیادت ابتدا سے انتہا تک مہاتما گاندھی کے ہاتھوں میں رہی بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح اور بجا ہوگا کہ اگر مہاتما گاندھی اس تحریک میں پوری قوت کے ساتھ شامل ہو کر اس کا کل بار اپنے کندھوں پر

---

[1] مولانا آزاد کا یہ خطبہ صدارت نظر ثانی اور ضمیموں کے اضافے کے ساتھ کتابی شکل میں "مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب" کے نام سے البلاغ پریس (کلکتہ) سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس وقت میرے پیش نظر حالی پبلشنگ ہاؤس (دہلی) کا نسخہ ہے جو ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ اقتباس اسی ایڈیشن کے صفحہ 265 سے اخذ کیا گیا ہے۔

[2] خلافت اور انگلستان:۔ ڈاکٹر سید محمود (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) دیباچہ

نہ لیتے تو تحریک خلافت میں جو زور پیدا ہوا وہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ مہاتما گاندھی اس اعلان کے ساتھ تحریک خلافت میں شریک ہوئے تھے کہ یہ مسلمانوں کا مذہبی معاملہ ہے۔ اور جب ہمارے مسلمان بھائی بے چین ہیں تو ہم کیسے خاموش رہ سکتے ہیں۔ گاندھی جی نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں بارہا کہا ہے کہ تحریک خلافت کو مسلمانوں کا ایک مذہبی معاملہ سمجھ کر میں اس میں شریک ہوا ہوں۔ زوال خلافت کے بعد مہاتما گاندھی نے کہا کہ اگر مجھے یہ خبر پہلے بھی ہوتی اور مجھے معلوم ہوتا کہ ترکی میں خلافت توڑ دی جائے گی تب بھی میں اس میں اسی عزم و حوصلے سے شرکت کرتا۔ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو، مسز اینی بیسنٹ، بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے، پنڈت مالویہ، راجگوپال اچاریہ وغیرہ اسی موقف کے حامی تھے۔ مسلمانوں میں ہر طبقہ خیال اور ہر نقطہ نظر کے علماء، دانشور، سیاستدان "خلافت" کو خالص مذہبی معاملہ سمجھتے اور اسی کے مطابق استدلال کرتے تھے۔ ہند کے علماء اور صوفیائے ہند فرنگی محل، ندوۃ العلماء، بریلی، دیوبند اور مدرسہ دیوبند میں حنفی، دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث علماء، اور خانقاہوں کے سجادہ نشینوں میں خلافت کی نوعیت مذہبی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر یہ کسی ایک مسئلہ پر علمائے ہندوستان کبھی اس طرح متفق نہیں ہوئے۔ لیڈران قوم میں حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حسرت موہانی، ظفر علی خاں اور لیڈران مسلم لیگ سب مضطرب و بے چین اور خلافت اسلامی اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کے لیے انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔

بعض لوگوں نے مسئلہ خلافت کو رومن کیتھولک کے پوپ سے تشبیہ دی ہے جو مملکت سے محروم ہونے کے بعد بھی بالشافہ روحانی اقتدار برقرار رکھے ہوئے ہے۔ چنانچہ جب مولانا محمد علی کی قیادت میں خلافت وفد نے مسٹر لائیڈ جارج سے لندن میں بحث کی کہ خلافت مسلمانوں کا ایک مذہبی مسئلہ ہے اور حکومت برطانیہ کو اس میں مداخلت نہ کرنی چاہیے تو مسٹر لائیڈ جارج نے اپنی جوابی تقریر میں کہا:

"خلافت کی دنیوی طاقت کا ایک دوسرا مسئلہ یہاں پیش کیا گیا ہے۔ مسٹر محمد علی اس سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ایک روحانی پیشوا کی دنیوی طاقت کا مسئلہ صرف اسلام سے ہی متعلق نہیں ہے۔ عیسائی دنیا میں بھی یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بنا ہوا ہے۔ رومن کیتھولک گرجا کے سربراہ سے دنیوی اختیارات کے سلسلے میں ایک نسل سے زیادہ مدت سے ہولناک تنازعہ جاری ہیں۔ کچھ رومن کیتھولک تو دنیاوی اختیارات کے حق میں ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کے حق میں نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں اپنی رائے تو میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا ہوں لیکن جب پوپ کو اس کی دنیاوی طاقت سے محروم کر دیا گیا تو اس کی روحانی قوت ویسی ہی عظیم رہی بلکہ عظیم تر ہو گئی۔"

مسٹر لائیڈ جارج نے یا تو تجاہل عارفانہ سے کام لیا یا وہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے ناواقف تھے۔

عیسائی مذہب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صرف تین سال کی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ عیسائی مذہب میں نہ کوئی قانون ہے اور نہ حکمرانی کے قواعد ہیں بلکہ حکمرانی کا ذکر تک نہیں ہے۔ اسلام نے زندگی کے ہر شعبہ کے لیے قوانین وضع کیے ہیں۔ حکمرانی کے دستور بتدئے ہیں اور غوغائے عالم سے نبرد آزما ہونے کی تعلیم دی ہے جو بلا قوت و حکومت ناممکن ہے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام تعلیمات تزکیۂ نفس و اخلاق عالیہ کے ساتھ ایک سپاہی، ایک سپہ سالار، ایک مدبر اور ایک حکمران بھی تھے۔ اور اسی کی جانشینی کا نام خلافت پانا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے اسلام میں کسی ایسی روحانی خلافت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے جس میں سیاست ضوابط رول آف لا حکمرانی اور طاقت و شوکت نہ ہو۔ مولانا محمد علی نے اپنے آخری جواب میں یہ بات کہہ کر ختم کر دی کہ:۔

"ہم پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی تھی کہ مسٹر کی دنیاوی طاقت برقرار رکھنے، مسلمانوں کے مقدس مقامات پر اس کی نگرانی کو بحال اور ان پر قبضہ تسلیم کرانے کے معاملات کو بھی طرح پیش کریں۔ ہم نے وائسرائے اور مسٹر مانٹیگو کے سامنے یہ مسائل پیش کیے۔ آپ سے یہ بھی کہا ہے کہ ہم اپنے مذہبی معاملات کو ہر موقع پر اولیت دیں گے"[1]

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے مضمون "مسئلہ خلافت اور جمہوریہ ترکیہ" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ سلطنت اور خلافت کی تفریق کی تائید میں جس قدر توجیہات کی جا رہی تھیں اور وظائف دو عہدوں کی تقسیم کے رنگ میں اسے دکھلایا جا رہا تھا محض کاغذی نمائش تھی۔ عملی طور پر کسی ایسی تقسیم کا وجود نہ تھا اور نہ وجود میں آسکتی تھی۔

پوپ سے جب سلطنت علیحدہ کر لی گئی تو اس کے کاروبار کے بہت سے محکمے باقی رہ گئے۔ مثلاً گناہوں کی معافی، پروانہ ہائے تجارت کی تقسیم، احکام شرع میں ترمیم و تنسیخ اور رومن کیتھولک چرچ کی بادشاہت، کلیسائی اعمال اور جمعیت کی نگرانی وغیرہ۔ لیکن اس نئے منصب پر متمکن ہو کر خلیفہ عبدالمجید خان کے لیے کوئی کام باقی نہیں... گناہوں کی معافی اور جنت و دوزخ کا کاروبار تو یہاں تھا ہی نہیں"[2]

ترکی خلافت یورپ بستے اور افریقہ میں بر عظیم تک پھیلی ہوئی تھی اور گرچہ یہ زوال پذیر تھی اور مغرب والوں نے اس کا نام "یورپ کا مرد بیمار" رکھ دیا تھا مگر اس مرد بیمار سے اعزہ اور خاندان والے اس وقت تک امید افزا قدر و حرمت رکھتے ہیں جب تک کہ واقعی اس پر موت نہ طاری ہو جائے۔ ترکی کے حصے بخرے ہو رہے تھے لیکن اس کے ساتھ اس کے اصلاحات واحیاء کی تدبیریں بھی جاری تھیں جن میں خاص کر نوجوان ترکوں کا منظر عام پر ظہور تھا اس لیے

---

[1] معارف اعظم گڑھ۔ جنوری 1973ء محمد علی کی یاد میں۔ از صباح الدین عبدالرحمن۔

[2] تبرکات آزاد۔ مرتبہ غلام رسول مہر ص 266

امیدیں جاگ رہی تھیں۔ اب ایک دم جب ایسی صورت پیش آئی کہ امید کی نبضیں ڈوبنے لگیں تو اضطراب اپنی حد کو پہنچ گیا۔

رائٹ آنریبل سید امیر علی نے جو برطانیہ کے معاملہ میں معتدل اور محتاط رویہ رکھنے والے تھے وہ بھی اس پر مجبور تھے۔ انھوں نے ٹائمز آف لندن میں ایک معرکتہ الآرا مضمون لکھا جس کا حاصل وہی تھا جو اوپر بیان ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر خلافت ترکیہ ختم ہوگئی تو مسلمانان عالم ایک بڑے گرداب کی نذر ہوجائیں گے۔ وہ آج تک ترکی کو محافظ اسلام سمجھتے آئے ہیں اور اس کے زوال کو اسلام کا زوال تصور کرنے پر مجبور ہوں گے۔

تحریک خلافت اس وقت شروع ہوئی جب دول یورپ کے عروج کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور ایشیا و افریقہ موت کی نیند سو رہے تھے۔ مگر اس وقت سے ایک کے زوال اور دوسرے کی بیداری کا بھی آغاز ہوا۔ یعنی ایک عہد رخصت ہو رہا تھا اور دوسرا عہد جنم لے رہا تھا۔ بقول علامہ اقبال ایک نئی دنیا اور اس میں بسنے کے لیے نئے آدم کی تعمیر ہو رہی تھی۔ اس لیے یہ کتاب مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ ماضی اور حال کی تاریخ اور دونوں عہد کی قدروں کا جائزہ نہ لیا جائے۔ اسی زمانہ میں روس میں انقلاب آیا اور زار روس کی عظیم الشان حکومت کے پرخچے عوام نے اڑا دیے۔ بولشویک اور منشویک کی جنگ بھی اسی وقت ہوئی۔ لینن اور اسٹالن نئے فلسفہ حیات یعنی مارکسزم کو لے کر نمودار ہوئے اور امریکہ نے یورپ کے معاملات میں دلچسپی لینی شروع کی۔

جہاں تک ترکی اور بلاد اسلامیہ کا سوال ہے وہ سب کچھ ہوا جس کا خطرہ ایک عرصے سے چلا آ رہا تھا۔ لیکن ملکوں کے سوال کے ساتھ ساتھ قوموں میں خودشناسی کے جوہر بھی چمکے۔ شریف حسین، سلطان عبدالمجید، امیر حبیب اور سلطان وحید الدین کی غداریاں اور ضمیر فروشیاں بھی معرض وجود میں آئیں اور ان کا زوال بھی ہوا۔ ہندوستان نے بھی انگڑائی لی۔ لوکمانیہ تلک کی انتہا پسند پارٹی معتدلین پر غالب نہ آسکتی تھی اور انگریز معمولی اصلاحات کے جال میں پھنسا کر ہندوستان میں اپنا پنجہ انھیں معتدلین کے ذریعہ مضبوط رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک عظیم انسان گاندھی نے پورے ملک کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی اور معتدلین عوام کے جذبہ خودشناسی کے طوفان میں جو گاندھی کا پیدا کردہ تھا تنکوں کی طرح بہہ گئے۔

تحریک خلافت کا یہ پہلو بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ اسی سے ہمارے ملک میں آزادی کامل کی بنیاد پڑی اور ہندو مسلم اتحاد کا بیج بویا گیا۔ اول مرتبہ ہندوستان برطانیہ کی رعایا ہونے پر فخر کرنے کی ذلت سے باہر نکلا اور ہر باشندۂ ملک نے خودداری اور خوداعتمادی کی فضا میں اپنے کو ہندوستانی کہنے پر شرم نہ کرنا دریافت کیا۔ تحریک خلافت ایک مشعل تھی جس نے ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا اور اس اجالے میں اس نے اپنے آپ کو دیکھا اور پا لیا۔

یہ صحیح ہے کہ تحریک خلافت کے روح رواں مہاتما گاندھی تھے لیکن اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ تحریک خلافت نے گاندھی جی کو ہندوستان کو متحد کرنے اور اسے آزادی کامل کی منزل کی جانب گامزن کرنے کا مواد فراہم کیا۔ اس لیے جن لوگوں کو تحریک آزادی ہند کی تاریخ سے دلچسپی ہے ان کو تحریک خلافت کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنا چاہیے۔

تحریک خلافت ہی کے زمانے میں جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا جس کے روشن خیال علماء نے آخر وقت تک کانگریس اور گاندھی جی کے پیام عمل کی تائید کرتے ہوئے ملک کی آزادی کے لیے دار و رسن کو دعوت دی اور مسلم لیگ کا تادم آخر مقابلہ کر کے تقسیم پر کبھی راضی نہ ہوئے۔

جس وقت تحریک خلافت کا آغاز ہوا مسلمانوں میں بہترین دل و دماغ رکھنے والے دانشور موجود تھے مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مفتی کفایت اللہ، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری، مولانا احمد حسین مدنی، مولانا محمد سجاد بہاری، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی، مولانا احمد سعید، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی، مشیر حسین قدوائی، ظفر الملک علوی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مسٹر مظہر الحق، ڈاکٹر سید محمود، آغا صفدر پنجاب اور ظفر علی خاں وغیرہ۔

یہ وہ لوگ تھے جو تحریر و تقریر، علم و فن، فکر صالح اور تحقیق کے علاوہ میدان عمل کے بھی مجاہد تھے۔ ان میں انشاء پرداز بھی تھے اور شاعر بھی، علوم دینیہ کے مجتہد اور محقق بھی، اور علوم دنیا اور علوم مغرب کے شناسا اور امام بھی۔

یہ تمام اکابرین ملت اس سرفروشانہ جد و جہد میں پورے انہماک اور بے جگری سے شریک ہو گئے اور تحریک خلافت تحریک آزادی ہند میں تبدیل ہو گئی اور ہندوستان کے تمام لیڈر گاندھی جی کی قیادت میں یک دل ہو کر منزل آزادی کی جانب عزم و یقین کے ساتھ چل پڑے۔

دوسرا باب

مسلمانوں کی روحانی اذیت کے اسباب

مسئلۂ خلافت کا تقدس

ہندوستان میں تحریک خلافت کے اجراء کے وقت مسلمانوں کے عظیم اضطراب کے متعدد اسباب تھے۔ پہلی وجہ خلافت مرکزیہ اسلامیہ سے مسلمانوں کی قلبی وابستگی، جذباتی لگاؤ اور گہرے عشق و محبت کی تھی۔ خلافت گویا اسلام کی روح اور مذہب کی بنیاد ہے۔ خلافت کا قیام، اس کی بقا اور اس کے استحکام کو مسلمانانِ عالم نے ہمیشہ اپنا مذہبی فریضہ جانا۔ چنانچہ جب ہلاکو نے بغداد پر حملہ کیا تو علامہ ابن تیمیہ اپنے عبادتی اور تصنیفی گوشے سے شمشیر بدست اس کی حفاظت کے لیے میدان میں کود پڑے۔ علامہ ابن کثیر مشہور مورخ اس قلیل مدت میں جب طوفانِ ہلاکو کے بعد کچھ دنوں کوئی خلیفہ نہ تھا تو نہایت رنج کے ساتھ ہر سال کے شروع میں یہ تحریر کیا کرتے تھے کہ افسوس اس وقت مسلمانانِ عالم کا کوئی خلیفہ نہیں ہے۔ مولانا محمد علی جب وفد لے کر لندن پہنچے اور لائڈ جارج نے خلافت اسلامیہ کی برقراری سے انکار کر دیا تو مولانا محمد علی ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ اٹھے اور برملا کہا کہ یہ مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے۔ اور آخر میں یہ کہا کہ ہم اپنے مذہبی معاملات کو ہر موقع پر اولیت دیں گے۔ یہ گویا ایک چیلنج تھا جو خلافت کی کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے بے سروسامان قوم کے جری لیڈر نے دنیا کی عظیم ترین طاقت کے سربراہ کو دیا تھا۔

ترکی اور بلادِ یورپ

دوسری بڑی وجہ جو مسلمانوں کو بے چین کیے ہوئے تھی وہ دولِ یورپ بالخصوص برطانیہ کی بڑھتی ہوئی طاقت اور مسلم ممالک کے خلاف بالعموم اور ترکی کے خلاف بالخصوص اس کی معاندانہ کارروائیاں تھیں۔ مسلمان فخر سے وہ زمانہ یاد کرتے تھے جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے رچرڈ جیسے شیر دل شہنشاہ برطانیہ اور دیگر مسیحی مجاہدین ممالک یورپ کو شکست دے کر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا تھا۔ تاریخ کے علاوہ افسانے، ناولوں اور طرح طرح کی روایتوں سے ان کے لیے ایک جذبۂ افتخار پیدا ہو گیا تھا۔ وہ یہ بھی فخر سے کہتے تھے کہ سلطان محمد فاتح نے کس طرح قسطنطنیہ

پر قبضہ کر کے یہ شعر پڑھا تھا:۔

پردہ داری می کند بر طاقِ کسریٰ عنکبوت — بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

اور یہ بات بھی خوب کو گراں تھی کہ جب یورپ کے 52 شہزادے "سگِ برگنڈی" کی قیادت میں مسیحی جہاد کا اعلان کرتے ہوئے قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوئے تھے تو بایزید یلدرم گھوڑے پر سوار ان پر بجلی کی طرح گرتا تھا۔ اسی لیے اس کو "یلدرم" کا خطاب ملا جو ایک ترکی لفظ ہے جس کے معنی "بجلی" کے ہیں اور بایزید یلدرم نے سردار لشکرِ مسیحی سگِ برگنڈی کو بعد فتح گرفتاری شہزادگان ملاحدہ چھوڑ دے کر اور یہ کہہ کر چھوڑ دیا تھا کہ جاؤ اور پھر عیسائیوں کو جمع کر کے آؤ بایزید کو تم ہر وقت میدانِ جنگ میں تیار پاؤ گے۔ پھر وہ بے شمار لڑائیاں جن میں ترک شان و شوکت کے ساتھ فتحیاب ہوئے اور جس پر اکبر مرحوم یوں زمزمہ سنج ہوئے ؎

جہاں میں مظفر ہیں منصور ترک — عجب لوگ ہیں چشمِ بد دور ترک

وہ یہ سوچ کر بھی فرحت کروں ہوئی کرتے تھے کہ ترکی کی بحری طاقت سمندر کا سینہ چیرنے کے لیے کافی ہے علاوہ ازیں ان مسیحی جہادوں اور عیسائی و مسلم کے تنازعات سے یورپ والوں نے خود ترکوں کے وجود کو اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر مخالفِ اسلام میں تبدیل کر دیا تھا۔

برطانیہ مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی سعی و جدوجہد میں سب سے آگے تھا۔ 1914ء سے قبل اس نے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر کرنے کا پورا سامان کر لیا تھا۔ مصر پر انگریز کا آہنی پنجہ گڑا ہوا تھا۔ ایران، روس اور برطانیہ کا غلام ہو چکا تھا۔ مراقش پر فرانس قابض تھا۔ ترکی طرابلس الغرب کا صوبہ افریقہ میں کھو چکا تھا۔ ترکی ایک مردِ بیمار کی طرح اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اسی کو علامہ شبلی نے اس طرح ادا کیا ہے:۔ ؎

مراقش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے — کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض نیم جاں کب تک

اور پھر ان اشعار سے مسلمانوں کے صحیح جذبات و احساسات کا اندازہ ہوگا ؎

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو — یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کب تک
کہاں تک لو گے ہم سے انتقامِ فتح ایوبی — دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

ترکی اور کل یورپ سے قریب پانچ سو سال کی جنگ سب کے سامنے تھی اور مسلمان بجا طور پر یہ سمجھتا تھا کہ اگر یہ خلافتِ عثمانیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو گیا تو مسلمانوں کا کوئی وقار دنیا میں باقی نہیں رہے گا اور مسلمان ذہب کے صحرائے ریگ زار میں ایک گم کردہ کارواں کی شکل اختیار کر لیں گے۔ جنگِ بلقان اور جنگِ طرابلس میں مسلمانانِ ہند نے جو جوش و ولولہ اور ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا تھا وہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ خلافت کا زوال مسلمانوں کی برداشت سے باہر ہے۔

انگریزوں نے استعماریت کے ذریعہ کمزور قوموں کی لوٹ کھسوٹ اور اس کی وساطت سے اپنے مرض جوع الارض کے علاج اور حرص و آز کی تکمیل کا نام "تہذیب" رکھا تھا جس کو وہ اپنا فرض کہہ کر اور اس کی اشاعت کے بلند بانگ دعوی کی تہہ میں خود غرضانہ ملوکیت کو چھپا کر عالم میں پھیل رہے تھے۔ چنانچہ گلیڈسٹون کا ایک قول اس کی صداقت کو ظاہر کرے گا۔ گلیڈسٹون وہ شخص تھا جو کسی ایسے شخص کو جسے مساوی حیثیت دے دیا گیا ہو دیکھ کر کانپ اٹھتا تھا۔ وہ کہتا ہے:

> مجھے یقین ہے کہ جب اس عظیم الشان ملک کی قسمت ہمارے سپرد ہوئی ہے۔ اور اس سلطنت سے وابستہ [illegible] ہمارے ملک کو خدا کی ایک امانت سونپی گئی ہے تو کبھی کسی [illegible] اس کو [illegible] مناسب نہیں ہوگی

اس "امانت" کا حق ادا کرنے کے لیے انگریزوں نے خوبصورت زیادہ مکارانہ تدبر اور سیاسی چالبازیوں سے کام لیا جس کے شکار عام طور پر خودغرض مسلمان اور ضمیر فروش سیدھے سادھے ہوئے۔ انگریزوں نے ایک نہایت منطقی پروپیگنڈا اختیار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا مقصد دنیا میں تہذیب پھیلانا ہے۔ اور اس بہانے سے وہ پسماندہ قوموں کے درمیان گھس آئے اور ان کو مفلس اور جاہل بنا کر اور ان کو غلام بنا لیا۔ یہ پروپیگنڈا کچھ اس انداز کا تھا کہ بہت سے لوگ اس کے شکار ہو گئے۔ کیونکہ اس نے مراعات خسروانہ ان کو نوازا [illegible] معروف اتنا تھا کہ جب صنعتی انقلاب کے دور کا آغاز ہوا اور سائنس کی ترقی میں یورپ کی جانب سے [illegible] طریقہ پر یورپ نے اپنے کو صنعتی ملک بنا لیا اور اس صنعتی ملک کی پیداوار کے لیے بازار کی ضرورت تھی۔ استعماریت کے زیر سایہ تجارت کی غرض ظاہر کر کے ملکوں میں گھسے اور اس کا کچا مال لے کر اور اپنا تیار شدہ مال ان کے ہاتھ بیچ کر خود کو مالدار بنانے لگے۔ چنانچہ انگلستان کا مشہور انشا پرداز ایڈیسن ایک جگہ لکھتا ہے کہ "ہندوستان کے لوگ ہمارے جولاہے اور چینی ہمارے کمہار ہیں۔"
اس استعماریت کی بنیاد جارحانہ اخلاق پر تھی۔ اس لیے باہمی رقابتیں بھی رونما ہوتی رہیں لیکن بہر کیف یہ معاملہ تھا۔ کہ پسماندہ ملکوں کو کچھ نہیں ملا۔ چونکہ مقصد ہی پاک نہ تھا ذریعہ پاک ہونے کا امکان کب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے رشوتیں خوب دیں اور زیادہ تر ان سے بھی اپنا کام نکالا۔ غالباً دنیا کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جہاں ان کے قدم نہ گئے ہوں اور وہاں رشوت کے ذریعہ انھوں نے اس ملک کو غلام نہ بنایا ہو۔ انقلاب فرانس کے بارے میں [illegible] کا متفقہ فیصلہ ہے کہ [illegible] نتیجہ کا پٹ وزیر اعظم برطانیہ کے سوا نے حاصل کی۔ پٹ ایک بڑا مدبر تھا اور اس کا لقب ہے "وہ ملاح جو کشتی کو طوفان سے بچا کر ساحل پر لے گیا" اس نے بے شمار دولت رشوت میں خرچ کر کے ایسے لوگوں کو انقلاب کا حامی بنا کر کھڑا کر دیا جنھوں نے ساتھی بن کر وحشت و بربریت اور قتل عام کا بازار گرم کیا تا کہ سارا یورپ ڈر گیا۔ ہر تحریک کے ایسے رہنما تلاش کرنے میں انگریز کو ملکہ تھا جو تحریک کو بگاڑ دینے برباد کر دینے اور وقت پر

زمانے کا اگر خوب اندازہ تھے۔ ان رشوت خوروں سے انھوں نے کتنے ملکوں کو تاخت و تاراج کیا، کتنی نیک تحریکوں کو برباد کر ڈالا اور کتنے صادق الاصل رہنماؤں کو ناکام بنا دیا۔ صرف ترکی کے سپاہی اور سپہ سالار ایسے تھے جو دام حرص میں گرفتار نہیں ہوئے۔ مصر کی غلامی کی وجہ یہی رشوت ستانی تھی۔ افغانستان کی سرحد بندی کرتے وقت وہاں کے نمائندے کو رشوت دے کر صوبہ سرحد کو ہندوستان میں شامل کر لیا۔ انگریز حکومت کی طرف سے ڈیورنڈ مقرر ہوا تھا۔ وہ بڑا ہوشیار تھا اور اس نے افغانی نمائندے کو کثیر رقم رشوت دی اور اس طرح سرحد مرتب ہوا جس کی حد کا نام ڈیورنڈ لائن ہے۔ ترکی میں بھی سپاہی اور سپہ سالار تو اپنی جانبازیوں سے اپنے کو بے کنارے روزگار ثابت کرتے رہے لیکن وزراء اور سلاطین سب کے سب بک گئے۔ چنانچہ آخر زمانہ میں سلطان ترکی سلطان عبدالحمید اور ان کے چند وزراء اسی طرح کے غلام و حلقہ بگوش تھے۔

افغانستان کی جغرافیائی پوزیشن اس زمانہ میں بہت اہم تھی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جنگ عظیم اول کا زمانہ سیف و تشیر سے لڑائی کا زمانہ تھا۔ ہوائی جہاز ابھی عالم وجود میں آنے والے تھے۔ اس لیے افغانستان پر پنجہ مضبوط رکھنا ضروری تھا۔ اس لیے امیر حبیب اللہ والی افغانستان کو مطیع و منقاد بنا لیا گیا۔ سلطان عبدالحمید خلیفہ اسلام اور امیر حبیب اللہ سیاسی و جنگی میدان میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کو زر پاشی اور کثیر وعدۂ رشوت سے "غلام" بنانے کے بعد پھر انگریز کا دوسرا کام اس سلسلہ کا یہ تھا کہ ان دونوں کو پاکباز متقی، محی نظام اسلام، اور برحق مجاہد ثابت کرے۔ چنانچہ اس کے لیے بھی تجوریاں کھول دی گئیں اور مختلف ذرائع سے اس فریب کو حقیقت ثابت کرنے کی سعی و جہد شروع کر دی اور اس میں ایسی کامیابی ہوئی کہ آج بھی ایسے مخلص اور بے لوث لوگوں کی کمی نہیں جو سلطان عبدالحمید اور امیر حبیب اللہ کو نجات دہندۂ اسلام سمجھتے اور یقین کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نوجوان ترکوں کو یہودیوں کی زرپاشی کا نتیجہ بتلاتے ہیں۔

ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

امیر حبیب اللہ کے حالات ڈاکٹر عبدالغنی صاحب نے لکھے ہیں جو امیر حبیب اللہ کے زمانہ میں افغانستان کے جیل میں بند تھے۔ ان سے میری ملاقات لاہور میں ہوئی اور انھوں نے انگریزی میں ایک کتاب سنٹرل ایشیا کے نام سے شائع کی تھی اور ایک نسخہ مجھ کو بھی دیا تھا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ امیر حبیب اللہ کا ایک فرانسیسی باورچی تھا جو گردن مروڑی مرغی اور بلا ذبح کی چڑیاں کبوتر وغیرہ پکا کر ان کو کھلاتا تھا۔ امیر نے ایک محکمہ عورتوں کا قائم کر رکھا تھا جس کے فوجی عہدے تھے۔ ان کا کام پہاڑ پر سے روزمرہ نوجوان لڑکیوں کو لانا تھا۔ امیر حبیب اللہ کا وزیر جو مستوفی الملک کہلاتا تھا اور جس کا نام مرزا محمد حسین تھا وہ باقاعدہ حکومت برطانیہ کی خفیہ سروس میں تھا۔ مستوفی نے ڈاکٹر عبدالغنی پر اس جماعت سے سازباز کا شبہ کیا جو دردمند ان حالات سے تنگ آ کر منظم اور قابو یافتہ ہوتی جا رہی تھی۔

چنانچہ ان کے چودہ سالہ لڑکے کو بجرم بغاوت پھانسی دے دی اور ڈاکٹر صاحب کو قید کر دیا۔ جب امیر امان اللہ خان امیر حبیب اللہ کے خلاف کامیاب ہونے کے بعد بادشاہ ہوئے تو خود جیل پر جا کر ڈاکٹر صاحب کو رہا کیا۔ اور جنگ کے بعد جو صلح کانفرنس راولپنڈی میں ہوئی اس میں بھی ڈاکٹر صاحب افغانستان کے نمائندوں کی ٹیم کے ایک رکن تھے۔

امیر امان اللہ نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد مستوفی کو گرفتار کر لیا اور تمام ملک میں اعلان کروا دیا کہ ایک غدار وطن کی موت کا تماشا دیکھنے کے لیے لوگ جمع ہوں۔ چنانچہ ایک مجمع عظیم کے سامنے اس کا سرتن سے جدا کیا گیا۔ مستوفی کی گردن اڑانے سے قبل اس سے تین خواہشیں ظاہر کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس نے پہلی خواہش یہ ظاہر کی کہ مجھے میری بیوی کی قبر کے پاس دفن کیا جائے۔ امیر امان اللہ نے اس درخواست کو یہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ وہ ایک عفیفہ بیوی تھی۔ اس کے پہلو میں تم جیسے بدکار وطن فروش کو جگہ نہیں دی جا سکتی۔ دوسری خواہش اس نے ظاہر کی کہ میرے بچوں کو معاف کر دیا جائے۔ امیر امان اللہ نے کہا کہ اگرچہ تمہارے خاندان نے ہمیشہ افغانستان کے بادشاہوں اور افغانستان کا برا چاہا ہے لیکن تمہاری یہ خواہش منظور کی جاتی ہے۔ کیونکہ ان معصوموں نے کوئی قصور نہیں کیا ہے اور بچے معصوم ہیں۔ اگرچہ تمہاری صحبت سے ان کے اندر جو مادہ ہے اس کے دور کرنے میں محنت لگے گی۔ اسی کے ساتھ امیر امان اللہ نے سخت تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے سخت حیرت ہے کہ تمہارے جیسے شقی کے دل میں بھی اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی محبت کے لطیف جذبات موجود ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم ان تمام خصائص انسانی سے خالی ہو۔ تیسری خواہش مستوفی نے ظاہر کی کہ میری جائداد سے میرے بچوں کو محروم نہ کیا جائے۔ امیر امان اللہ نے کہا کہ اگرچہ وہ جائداد تم نے بے ایمانی اور ضمیر فروشی سے پیدا کی تھی لیکن ان معصوم بچوں کی خاطر تمہاری یہ درخواست بھی منظور کی جاتی ہے۔

یہ واقعات مجھ سے لاہور میں ڈاکٹر عبدالغنی صاحب نے تفصیل کے ساتھ بیان کیے اور میں نے ان کا تذکرہ دو جگہوں سے کیا ہے۔ (۱) یہ کہ کس طرح برطانیہ کا جادو ممالک اسلامیہ کے امراء پر چل گیا تھا (۲) کس طرح انگریز ملک عام کو بہکانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ امیر حبیب اللہ بے دین اور دشمن اسلام ہے۔ مجھے اپنے بچپن کی بات یاد ہے کہ جب لوگ امیر حبیب اللہ کو واقعی بڑی قدر و مسرت کے ساتھ دیکھتے تھے۔ لیکن اندر اندر آگ سلگ رہی تھی اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ امیر حبیب اللہ کے قتل کے پیچھے وہاں کے حالات عالموں نے ان کو کبھی تو نہیں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر عبدالغنی کی بات کا یہ جملہ مجھے یاد ہے کہ نوجوان کہتے پھرتے تھے۔

"ہم ان غدار احمقوں سے بہتر حکومت کر سکتے ہیں"

مگر امیر حبیب اللہ ان شکایات اور اعلانات کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ حالانکہ خود ان کے خاندان کے اندر بغاوت شروع ہو گئی تھی اور عام [illegible] خود امیر حبیب اللہ کی بیوی علیا حضرت ان کے قتل میں شریک تھیں۔ عوام کا غصہ ان کے خلاف بھڑک رہا تھا۔ فوج بے چین تھی۔ اس لیے کہ جب مملکت اسلامیہ خطرے میں تھی اور بار بار ترکوں کی جانب سے اشارے ملتے تھے کہ وہ جنگ میں شریک ہوں تو امیر صاحب سلطنت برطانیہ کے ایک ایجنٹ کی حیثیت سے ٹال جاتے تھے۔ ہندوستان میں صرف دس ہزار فوجیں انگریز نے رکھیں اور ہندوستانی فوجوں نے میسوپوٹامیہ میں جا کر ترکوں سے جنگ کی۔ اگر اس وقت افغانستان ہندوستان پر حملہ کر دیتا تو انگریزوں کو وہ فوجیں وہاں سے واپس بلانی پڑتیں۔ انجام یہ ہوا کہ جب بیت المقدس کو جنرل الن بی نے گھیرا تو مغرب کی جانب ہندوستانی فوجوں نے اور مشرق کی جانب عربوں نے ترکوں کا راستہ کاٹ دیا اور جنرل الن بی نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔

ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مولانا حسین احمد مدنی کی خود نوشت سوانح حیات "نقش حیات" جلد دوم کی حسب ذیل عبارتیں ہماری تائید کرتی ہیں۔

"امیر حبیب اللہ خان بادشاہت حال کی طاقت مدافعت پورے طور سے نہیں تھی۔ اب روس بہت ترقی کر گیا تھا اور روسی [illegible] ہاتھ دراز کرنے لگے تھے، جس میں بعض حصص [illegible] کے بعد خودکشی کر لی۔[1]

مولانا محمود حسن نے تمام زندگی جب وہ مدرسہ دیوبند میں رہتے ہوئے اپنے ہاتھ پر جہاد کی بیعت لیتے تھے۔ ایک بڑا مرکز یاغستان میں تھا اور حاجی ترنگ زئی فضل واحد بھی۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں انگریزوں کا خاتمہ کر کے افغانستان کو جنگ میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ انگریز کا پروپیگنڈا امیر حبیب اللہ اور ضمیر فروش مستوفی کی مدد سے کس طرح کامیاب ہوا۔

مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں:-

"چند مہینوں کی حالت میں [illegible] مریدوں کو [illegible] اور تمام [illegible] ہوا [illegible] مل گئیں۔ آخر کار [illegible] کرتے رہتے [illegible] امیر حبیب اللہ خان کو درمیان میں ڈال دیا اور [illegible] آزادی [illegible] کر کے بھی [illegible] انگریزوں اور روسیوں کی مدد [illegible] افغانستان کے سرداروں کو [illegible] حملہ کرو۔

[1] تبرکات آزاد صفحہ 173

کیونکہ بادشاہ کے جہاد شریعت اسلامی میں درست نہیں۔ مسلمانوں کے بادشاہ اس وقت امیر کابل امیر حبیب اللہ خان ہیں۔ تم ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کرکے منتظر ہو جب امیر صاحب شخصی طور پر جہاد منظور کریں تب ان کے ساتھ جہاد کرنا .... وہابیوں کے کیمپ دو دو اور قبائل ٹوٹ گئے اور خود امیر کابل کے پروپیگنڈے کی وجہ سے اپنے جوش و حواس کو قائم نہ رکھ سکے۔ مانڑ حاجی صاحب ترنگزئی کی جماعت کو شکست افغانی بزرگی اور حمایت میں انتشار ہو گیا۔[1]

مولانا عبید اللہ سندھی اپنی ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں۔

"انگریزوں نے کافی روپیہ صرف کر دیا کہ ہندوستان میں تقسیم کرے اور اپنی سلطنت کے مدیر قبائل سے بیعت حاصل کرے اور جہاد میں لوگوں کو کمزور کرے تاکہ امیر کابل تمام قبائل کو اس وقت تک مسلسل جہاد میں شریک ہونے نہ دیں جب امیر صاحب کے حکم سے اعلان نہ کرے۔"

"پہلے سے طے شدہ امیر حبیب اللہ خان سے معاہدہ ہو چکا تھا کہ جب تک برطانیہ کے کہنے پر انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے کھڑے نہ ہوں گے۔ اس لیے یہ کھیل کھیلا۔"

"عمومی کے اعلان کے بعد جب ہندوستانی مسلمانوں اور ترکوں کی طرف سے دباؤ ڈالا گیا تمام ہندوستانی ترکوں اور جرمنوں کی طرف سے تاکید امیر حبیب اللہ خان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیں تو انہوں نے ترکی، جرمنی، ہندی وفد کو یہ جواب دیا کہ جب تک ہندی فوجیں افغانستان میں پہنچ جائیں اس وقت تک روس اور انگریز کے خلاف جنگ خلاف مصلحت ہے۔"

"اسی دوران یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر روس کا خطرہ رفع ہو جائے تو سرحدی قومیں ہند پر حملہ کر سکتی ہیں خطرہ کو معلوم کرنے کے لیے ہندوستانی روسی وفد ڈاکٹر متھرا سنگھ اور مرزا محمد علی کا وفد تجویز ہوا تھا۔ جب روس کی قوت کمزور ہو گئی اور اس کی معلومات سے یہ معلوم ہو چکا کہ روس افغانستان پر حملہ نہیں کر سکتا تو اب سلطنت کو توڑ کے تھے۔ انھوں نے اپنا وعدہ پورا کرنے کا تقاضا کیا انھوں نے امیر حبیب اللہ سے کہا تو امیر صاحب نے جرگہ بلایا جس میں تمام فوجی افسر اور قومی بزرگ شریک تھے۔ امیر صاحب نے اس مسئلہ میں رائے طلب کی تو سوائے عنایت اللہ خان کے جو خود یک یکا تھا سب نے متفق قرار دیا کہ جہاد ضروری ہے۔ امیر صاحب حیران ہو گئے اور اپنے شاہانہ فیصلے سے اس کو روک دیا۔[2]

---

[1] صفحہ 185 ۔ [2] صفحہ 120

اس کے بعد ہمیں (مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے رفقاء) کو ۹ رمضان 1335ھ 1955ء کو ایک تنگ مکان میں لا کر قید کر دیا۔ ہم لوگ بیس پچیس آدمی تھے اور وہ گھر کسی حالت میں دس سے زیادہ آدمیوں کے لیے موزوں نہ تھا۔ ہماری نگرانی سردار سپہ سالار (جرنیل نادر خاں) کے سپرد رکھی گئی۔ ایک عرصے کے بعد ہماری نگرانی مستوفی الممالک کے سپرد کی گئی۔ مستوفی الممالک ہمیں سلام آمادے گئے۔ امیر حبیب اللہ خاں مستقل بادشاہ بن بیٹھے تھے[1]

سلطان عبدالحمید

یہی حال سلطان عبدالحمید کا تھا۔ انگریزوں نے اس کو غلام بنا یا۔ ترکی کا ایک ایک ذرہ رہن کرا دیا۔ فوج میں عیسائی بھر گئے تو جدید طریقہ حرب کو نظر انداز کر کے عسکریت کا خاتمہ کر دیا۔ دردانیال کے قلعوں پر سے توپیں اور سپاہی ہٹا دیے۔ سب سے بڑے زمینداری نظام اصلاحات کی مخالفت کی۔ جس کسی نے اصلاح کی جانب توجہ دلائی اسے دو دفعہ صفت سلطان نے خاموشی سے قتل کرا دیا۔ مدحت کامل پاشا جیسے دانشور مصلح کے خون کے دھبے سلطان عبدالحمید کے دامن پر ہیں۔ اور ایک مدحت کامل پاشا کیا کتنے ہی معصوم محبان وطن، آقایان فرنگ کے اشارے سے اس سلطان کے جور و ستم کا نشانہ بنے۔ اس کا دامن ہی نہیں اس کا پورا جامہ معصوم بہی خواہان ملک و قوم کے خون سے رنگا ہوا تھا۔ اور یہ سب کیوں ہو رہا تھا؟ صرف اس لیے کہ انگریز نہیں چاہتا تھا کہ ترکی میں کوئی اصلاح ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ حکومت روز بروز زوال کی جانب رجوع ہوتی جائے۔ اُسے تو اسلامی مرکزیت کا خاتمہ کرنا تھا اور عبدالحمید سب سے بڑا انگریز کا آلۂ کار تھا۔ لیکن اسے انگریز نے "محافظ اسلام" مشہور کر دیا اور بات اچھے اچھے لوگوں کے دلوں میں اتر گئی اور آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں نے انگریز کے اس پروپیگنڈا کا ترجمہ "اشاعت اباطیل و اکاذیب" بالکل بجا طور پر کیا تھا۔ مگر یہ ایسا جھوٹ ہوتا تھا جو سچ کا قالب اختیار کر لیتا تھا اور پھر اسے فروغ دینے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ انگریزوں کے از بس اچھے اچھے تعلیم یافتہ انشا پرداز صوفی منش علماء اور زعماء آگئے تھے اور وہ جو چیز بھی پھیلاتا تھا اسے قرآن و حدیث کی طرح وحی ربانی تصور کرتے تھے۔ ان میں علماء سوائے زاغ صفت صوفی جن کو میراث میں خلافتوں کے ستیمن ملے تھے اور بہت جاہ طلب غلامان فرنگ تھے۔ کس کس کا نام لیا جائے۔ ان سب نے ایسے ایسے فسانے سلطان عبدالحمید کی تعریف میں وضع کیے تھے۔ باید و شاید اگر ان افسانوں کو یہاں درج کیا جائے تو پوری ایک کتاب ہو جائے۔ سلطان عبدالحمید نے جو غداریاں ملک اور قوم کے ساتھ کیں ان میں ایک واضح چیز درہ دانیال

[1] صفحہ 171

کا غیر مسلح کرنا ہے۔ درہ دانیال ایک ڈھلوان درہ ہے جو ایشیا کو یورپ سے جدا کرتا ہے۔ یہ چالیس میل لمبا اور چار میل چوڑا ہے۔ یہ بحر ایجین کو بحر مورا سے ملاتا ہے۔ اس کے دونوں طرف پہاڑیاں ہیں اور سمندر کی جانب سے قسطنطنیہ تک پہنچنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے جو اس پہاڑی پر دونوں طرف سو سو سے زیادہ قلعے تعمیر کیے گئے تھے جو توپ اور بھاری اسلحوں سے لیس تھے۔ اگر کوئی اس کے اندر داخل ہونے کی ہمت کرے تو دونوں طرف سے توپ کے گولے پڑتے تھے۔ اور ایک سے بچ تو دوسرے سے اور دوسرے سے بچا تو تیسرے سے یا اس کے بعد کے قلعوں کی زد سے بچ کر کہاں جا سکتا تھا۔ انگریزوں کے حکم کی متابعت میں سلطان عبدالحمید نے ان تمام قلعوں کے فوجی استحکامات کو مسمار کر کے انھیں غیر مسلح کر دیا تھا۔ اب میدان صاف تھا۔ دول یورپ کی بحری طاقتیں اپنا رنگ دکھا سکتی تھیں قسطنطنیہ ان کے پیروں کے نیچے تھا۔ وہ تو نوجوان ترکوں نے عبدالحمید کو معزول کرنے کے بعد ان قلعوں کو فوراً مسلح کر لیا تھا ورنہ جنگ عظیم میں دول اتحادیوں کو شکست نہ دے سکتے تھے۔

مصلحین امّت

لیکن ان سب دباؤں میں امید کی کرن بھی تھی۔ مصلحین امت جن میں زیادہ تر روشن خیال علماء تھے برابر حالات کو سدھارنے کے لیے آمادۂ پیکار رہتے تھے ؎

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد   من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

ان میں سب سے پہلے جس کا نام زبان پر آتا ہے وہ سید جمال الدین افغانی ہیں۔ اس صاحب بصیرت کے تگ و تاز نے افغانستان سے لے کر مصر تک ایران، عرب اور ترکی تمام بلاد مسلمین کو روند ڈالا اور ہر جگہ بغاوت کی آگ روشن کی۔ ان کا پیغام اتحاد اسلام تھا جسے پین اسلام ازم کا نام دے کر انگریز نے بدنام کیا۔ انگریز نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ پان اسلام ازم کا منشا عام مسلمانوں کی ملوکیت اور حکمرانی قائم کرنا ہے۔ حالانکہ یہ بات ان کے خیال سے بہت بعید تھی۔ اتحاد اسلام کا منشا صرف یہ تھا کہ اسلامی سلاطین اپنے اندر اصلاح پیدا کریں اور قرآن کے قانون پر عمل پیرا ہوں۔ جن ملکوں میں اسلامی حکومت نہیں ہے وہاں کے مسلمان حب الوطنی کے جذبے کے ساتھ روشن خیالی سے اپنے کو دین کا متبع بنائیں اور آزادی حاصل کریں اور سب مل کر ایک مرکزی خلافت اسلامیہ قائم کریں تاکہ یورپ کے دستبرد سے محفوظ رہ سکیں اور جو خطرہ بلاد اسلامیہ اور مقامات مقدسہ کو درپیش ہے وہ دور ہو۔

یہی تعلیم ہندوستان کے مجاہد اعظم اور صاحب فراست مولانا محمود حسن کی تھی جو ہندوستان کے اول درجے کے قائد تھے جنھوں نے تمام بلاد اسلامیہ میں نصرت و حصول قوت و شوکت کا ایک زبردست کام جاری کر رکھا تھا۔

حرمین الشریفین

تیسری عقیدہ جس سے مسلمانوں کا سینہ کباب کر رکھا تھا وہ مسئلہ تھا حرمین شریفین کی حفاظت کا۔ دوران
کے عہد مسلم قندرتیں بوجہ معاندت دول مغرب چلے جانے کا خطرہ۔

حرمین الشریفین، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، مقامات مقدسہ، بیت المقدس اور آثار قدیمہ بغداد و نجف و کربلائے معلیٰ کی حفاظت بھی ترکی کے خلفاء کے سپرد تھی جنہوں نے کبھی اپنے آپ کو حجاز کا سلطان نہیں کہا بلکہ اپنا لقب سلطان ترکی و خادم حرمین الشریفین قرار دیا۔ خلیفۃ المسلمین تو وہ تھے ہی اور پکارے بھی جاتے تھے۔ سلاطین ترکی حرمین الشریفین سے مثالی عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے بیت الحرام مکہ معظمہ کی توسیع اور حرم نبوی کی از سر نو تعمیر کی۔ مگر اس طرح کہ ہر تاریخ پر محفوظ ہے۔ حجاز سے کبھی انھوں نے کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا۔ خانہ کعبہ اور بیت الحرم کے کل اخراجات حتیٰ کہ چراغ جلانے کے لیے تیل تک قسطنطنیہ سے جاتا تھا۔ علماء اور فضلاء کے وظائف مقرر تھے۔ دوران جنگ شریف مکہ کی بغاوت اور انگریزوں کے عمل دخل اور بالخصوص فلسطین میں یہودیوں کو وطن دینے کے بعد حرمین شریفین کی حفاظت کی کیا ذمہ داری تھی۔ یہ وہ چیز ہے جو ہر مسلمان کو جان سے زیادہ عزیز ہے

علامہ اقبال نے کس درد انگیز لہجہ میں اس حال کا مرثیہ لکھا ہے ؎

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ — خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش
آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے — کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

اور کس جذبے سے پکارتے ہیں:۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے — نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار — لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر
ناشناسی سیر خفی را ازجلی ہوشیار باش — اے گرفتار ابوبکر و علی ہوشیار باش

چنانچہ مسلمانان عالم کا مضطرب ہونا لازمی تھا اور ہندوستان تو ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

ایک اور وجہ

یورپ نے ہمیشہ ترکی سے جنگ مذہبی بنیاد پر کی اور اس کو مسلمانوں کا پیشوا اور محافظ قرار دیا ہے۔ اس طرح مسلمانان عالم کے دل میں پیوست ہو گیا کہ ترکی کی بقا اسلام کی بقا اور ترکی کا زوال اسلام کا زوال ہے۔ ان رجحانوں کے مختصر خاکے پہلے آچکے ہیں اور اس کتاب میں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اتنا اور اضافہ

کہا جاتا ہے کہ روس، یورپ اور روس ترکوں کے ان علاقوں کے درپے رہے ہیں جہاں عیسائی بسے ہوئے ہیں۔ جمعیت عیسائیوں کے حقوق کے نگہبان اور چارہ دار بن کر اٹھے اور ترکی کے خلاف ان کو مسلسل غضب پر بھڑکاتے رہے۔ یہ لوگ اسلام کو جاہلیت قرار دیتے تھے۔ چنانچہ روس کے بادشاہ سو مارڈ نے پطرس کی ایک جغرافیائی کا عرض تیار کیا۔

"کرۂ ارض کے اس حصے میں جہاں مسلمان بستے ہیں تہذیب کے بیج داخل ہونے کا راستہ اور اس تاریکی میں روشنی کا دریچہ پیدا کرنا تو ہمارا فرض ہوتا ہے۔ یہ جہاد ہے اور ایسا جہاد ہے جو ہمارے ملک کے شایان شان ہے:"

یہی حال فرانس اور جرمنی کا بھی تھا مگر انگلستان اس وقت دنیا کے سامنے کا جو دھری تھا۔ سب سے بڑی طاقت بن چکی تھی۔ اس کا بحری بیڑا ناقابل تسخیر تھا اور اس نے دنیا کے جزیروں میں محفوظ و مامون رہ کر عالم کی فتح کا خواب دیکھ رکھا تھا اور اس کا نام رکھا تھا "اشاعت تہذیب"۔ برطانیہ اور روس، فرانس اور جرمنی اس بات پر متحد تھے اور تہذیب کو پھیلانے کے لیے علیحدہ علیحدہ نعرے کا علم بلند کرتے تھے اور ترکی کی عیسائی رعایا کے حقوق کی نگہبانی اور حمایت کا دعویٰ کر کے دخل انداز ہوتے تھے۔ عالم اسلامی پر اس کا ردعمل ہونا لازمی تھا۔ یورپ ہمیشہ ترکوں کے معاملات میں تو بے جا مداخلت کرتا رہا اور ان کو اسلام کے مقابلے میں صلیبی جہاد قرار دیتا رہا۔ بایزید یلدرم کے زمانے سے یہ بات شروع ہوئی اور خلافت مرکزیہ اسلامیہ کے اختتام تک جاری رہی۔ چنانچہ جنرل ایلن بی کو جس نے جرمن ترکی افواج کی شکست کے بعد فلسطین سے آکر بصرہ، بغداد اور بیت المقدس وغیرہ فتح کیا، خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے حسب ذیل الفاظ کہے تھے:۔

"ان کا (جنرل ایلن بی کا) نام ہمیشہ کے لیے اس نسبت سے یاد کیا جائے گا کہ وہ ایک ذہین اور قابل قدر فوجی مدبر ہیں کہ صلیبی لڑائیوں کے سلسلہ کی آخری لڑائی نے جس میں ان کو شاندار فتح حاصل ہوئی۔ ان کی خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے اپنی جنگی صلاحیت سے ایک ایسی لڑائی کا خاتمہ شاندار طریقے سے کر دیا جس میں یورپ کی سرگرمی صدیوں سے مصروف تھی۔ اب ہم اس خیال کو فراموش کر دیں کہ نسلاً بعد نسلٍ یورپ کی جنگجو اقوام اس قسم کی جنگی لڑائیوں میں مصروف ہوتی رہیں گی کیونکہ برطانوی فوج نے جنرل ایلن بی کی نگرانی میں ایک ایسی فتح حاصل کر لی ہے جس کے بعد اس سلسلہ کی لڑائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی:"

یہ یورپ اور برطانیہ کے قلب کی اندرونی گہرائیوں کی آواز تھی۔ اور حقیقت حال بھی اس کا مظہر ہے۔ یہ سلسلہ ایک زمانہ سے چلا آرہا تھا اور آخر تک جاری رہا۔ ترکی کے عروج کے زمانہ میں اس کے حسب ذیل

صوبے تھے۔

یورپ میں۔ ادرنہ، سرمینک، تونسو، بنی، استودر، مناستر۔

ایشیا میں۔ جزیرۃ العرب، بغداد، موصل، حلب، سوریہ، سامراء، دیاربکر، قونیہ، انگورہ، بدلیس، حجاز، فلسطین، دیربکر، تمیس، رقہ، وان، معمورۃ العزیز، آدنہ، طرابزون۔

افریقہ میں۔ مصر، طرابلس۔

بحر سفید میں۔ جزائر بحر سفید۔

جب یورپ کی عظیم سلطنت اسلامی کو کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ اور اس کو نیست و نابود کرنے کا برطانیہ عظمیٰ نے پختہ فیصلہ کر لیا ورسیلیز کے معاہدے تک گویا ہو۔

بچپن میں ساتویں جماعت کا واقعہ ہو گا میں نے ایک انگریزی عورت کی لکھی ہوئی ایک کتاب پڑھی تھی۔ افسوس کہ تلاش کے باوجود کتاب نہیں مل سکی۔ جہاں تک یاد ہے اس کا نام "جزیرۃ العرب" تھا۔ اس میں اس نے صاف صاف لکھا تھا کہ برطانیہ اور اسلام دونوں اس دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس کا کہنا تھا کہ دو قومیں دنیا میں برتری کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔ انگریز اور مسلمان۔ دونوں دنیا پر چھا جانا چاہتی ہیں انگریزی اور عربی۔ ان دونوں میں سے ایک کو فنا ہو جانا ہے۔ چنانچہ اس نے لکھا تھا کہ جب تک اسلام کی مرکزیت ختم ہو کر جزیرۃ العرب اس مرکزیت سے علیحدہ کر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیا جائے اسلام کی طاقت کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک خاص مقصد سے انگریز کیپٹن لارنس ... بچپن سے گندمی رنگ تھا رنگ کر دیا ... عربی مدرسوں اور مکتبوں میں رہتے تھے تاکہ عربوں کی کمزوریوں کو معلوم کر سکیں اور ان کو ترکوں کے خلاف اکسا سکیں۔ ... کرنل لارنس کو وہ مواد ملا جس سے وہ معمولی لباس پہن کر ایک قائد کی طرح جنگ عظیم کے دوران عربوں سے ترکوں کو قتل کرا ... ترک کے قتل پر ... آمادہ کر رکھا تھا۔ خود کرنل لارنس نے جو تکالیف برداشت کیں اور جس طرح جان پر کھیل کر یہ کام کیا وہ ایک عجیب داستان ہے۔

کرنل لارنس ایک ... فوجی ملازمت کے لیے اس کی درخواست نامنظور ہوئی تھی۔ اس نے عربوں کو بغاوت پر اکسانے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ اس کی ہمت کا عالم یہ تھا کہ بخار کے عالم میں ریگستان کے اندر جہاں باد سموم کے جھونکوں کے سوا کوئی چیز ملنا دشوار تھی وہ سینکڑوں میل کا سفر اونٹ پر کرتا تھا۔

یہ تو آخر کار ... کی کامیابی کا ... انگریز دو باتوں پر محنت کر رہے تھے اور ان کی عظیم محنت قابل داد ہے۔

(1) مسلمانوں کی مرکزیت کو ختم کیا جائے۔

(2) جزیرۃ العرب کو ترکی حکومت کے خلاف کھڑا کیا جائے۔

چنانچہ انگریز اپنی ریشہ دوانیوں سے ترکی کو برابر اندرونی و بیرونی معاملات میں پھنسائے رکھتے تھے۔ اندرونی طور پر ترکی کے عیسائی باشندوں کے ذریعے سلطان کو بغاوت پر اکساتے تھے اور بیرونی طور پر جنگ کی صورت میں ملوث ہوتی تھی۔ ترکوں کو کبھی چین نہیں ملا، وہ برابر جنگ میں مصروف رہے۔ چنانچہ جب نوجوان ترکوں نے سلطان عبدالحمید کو معزول کر کے حکومت قائم کی تو ایک انگریز مورخ کے قول کے مطابق نوجوان ترکوں کو جس امن کی ضرورت تھی جس کے مدت میں ان کو تین سال کی جنگ ملی۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ مسلمان اسلام اور حکومت ترکی کے ساتھ بے حد جڑے ہوئے تھے۔ تحریک رہا۔ چنانچہ 1897ء میں جب یونان سے جنگ ہوئی تو مسلمانان ہند نے اس وقت بھی چندہ کر کے ترکوں کی امداد کی تھی۔ 1912ء میں جب جنگ بلقان ہوئی تو ایک ایک مسلمان مضطرب تھا۔ ہر گھر سے چندہ ہوا۔ ایسے لوگ بھی تھے جو گھر کا زیور اتار کر دے دیتے تھے۔ مولانا محمود حسن کی قیادت میں دارالعلوم دیوبند کے طلباء تعلیم کو وقتی طور پر ترک کر کے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک صاحب کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ تقریباً تمام جنگ کے دوران وہ گھر سے باہر رہے گاؤں گاؤں چندہ وصول کرتے تھے۔ ان کا حال اس زمانے کے مشہور اخبار "زمیندار" میں چھپتے رہتے تھے۔ الغرض ان کے وجود سے مسلمانان ہند کو ترکی سے ایک روحانی اور جذباتی لگاؤ تھا اور اگر ترکی کی ایک انگلی میں درد ہوتا تھا تو مسلمانان ہند کے دل سوز غم سے کباب ہو جاتے تھے۔

جنگ بلقان کے زمانہ میں مولانا محمود حسن روزانہ ایک حدیث جہاد کے بارے میں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ اس طرح طلباء میں ایک عظیم جوش پیدا ہوا اور ان لوگوں نے خود درخواست کی کہ دارالعلوم بند کر دیا جائے۔ خود مولانا کا ارادہ بھی تھا۔ اس وقت کچھ لوگوں نے یہ شبہ ظاہر کیا کہ یہ اقدام حکومت کی نظر میں کھٹکے گا اور دارالعلوم کے قیام کے لیے مضر ہو سکتا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اب یہ معاملہ اسلام اور قوم کے درمیان ہے۔ ایک مرتبہ پہلے بھی ایسا ہوا تھا اور انھوں نے فرمایا تھا کہ دارالعلوم دین کی خدمت کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اگر دین کی خدمت ہی کو ترک کر دیں تو دارالعلوم کی ضرورت کیا ہے۔

جنگ بلقان کے زمانہ میں جو سخت جوش و ہیجان مسلمانوں میں پیدا ہوا اور ترکی کی شکست کے بعد مسلمانوں نے جس بے چینی کا اظہار کیا وہ ایک طویل داستان ہے۔ تمام ہندوستان کا مسلمان سخت مضطرب تھا۔ جوان چاہتے تھے کہ وہاں جا کر فوج میں بھرتی ہو کر جہاد کریں۔ چنانچہ فیاض علی صاحب فیض آبادی ایک ایڈوکیٹ تھے جو بعد میں پاکستان چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کر گئے۔ انھوں نے ایک ناول "تسنیم" لکھی جو مقبول ہوئی۔ ان کا ہیرو

آخر کار ترکی جہاد کے لیے چندہ گیا۔ امیروں اور غریبوں نے یکساں دل کھول کر چندے دیے تاکہ کم سے کم یہ تو ہو کہ ترکان احرار کو مالی امداد ملے۔ حلقہ بگوشان حکومت بھی اپنی وفاداریاں بالائے طاق رکھ کر علانیہ میدان میں کود پڑے۔ لکھنؤ کے ممتاز بیرسٹر مسٹر مختار حسین نے امین آباد پارک کے ایک جلسۂ عام میں دل دہلا دینے والی تقریر کی۔ حالانکہ ان کا شمار حکومت کے حامیوں میں تھا۔ ضلع کلکٹر بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے جب حیرت کا اظہار کیا تو مسٹر مختار حسین نے کہا کہ یہ ہمارا مذہبی معاملہ ہے۔ علامہ شبلیؒ جو اپنی فہم و فراست اور بصیرت و دور اندیشی کے لیے نمایاں حیثیت رکھتے تھے برابر دلگیر نظمیں لکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر انصاری طبی وفد لے کر ترکی گئے جس میں چند سربرآوردہ لوگ بھی شریک تھے۔ جب وہ واپس آئے تو علامہ شبلی نے ان کے خیر مقدم میں ایک پرجوش نظم لکھی جس کا پہلا شعر یہ تھا ؎

ادا کرتے ہیں ہم شکرِ جنابِ حضرتِ باری　　کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفدِ انصاری

ترکوں نے صلیب احمر کے جواب میں ہلال احمر کمیٹی بنائی تھی۔ اس کی تقلید میں ہندستان میں ہلال احمر کمیٹیاں قائم ہوگئیں۔ مولانا محمد علی نے کامریڈ میں جب وفد انصاری کے لیے چندہ کی اپیل کی تو مسلمانوں نے کس طرح لبیک کہا اسے میر محفوظ علی کی زبانی سنیے جو مولانا محمد علی کے ساتھی اور کامریڈ کے مینیجر تھے وہ فرماتے ہیں:

"جس وقت کامریڈ کے دفتر میں روپیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ کامریڈ کے دفتر گواہ ہیں کہ ایک ایک دن میں دس دس بارہ بارہ ہزار روپے موصول ہوئے ہیں۔ اور میں گواہ ہوں کہ منی آرڈر رسیدوں پر دستخط کرتے کرتے میرا ہاتھ شل ہو گیا ہے۔"

یہی حال مولانا ظفر علی خان کے شہرۂ آفاق اخبار روزنامہ زمیندار کا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کی پکار پر ہندوستان نے کس جوش سے چندے دیے وہ بھی ایک داستان ہے۔

یہی حال اس وقت ہوا جب اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا اور انگریزوں نے ترکی کا راستہ مصر میں روک دیا۔ انور پاشا وہاں بھیس بدل کر گئے اور لڑائی کی تنظیم کی۔ مسلمان اس وقت ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے جس کا اندازہ علامہ اقبال کے اس قطعے سے ہوگا ؎

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا　　زمیں کو چھوڑ کے سوئے فلک روانہ ہوا
فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو　　حضورِ آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو
کہا حضور نے اے عندلیبِ باغِ حجاز　　کلی کلی ہے تری گرمئ نوا سے گداز
نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا　　ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا
حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی　　تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں　　وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں　　جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

مانا کہ مسلمانوں کے سامنے جان و مال کی قربانی دینے کے لیے کوئی راہ عمل نہ تھی۔ دامنگیر ہندستان زیر اقتدار برطانیہ۔

ع　نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے

لیکن ترکی کا معاملہ مسلمانوں نے ہمیشہ تحفظ اسلام اور تحفظ خلافت مرکزیہ اسلامیہ کا معاملہ سمجھ کر اپنے مذہب، اپنی زندگی اور اپنے وجود و بقا کا معاملہ سمجھا۔

تیسرا باب

میدانِ عمل

مسلمانانِ ہند نے صرف زبانی ہمدردی پر [illegible] گانی [illegible] ہی سے اپنے
جذبات کا اظہار نہیں کیا بلکہ حتی الامکان عملی حصہ بھی لیا۔ [illegible] کی ابتداء تو دو گراں قدر جماعتوں [illegible]
[illegible] حکومت [illegible] نے [illegible] ہیں۔ [illegible] خصوصاً [illegible]
[illegible] کی [illegible] کی کمیٹیوں کے [illegible] [illegible]۔ [illegible] ایک صدی سے
[illegible] فرنگی محل لکھنؤ [illegible] ہند کی [illegible] کا مرکز تھا۔ [illegible] فرنگی محل سے
[illegible] اور [illegible] عبدالحی جیسے اہلِ دماغ پیدا کیے تھے جن کا [illegible] اسلام کے
[illegible] میں [illegible] سے مولانا عبدالحی صاحب علامہ [illegible] تھا جس نے 42 سال کی عمر میں وفات کرنے کے
[illegible] اور کوئی کتاب [illegible]۔ اس فرنگی محل کا چراغ [illegible]
[illegible] سے روشن تھا [illegible] علامہ [illegible] ان [illegible] سے علوم [illegible]
[illegible] روشن [illegible] اسلام کے [illegible] عمل [illegible] مولانا عبدالباری
[illegible] عبدالحی نے "محمد علی کی
[illegible] کے عنوان سے [illegible] کی [illegible] ہے۔

"[illegible]
[illegible]
[illegible] مولانا عبدالباری صاحب نے [illegible] فرنگی محل کے [illegible]
[illegible] کی حکومت [illegible]
[illegible] نہیں ہے بلکہ خالص ایک مذہبی معاملہ ہے"[1]

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

قانونی جدوجہد

خدمت [illegible] کے سلسلہ میں فرنگی محل والوں کے اندر جدوجہد کا مرکز تھا۔ مولانا کی ذات سے [illegible] کے محیط ہونے سے پہلے [illegible] کا [illegible] کعبہ کی بنیاد رکھی تھی جس میں خود مولانا [illegible] خدام سے "خدام کعبہ" [illegible] ملت اسلامیہ ہند کے [illegible] ایک [illegible] اور حرمت اسلامیہ اور اماکن مقدسہ سے ایک عقیدت و محبت و عقیدت کا جذبہ پیدا کیا۔ گویا کہ یہ تحریک [illegible] کے لیے [illegible] تھی۔

بعدہٗ تحریک خلافت کے زمانہ میں فرنگی محل مرکز [illegible] مولانا محمد علی مولانا عبدالباری کے مرید تھے اور [illegible] کو [illegible] محمد علی کو "مولانا" [illegible] کی [illegible] جو [illegible] ہو گئے۔

[illegible]

لہ مولانا [illegible] اور [illegible] سے [illegible] والے [illegible] کے مالک تھے۔ [illegible] کو لوگ [illegible] معلوم ہوا کسی سیکنڈ کلاس کے [illegible] کوئی نہیں [illegible] پتہ چلا کہ [illegible] لگا۔ البتہ استدراداً [illegible] کی [illegible] تھی [illegible] تھے۔ کھجور کی چٹائی [illegible] کے [illegible] پر ایک [illegible] آخر مولانا بھی ہوتے تھے۔ ایک صاحب [illegible] سب لوگ اٹھ جاتے۔ [illegible] کو [illegible] کر دیا [illegible] کا مکان [illegible] وہاں [illegible] تھی۔ لوگوں نے [illegible] کے پیچھے [illegible] اور کہا کہ [illegible] بند کر دیا گیا ہے لیکن حافظ نے [illegible] حافظ [illegible] کرتا ہو [illegible] کے درمیان [illegible] ہمت کر گئی۔

ہر وقت اور ہر پبلک جگہ اور جلسے میں عبا پہنے رہتے تھے۔ نہایت گھنی داڑھی تھی اور چہرے پر نور۔ میں نے جب دیکھا مولانا محمد علی کو اسی رنگ میں دیکھا۔ ایک دن ایک بڑے جلسے کے موقع پر نماز کا وقت ہو گیا۔ مولانا عبدالماجد بدایونی کو یہ کہتے سنا کہ آپ نماز پڑھائیے۔ آپ کے پیچھے نماز پڑھنے میں مجھے بڑا لطف و کیف حاصل ہوگا۔

جب تک کہ مولانا محمد علی نے اپنے بے شمار درد دل کے ماتحت اپنی صحت کو نظر انداز کر کے تحریک خلافت کا بوجھ اپنے کندھوں پر نہیں لے لیا مولانا عبدالباری ہی کی ذات تھی جن کا نام نامی ہر جگہ آتا تھا۔ مہاتما گاندھی کا حکم مولانا عبدالباری کا فتویٰ" ایسے کتنے ہی اشتہار شائع ہوئے۔ تحریک خلافت میں راست اقدام کا جو زبردست عمل پیش ہوا اس کی زمین مولانا عبدالباری ہی کی تیار کی ہوئی تھی اور اس کے بعد تحریک خلافت کو چلانے، جمعیۃ العلماء ہند کو قائم کرنے اور تمام عالم اسلام اور مسلمانان ہند کو برطانیہ کے خلاف متحد کرنے میں مولانا کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

خلافت کمیٹی کا قیام

خلافت کمیٹی کب اور کیسے قائم ہوئی اس کا سراغ لگانے اور محقق طور پر جاننے کی میں نے بڑی کوشش کی لیکن مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ میں کامیاب نہیں ہوا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس جو 18 دسمبر 1919ء کو منعقد ہوئی تھی وہی کانفرنس خلافت کمیٹی میں تبدیل ہو گئی۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس کانفرنس میں ایک تجویز خلافت کمیٹی کے شکریے کی منظور ہوئی۔ اسی طرح انہیں اسباب کی بنا پر جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ خلافت کمیٹی 1920ء میں قائم ہوئی ان کا بیان بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالباری نے خلافت کمیٹی قائم کی اور پھر وہ بمبئی منتقل ہو گئی کیونکہ وہاں کے لوگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے کی ذمہ داری لی۔ اس کی تائید شاہ معین الدین ندوی کی کتاب "حیات سلیمان" کے صفحہ 175 کے ذیلی حاشیے سے ہوتی ہے۔

میں نے اس امر کی تحقیقات میں بہت وقت صرف کیا کہ کوئی دستاویزی شہادت اس بات کی مل جائے کہ خلافت کمیٹی کب اور کہاں اور کس کی تحریک پر قائم ہوئی مگر افسوس ہے کہ مجھے اس میں ناکامی ہوئی۔ میں مولانا عبدالباری کے مکان پر گیا وہاں کے لوگوں سے ملا۔ مفتی محمد رضا صاحب سے خط و کتابت کی جو حضرت مولانا کے حالات زندگی مرتب کر رہے ہیں۔ اسی طرح بہت سے مختلف کتب خانوں سے رجوع کیا۔ ایک صاحب بمبئی گئے وہاں خلافت کے دفتر کو دیکھا۔ معلوم ہوا کہ دفتر کب کا اجڑ چکا۔ ملک دین بھی سب اور "خلافت" اخبار کی اس زمانے کی کوئی فائل ہے۔ بمبئی کے اہل دانش نے بھی معذوری ظاہر کی۔ میں نے مولانا انور علی عزیزی صاحب کو لکھا۔ موصوف صاحب نے بہت سی باتیں لکھیں جن سے کئی امور میں میرے موقف کی تائید

جمعیۃ علمائے ہند

علمائے کرام کے باہمی افتراق سے ملت کو جو نقصان عظیم پہنچ رہا تھا اور دنیا میں امت مسلمہ کی حالت اس درجہ نازک تھی کہ یہ بہت ممکن ہے کہ مختلف خیال کے علماء کو یکجا کرنے کا خیال بہت سے اصحاب فہم و بصیرت کے دماغ میں آیا ہو لیکن سب سے پہلے مولانا عبدالباری نے 1919ء میں دلی کی ایک مشہور درس گاہ سید حسن رسول نما میں چند علماء کو جمع کر کے وقت کی نزاکت و ضرورت کے پیش نظر اتفاق و اتحاد کی اہم ضرورت بتلائی اور سب نے حسب ذیل عہد کیا۔

"ہم سب دہلی کے مشہور و مقدس بزرگ کے مزار کے سامنے اللہ کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کرتے ہیں کہ مشترک قومی و ملی مسائل میں ہم سب آپس میں متحد و متفق رہیں گے اور فروعی و اختلافی مسائل کی وجہ سے اپنے درمیان کوئی اختلاف پیدا نہیں کریں گے نیز قومی و ملکی جد و جہد کے سلسلے میں گورنمنٹ کی طرف سے جو سختی اور تشدد ہوگا اس کو صبر و رضا کے ساتھ برداشت کریں گے اور ثابت قدم رہیں گے۔ جماعت کے معاملے میں پوری پوری رواداری و دیانت سے کام لیں گے۔"

یہاں جمعیۃ العلماء کی تاریخ لکھنی مقصود نہیں ہے صرف یہ دکھانا ہے جو الفاظ سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے دل کس طرح خون سے بھرے ہوئے تھے۔ اور راہ عمل کی تلاش تھی جو وحی الہٰی کی طرح ایک دم نازل نہیں ہو جاتی ہے بلکہ بہت ٹھوکریں کھانے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

ہوتی تھی اور یہ بھی یقینی امر نہ تھا لیکن اس معاملے میں کہ خلافت کا قیام کب، کہاں، اور کیسے ہوا اس بارے کے پاس بھی کوئی مواد نہ تھا۔

جب کہ لکھائے فرنگی محل تمام سیاسی تحریکوں کا مرکز تھا چنانچہ مفتی محمد رضا کے خط سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا عبدالباری کے مکان میں دسمبر 1912ء میں "خدام کعبہ" کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا عبدالباری صاحب خادم الخدام مسٹر شوکت علی بی اے (علیگ) (بعدہٗ مولانا شوکت علی) خادم کعبہ مسٹر مشیر حسین قدوائی بیرسٹر معتمد خادم الخدام منتخب ہوئے۔ اور اس کے اور لوگ ابتدائی ممبران تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ مولانا عبدالباری صاحب نے اپنی روشن ضمیری سے اندازہ کر لیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور اسی لیے خدام کعبہ کی تحریک جاری کی تھی۔ عجب نہیں کہ یہی خلافت کمیٹی میں منتقل ہو گئی ہو یا اسی کے رو رو اثر سے وہیں خلافت کمیٹی بنی ہو۔ بہر حال جو یقینی بات ہے وہ یہ ہے کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے پہلے سے بمبئی میں خلافت کمیٹی کا قیام تھا۔ بقیہ ظن و تخمین و قیاس ہے۔

نومبر 1919ء میں خلافت کانفرنس کے موقع پر تمام اطراف ہند کی مقتدر جماعت دلی میں جمع ہوگئی تھی کانفرنس کے بعد علمائے کرام کا ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت مولانا عبد الباری نے فرمائی اور وہیں جمعیۃ العلماء قائم ہوئی۔ باہمی اختلافات کو دور کرکے علمائے کرام کس طرح ایک خاص مقصد یعنی بقائے خلافت کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو رہے تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ مشہور پیشوائے اہل حدیث اور صحیح معنوں میں مجاہد ملت حضرت مولانا ابو الوفا امرتسری نے صدارت کی تحریک پیش کی تھی۔ دلی کے اجتماع میں حسب ذیل علماء شریک تھے۔

مولانا عبد الباری، مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، پیر محمد امام سندھی
مولانا عبد اللہ سندھی، مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی، مولانا مولوی محمد انیس، مولانا خواجہ
غلام نظام الدین، مفتی کفایت اللہ، مولانا محمد ابراہیم دربھنگوی، مولانا خدا بخش مظفر پوری، مولانا عبد الحکیم
گیاوی، مولانا محمد اکرم، مولانا منیر الزماں، مولانا محمد صادق، مولانا سید محمد داؤد، مولانا سید
اسماعیل، مولانا محمد عبد اللہ، مولانا آزاد سبحانی۔

اس طرح خلافت مرکزیہ کے لیے تمام اول ہر وہ علماء جو فروعی اختلافی مسائل میں ایک دوسرے سے اس قدر دور ہو گئے تھے کہ ایک دوسرے کی تکفیر بھی کرنے لگے تھے اور گروہ بندی اور مناظروں کے اکھاڑے روز مرہ کی زندگی بن گئے تھے۔ حتیٰ کہ مسجدوں میں دو گروہوں میں مارپیٹ اور کہیں کہیں کشت و خون کی بھی نوبت آئی جو ایک دوسرے کو سلام تک نہ کرتے تھے آج ایک دل اور ایک جان ہوکر پوری قوت سے میدان عمل تیار کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے تھے۔ یہ تھی تحریک خلافت کی برکت۔ اس نے مسلمانوں کے ضمیر کو خواہ وہ عام ہو یا عالم بیدار کر دیا۔

علمائے ربانی اور جہاد بالسیف ___ ہندوستان میں متحدہ جمہوری حکومت کا تخیل

ایک وہ گروہ مردان خدا کا تھا جو ہندوستان کو جو سیلاب دیوبند سے اور پورے میدان جہاد کو آراستہ کر رہا تھا۔

نارسائی ہمت ہے کہ بہت دور حرم ہے ۔۔۔ اک سلسلہ دار و رسن ہم نے بنایا

یہ سلسلہ حضرت ولی اللہ محدث دہلوی کی عظیم شخصیت سے شروع ہوا اور ان کے صاحبزادے شاہ عبد العزیز متوفی 1924ء نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ انہیں کے خاص مرید تھے جنہوں نے جہاد کی تیاری کرکے سکھوں سے مقابلہ کیا۔ یہ جنگ در اصل سکھوں کے خلاف نہ تھی بلکہ در اصل حکومت برطانیہ سے تھی۔ سکھ حکومت برٹش گورنمنٹ کی وفادار اور افغانستان و ہندوستان کے بیچ

ایک درمیانی مضبوط قوت کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کا طرز عمل عوام کے ساتھ بالعموم اور مسلمانوں کے ساتھ بالخصوص سفاکانہ تھا۔ سید صاحب کا مقصد مولانا حسین احمد مدنی نے "نقش حیات" میں ظاہر کیا ہے۔[1]

"سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط و اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے۔ اس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو شرکت کی دعوت دی اور ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک کے بدیسی لوگوں کے قبضہ کو ختم کرنا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی اس سے آپ کو غرض نہیں ہے جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔ چنانچہ اس مقصد میں ریاست گوالیار کے مدار المہام اور مہاراج ہندو راؤ نے سید صاحب کے ارادوں میں دلچسپی راجہ ہندو راؤ کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے وہ بہت پڑھنے کے قابل ہے۔ اس سے آپ کا اصل مقصد اور ملکی حکومت سے متعلق آپ کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے۔"

اس کے بعد اس خط کو نقل کیا ہے جو طویل ہے۔ اس کا خلاصہ خود مولانا مدنی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

"(1) آپ انگریزوں کو سات سمندر پار سے آئے ہوئے بعید الوطن اور غیر ملکی سمجھتے تھے، اور ان کے استیلاء اور تسلط سے تنگ آکر ان سے لڑنے کا عزم رکھتے تھے۔

(2) آپ ہندوستان کو اپنا ملک و وطن سمجھتے تھے

(3) ہمارے آپ کا مقصد خود اپنی حکومت قائم کرنا ہرگز نہیں تھا۔

(4) آپ مظلومیت اور باہمی ہمدردی میں ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں شریک جانتے تھے اور جہاد سے آپ کی غرض دونوں کو اجنبی قبضہ کی معصیت سے نجات دلانا تھا۔"

مولانا مدنی نے آگے چل کر بطور خلاصہ یہ بیان کیا ہے کہ تحریک آزادی جو علماء کے ہاتھوں انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ سے شروع ہوئی اور جس کی سنگ بنیاد رکھنے والے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ؒ ان کے خاندان کے لوگ اور ان کے شاگرد و مریدین ہیں۔ اس میں فرقہ واریت اور تنگ نظری کا نام تک نہ تھا۔ ان کا مقصد دنیاوی مفادات، ملک گیری، خود غرضی، عہدوں اور منصبوں کا حاصل کرنا یا کسی کو غلام بنانا نہ تھا۔ اور یہ تحریک شخصی یا کسی فرد کی حکومت فسطائیت کے لیے نہیں عمل میں لائی گئی تھی بلکہ حقیقی جمہوریت اس کا مطمح نظر تھا۔

یہاں اس کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اتحاد اسلام کی روح کی عملی مثال پیش کر دی جائے۔ اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ اتحاد اسلام کا منشا قیام ملوکیت نہ تھا بلکہ اصلاح کے لیے ہر ملک میں انقلاب لانا تھا۔ اور

---

[1] ملاحظہ ہو جلد دوم صفحہ 13

جن ملکوں میں غیر مسلم بھی آباد تھے وہاں ان سے مل جل کر استبداد کو ختم اور ایک پاکیزہ جمہوریت قائم کرنا تھا۔ جس طرح مسلم ممالک میں غیروں کی دست اندازی کو ہٹا کر ایک ستھری مبنی بر اسلام و انصاف حکومت قائم کرنی تھی، تمام دنیا میں اسی طرح خیر کے فروغ کے لیے ایک عظیم انقلاب برپا کرنا تھا۔

یہ تحریک صرف ہندوستان تک محدود نہ تھی گویا کہ نقش اول تھی۔ نقش ثانی کے لیے اس صدی کے قائد و رہبر کا انتظار تھا، وہ سوار شب دوران و فروغ دیدۂ امکان کا عکس خاص بن کر نمودار ہو اور جس نے دیوبند میں بیٹھ کر تمام عالم میں زلزلہ ڈال دیا۔ وہ ذات تھی مولانا محمود حسن کی۔

مولانا محمود حسنؒ تمام عالم اسلامی میں انقلاب بپا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مولانا بظاہر ہندوستان کے ایک محقق، عالم، مفسر اور محدث تھے جن کا مشغلہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ تعلیم دین اور تبلیغ معرفت تھا، لیکن ان سب باتوں کے ماسوا وہ ایک عظیم مجاہد اور ایک اعلیٰ پایہ کے مدبر و سیاست داں بھی تھے۔ وہ دراصل علامہ اقبال کے اس خواب کی مکمل تعبیر تھے۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی — جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا!
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

ظاہر کی خوبی پر نظر ڈالی جائے تو مولانا کو دارالعلوم دیوبند کے اہتمام، قرآن پاک کے ترجمہ و حاشیہ کی ترتیب و تدوین، حدیث کی تعلیم، تصنیف و تالیف اور ہدایت و رشد کی مشغولیتوں سے فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ کسی سیاسی حکمت کو عملی جامہ پہنانے پر توجہ دیں جو انتہائی جگر سوزی کا کام ہے اور جس کے نتائج بڑی محنتوں کے بعد ظاہر ہوتے ہیں اور وہ بھی بدیر اور بڑی انتہائی منزل میں۔ مگر اسے کیا کیجیے کہ مولانا نے انقلاب و اصلاح کے لائحہ عمل کو تمام عالم اسلامی میں پھیلا دیا تھا۔ ان کی دیدہ ور نگاہیں سیکڑوں سال آگے کے حالات دیکھ رہی تھیں وہ ملک و ملت کے لیے ایک دائمی صبح و فلاح کا پروگرام رکھتے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریز نے اپنا جال تمام دنیا میں پھیلا رکھا ہے جس کا نتیجہ ایک طرف تو ہندوستان کی غلامی ہے اور دوسری جانب خلافت مرکزیہ اور بلاد اسلامیہ کی تباہی و بربادی۔ اس لیے مولانا نے ایک طرف تو ہندوستان میں ایک متحدہ آزاد جمہوریت بنانے کا ارادہ کیا اور دوسری جانب بلاد اسلامیہ کی حفاظت و بقا کا پروگرام بنایا۔ اور دونوں کے لیے انگریز سے جنگ لازمی تھی۔ اس وقت انگلستان ہی دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور استعمار پسند ملک تھا اور بلاشبہ اس سے جنگ کی موت سامنے کھڑی تھی۔

افسوس ہے کہ مولانا کے حالات پر تاریخ نے پردہ ڈال رکھا ہے اور آپ کی انقلابی تحریکات کے بارے میں اگر کچھ معلوم ہے تو صرف اتنا کہ یاغستان میں مولانا نے جہاد کی مہم چلائی جس کا تذکرہ اس سے پہلے

آچکا ہے۔ اور ہندوستان میں ایک مجوزہ جمہوریہ کا نقشہ پیش کیا جس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ کو بنایا جو ایک بڑے انقلابی تھے۔ اس سے ان کی زندگی کے پہلوؤں کی جانب تو رہنمائی ہوتی ہے لیکن تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔ مجوزہ جمہوریہ کی تاریخی حقیقت تو گورنمنٹ آف انڈیا کے سابق وزیر داخلہ سر ولیم ونسنٹ نے اس کا مضحکہ اڑا کر محفوظ کر دی۔ سنٹرل کونسل میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے مجوزہ جمہوریہ کے بارے میں کہا کہ جو اب بھی مجوزہ ہی ہے۔ افسوس سر ولیم ونسنٹ زندہ نہیں ہیں ورنہ وہ دیکھ لیتے کہ وہ مجوزہ جمہوریہ اب حقیقت بن چکی ہے۔ یہ تو ہندوستان کے اندر مولانا کے سیاسی موقف کی نشاندہی ہے جس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کے شاگرد رشید مولانا حسین احمد مدنی نے "متحدہ قومیت" کے عنوان سے ایک کتابچہ میں بیان کیا ہے۔ اور علامہ اقبال نے اس سے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ان پر طعن کیا، بحثیں ہوئیں اور آخر کار علامہ اقبال کو، منتبہ کردہ غلط فہمی کے شکار ہوئے تھے۔ اس ضمن میں علامہ اقبال سہیل نے جواب میں قطعے اور نظمیں فارسی میں لکھیں۔ افسوس ہے کہ ان سب کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں، اتنا کافی ہے کہ مولانا کی وہ ذات تھی جنھوں نے بہت پہلے نہ صرف ہندوستان میں مشترکہ جمہوریہ کے قیام کا خواب دیکھا بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دار و رسن کو دعوت دی لیکن دنیائے اسلام میں ان کی سرگرمیوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے دیوبند میں بیٹھ کر کابل، قسطنطنیہ، قاہرہ اور حجاز میں انقلاب کی روح پھونک دی تھی۔ اس معاملہ میں مواد کی کمی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ مولانا اپنا راز اپنے قریب ترین لوگوں پر بھی ظاہر نہیں فرماتے تھے۔ قیادت اور فراست کے امتزاج کا یہ ایک بڑا کمال تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی شاید ان کے مقرب ترین لوگوں میں تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مولانا نے مجھ سے فرمایا۔ عبید اللہ افغانستان جاؤ۔ انھوں نے کہا کہ حضرت کیوں؟ تو مولانا خاموش رہے۔ پھر ایک دن فرمایا کہ عبید اللہ افغانستان جاؤ۔ پھر انھوں نے کہا کہ حضرت کیوں؟ مولانا نے پھر خاموشی اختیار کی مگر چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے۔ اب مولانا عبید اللہ کہتے تھے کہ مجھے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ حضرت پھر فرمائے کہ عبید اللہ افغانستان جاؤ تو میں فوراً تعمیل حکم کرنا۔ چنانچہ چند روز بعد پھر مولانا نے فرمایا کہ عبید اللہ افغانستان جاؤ۔ اب مدعا حاصل تھا۔ مولانا عبید اللہ افغانستان چلے گئے اور کہتے ہیں کہ وہاں جا کر خود بخود معلوم ہو گیا کہ افغانستان کیوں بھیجا تھا۔ یہاں اگر مولانا عبید اللہ پھر خاموش ہو جاتے ہیں اور تفصیلات سے پردہ نہیں اٹھاتے بلکہ ناظرین کے ذہن و فہم کو قیاس آرائیوں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک دوسرا واقعہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے مجھ سے بیان کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ان سے مولانا عبید اللہ سندھی نے کہا کہ مولانا کسی پر راز منکشف نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ کو حکم دیا کہ ایک شخص فلاں وقت تمہارے پاس آئے گا وہ جو کچھ کہے نوٹ کر لینا اور اس سے کوئی سوال نہ کرنا۔ چنانچہ وہ شخص آیا اور اس نے کارتوس، بندوقوں اور دیگر سامان کی تعداد نوٹ کرائی۔ چنانچہ انھوں نے نوٹ کر لیا اور

وہ چلا گیا۔ مسلمانوں کی ضرورت تھی ورنہ مسلمان تباہ ہو گئے۔ مجاہدوں کو منظم کر ہوا۔ حاجی صاحب ہندستان میں کوئی اسلحہ خانہ بنایا تھا جس کا اگر کوئی پتہ نہ چل سکا۔ یہاں تک کہ دوسری جنگ ہوئی۔ مولانا سندھی کو [illegible] مجاہدوں کو روپیہ کی ضرورت تھی۔ شیخ عبد الرحیم صاحب بیرون کو لکھا کہ روپیہ [illegible] روپیہ بھیج دو۔ [illegible] وقت تک آپ [illegible] گر گیا اور روپیہ [illegible] ہو گیا۔ کو نہایت خوشی ہوئی۔ [illegible] جانب روپیہ بھیجیں کسی سے [illegible] دی۔ مولانا سندھی کا تو سینہ ٹھنڈا ہو گیا۔ بیرون سے [illegible] روپیہ [illegible] کہ مجھے [illegible] آپ [illegible] تو راہ چلتے گئے۔ مولانا سندھی صاحب کو [illegible] جہاں تجربہ [illegible] کر جنگلوں کے راستے روانہ ہوئے۔ مگر چونکہ [illegible] روپیہ بھیج ہوگا۔ یہ [illegible] ایک شخص کو [illegible] گوڑ [illegible] پہنچ گیا [illegible] اور مولانا سندھی کو دیا۔ مندرجہ بالا باتیں کس امر کی نشاندہی کرتی ہیں؟ [illegible] میں ایک حاشیہ بیان کرنے جا رہا ہوں جس سے ان کی تائید ہوتی ہے۔[1]

---

[1] تفصیل [illegible] کیا جاتا ہے [illegible] مولانا سندھی [illegible] ہوئی ہے۔ ان کا افغانستان [illegible] نہیں [illegible] مشکل [illegible] انہوں نے سادہ [illegible] اور راہ راست [illegible] کے یہاں [illegible] تھے [illegible] مولانا نے بار بار [illegible] کہا کہ مجھے [illegible] افغانستان [illegible] ہوگا۔ [illegible] رہتی ہیں مجھے موقع دے کر [illegible] سوال کرتے ہیں۔ [illegible] البتہ [illegible] مولانا نے جب [illegible] تو [illegible] اور راستہ بدل دیا۔ پشاور سے کوہاٹ [illegible] عبد اللہ [illegible] جنگلوں کی شکل میں تھا۔ راستے میں جو کچھ [illegible] چنانچہ مولانا نے شیخ عبد الرحیم [illegible] شیخ عبد الرحیم آچار [illegible] کربلائی کے [illegible] مولانا نے ان کو [illegible] اور ایک [illegible] وہاں پہنچ جائے۔ شیخ عبد الرحیم نے اپنے گھر کا سامان [illegible] اور مولانا کو مل گیا اور مولانا افغانستان نکل گئے۔

جب میں 1921ء میں لاہور کے جامعہ ملیہ کے ہائی اسکول سٹاف میں [illegible] ملازمت میں لگی

تو محمد عبداللطیف کریمپوری جو کانگرس لاہور کے صدر تھے، اور [illegible] کی وجہ سے میرے

اور ان کے گہرے تعلقات ہو گئے تھے۔ وہ [illegible] بڑے آدمی تھے۔ [illegible] کی خصوصیت تھی۔

ایک وہ کراچی کے [illegible] کے فیصلے کے بعد [illegible] عظیم الشان جلسہ ہوا تھا جس میں [illegible] تھا۔

اس طرح ان کا [illegible] بھی دیکھا تھا۔ [illegible] وہ [illegible] مستقل [illegible] آدمی تھے۔

عبداللطیف کریمپوری نے مجھے [illegible] کہ وہ حضرت مولانا کی خدمت میں کافی دن رہے اور ان کے [illegible] عبداللطیف صاحب نے کہا کہ مولانا [illegible] جماعت [illegible] تھی جس کے بہت چنے ہوئے ارکان تھے۔ وہ کسی کو سفارشی خط لکھیں [illegible] جماعت کے ارکان کے لیے مخصوص تھا۔ [illegible] غرضیکہ [illegible] کے فیصلوں میں [illegible] علماء [illegible] جو قرآن کی تعلیم دیتے تھے [illegible] ایک زمانہ سے [illegible] گزر جاتے ہیں۔ [illegible] زبردست جوش جہاد بھر گیا [illegible] انگریزوں کے تحت [illegible] ہو گئے۔ [illegible] یہاں تک پہنچی کہ ایک قبائلی اپنے پانچ سال کے بچے کو بندوق کھیلنے کے لیے دے دیتا تھا۔ اور کارتوس [illegible] پوچھتا تھا کہ [illegible] بچے تو نے آج کے انگریز مارے۔ وہاں [illegible] بھی [illegible] ہو گیا۔ [illegible] وہ لوگ خود بناتے تھے اور [illegible] تک اب بھی بناتے ہیں۔ اور [illegible] ایسے تھے [illegible] اعلان کیے تھے کہ خدا کی قسم ہماری [illegible] لگتی ہے۔

جب وہاں کی [illegible] ہوئی تو مولانا عبیداللہ سندھی کو کہا گیا کہ فتحپوری میں قرآن کی تعلیم کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کریں۔ چنانچہ مولانا سندھی نے مسجد فتحپوری دلی میں 1333ھ مطابق 13-1912ء "نظارۃ المعارف" کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی اور قرآن پاک کی تعلیم دینے لگے۔ مولانا احمد علی صاحب شیرانوالہ دروازہ لاہور ان کے شاگرد اور عزیز خاص تھے۔ مولانا احمد علی صاحب ہجرت کر کے کابل بھی گئے تھے اور پھر واپس بلا لیے گئے تھے۔ وہ شیرانوالہ دروازہ لاہور کی مسجد کے ایک حجرے میں رہتے تھے اور صرف قرآن پاک پڑھاتے تھے میں نے بھی دس سپاروں کی تفسیر بلحاظ ترتیب آیات مولانا سے پڑھی تھی۔ وہ کل قرآن کو جہاد کی تشریح میں تبدیل کیے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ حیض و نفاس کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ جس طرح بیوی حلال ہے مگر ایک خاص

وقت میں اس سے قربت ممنوع ہے۔ اسی طرح حکومت کو رعایا کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کرنی چاہیے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے ایک شاگرد مولانا عبدالحی فاروقی تھے جنھوں نے سندھی صاحب کی توضیحات کو اپنی طرف سے قلمبند کرکے شائع کر دیا تھا اور اس کا نام تفسیر قرآن رکھا تھا۔ سورۂ بقرۃ کا عنوان "خلافتِ کبریٰ" رکھا تھا۔

مورخ نجیب آبادی نے مجھ سے کہا کہ مولانا سندھی نے ان سے پوچھا کہ ایک لفظ میں بتاؤ کہ قرآن کی تعلیم کا منشا کیا ہے۔ پھر خود ہی کہا کہ حکومت۔ حضرت مولانا احمد علی کے پاس جو علماء ترتیب آیات پڑھنے آتے تھے ان سے وہ پہلے پوچھتے تھے کہ سائیکل چلانا جانتے ہو۔ وہ کہتے تھے کہ نہیں تو اپنی سائیکل دے دیتے تھے۔ اس پر مشق کرنے کے بعد ہی درس میں شرکت کی اجازت ہوتی تھی۔ فرماتے تھے کہ سائیکل چلانا نہیں جانتے ہو تو ہوائی جہاز کیسے چلاؤ گے اور جہاد کیسے کرو گے۔ اس طرح قرآن کی تعلیم عام کرکے جہاد کا جذبہ ایک خاص غرض اور ایک پاک مقصد کے لیے پیدا کیا جا رہا تھا۔

بیرونِ ہند کے بارے میں انھوں نے کہا کہ افغانستان کے شیخ الاسلام، ترکی کے مفتی اعظم، شیخ الجامعۃ الازہر، علماء و مفتیانِ مصر مولانا کے ہمنوا تھے۔ اتنا تو کتابوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ افغانستان کا شیخ الاسلام دیوبند کا فارغ تھا۔ ایران کے مجتہد العصر اس زمانہ میں جب شاہ ایران نے تمباکو کی واحد ٹھیکہ داری انگریز کو دے رکھی تھی تو ہم نہیں آتے تھے تو جماعت مخلصین نے مزدور بن کر جہاز سے سامان اتارنے کا کام شروع کیا۔ اور انگریز نگراں جب شراب پی کر بدمست ہو گئے تو صندوق لے جا کر مجتہد العصر کو دکھلایا۔ اس میں تمباکو کے بجائے آلاتِ حرب تھے۔ تب مجتہد العصر نے فتویٰ دیا کہ "تمباکو نوشیدن دریں زماں حرام است"۔ رات کو جب بادشاہ حرم سرا میں گیا تو خلافِ معمول اسے حقہ تیار نہیں ملا۔ آواز دی تو کوئی نہیں بولا۔ بادشاہ کو غصہ آیا اور وہ زور سے چلائے "من آواز می دہم و کس نمی شنود، ایں چہ ماجرا است"۔ تب بیگم تشریف لائیں اور کہا کہ آج آپ کو حقہ نہیں ملے گا اور مجتہد العصر کا فتویٰ دکھلایا۔ بادشاہ نے فوراً دربار کیا اور مجتہد العصر کو بلا کر کہا کہ حضرت یہ کیسا فتویٰ ہے۔ اسلام تو ایک عالمگیر مذہب قیامت تک کے لیے ہے۔ یہ کیا کہ تمباکو پینا اس زمانہ میں حرام اور دوسرے زمانہ میں حلال۔ ایران میں حرام اور ترکستان میں حلال — مجتہد العصر نے تنہائی کی خواہش کی اور کل واقعات بیان کیے۔ انجام یہ ہوا کہ تمباکو کی اجارہ داری ختم ہوئی۔

افسوس ہے کہ مولانا کا پروگرام کامیاب نہ ہو سکا جس کا واقعہ وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ انیس احمد بی۔ اے نظارۃ المعارف میں آ کر شامل ہوا اور اپنے زہد و تقویٰ اور ترکوں سے محبت کا کچھ ایسا مظاہرہ کیا کہ ایک دن جنگ بلقان میں ترکوں کی شکست کی خبر سن کر بے تابی میں ایسا تڑپا کہ فتحپوری کی چھت پر گرا جس سے اندیشہ ہوا کہ نیچے گر کر ختم ہی نہ ہو جائیں۔ کیونکہ فتحپوری کی اوپری چھت کھلی ہوئی تھی اور کنارے کوئی دیوار نہ تھی۔

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کو اس پر کامل اعتماد ہوگیا۔ انیس احمد دوران کے والد دریں احمد دونوں کو میں نے دیکھا تھا۔ دریں احمد بجنور گورنمنٹ ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا اور حکومت کی خفیہ سروس میں ایمان رکھتا تھا کہ براہ راست وزیر ہند سے خط و کتابت کرتا تھا۔ انیس احمد نے راز فاش کر دیا اور حکومت نے طے کیا کہ مولانا کو گرفتار کر لیا جائے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی وساطت سے مولانا کو اس کی خبر مل گئی اور اپنی سکیم کی عملی کامیابی کے لیے حجاز چلے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں سے وہ دنیائے اسلام میں بہتر کام کر سکیں گے لیکن 1914ء کی جنگ چھڑ گئی۔ اور مولانا کو ترکوں کی مدد سے افغانستان آنے کا موقع نہیں ملا اور وہ مالٹا میں قید کر دیے گئے۔ ان کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل اور دوسرے لوگ تھے۔

میں نے عبد اللطیف کرتپوری کی بیان کردہ جو روایتیں لکھی ہیں وہ تاریخ شمار ہوں یا نہ ہوں لیکن جب ہم کل حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو بات صحیح نظر آتی ہے۔ ان حالات کو میں ذیل میں نمبروار درج کرتا ہوں۔

(1) بر خلاف اس کے کہ مولانا نے ایک منظم عالمی بغاوت کا پورے دنیائے اسلام میں جال بنایا تھا۔ ان کی غرض انگریزی استعمار پسند پالیسی کو توڑنا اور ہندوستان میں متحدہ قومیت قائم کرنا تھا۔ یہ تحریک گاندھی جی سے پہلے منظر پر آ چکی تھی۔ یہ قطعی ناممکن ہے کہ اتنی بڑی تحریک کل ہندوستان میں جاری ہو اور اس کے پیچھے کوئی جماعت نہ ہو۔ اس لیے جماعت مخلصین کا وجود صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(2) مولانا اپنا کام پوشیدہ رکھتے تھے۔ کسی کو کسی انھوں نے ہمراز نہیں بنایا۔ جس کو جتنا جاننا ضروری تھا اتنا ہی اس کو معلوم ہوتا تھا۔ اس کی دو مثالیں بڑی مضبوط ہیں۔ ایک یہ کہ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے مولانا عبید اللہ صاحب نے کہا کہ جب وہ کابل پہنچے تو جو کام بھی کرتا تھا اس کے بارے میں ایک خانوادہ میر حبیب اللہ صاحب نے ان کو دیا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو گا کہ تحریک کتنی گہری اور کس حکمت عملی اور شعور سے مرتب کی گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میر حبیب اللہ صاحب غدار ثابت ہوا تھا۔ دوسری مثال یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ صاحب نے مولانا منظور نعمانی صاحب کو بتایا کہ وہ کراچی میں تھے اور شیخ الہند کا ایک نامہ ملا کہ ایک شخص تمہارے پاس آئے گا وہ جو کچھ کہے محفوظ کر لینا اور اس سے کوئی سوال نہ کرنا۔ چنانچہ کراچی کی مسجد میں ایک شخص آیا اور اس نے میگزین کی تفصیل بتلائی۔ بندوق گولہ بارود وغیرہ۔ مولانا عبید اللہ نے محفوظ کر لیا۔ اور جب دیوبند گئے تو شیخ الہند کو

بتلا دیا۔ ان کو کچھ معلوم نہ ہوا کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ اب لوگوں کی زبانی پتہ چلتا ہے کہ مولانا نے سیکریٹ کا کوئی کارخانہ قائم کیا تھا جہاں اسلحہ وغیرہ رکھے جاتے تھے جس کا کوئی پتہ سی۔ آئی۔ ڈی کو نہ چل سکا۔ یہ بھی لوگ کہتے ہیں کہ وہ کارخانہ راجستھان میں تھا۔

(3) کوڈ ورڈ کے ایجاد کرنے کا وجود بھی معلوم ہوتا ہے جو بڑی انقلابی جماعتیں ضرور رکھتی ہیں۔ اسی کوڈ ورڈ میں مولانا عبیداللہ صاحب نے شیخ عبدالرحیم کو روپیہ کے لیے اطلاع دی تھی جس طرح وہ روپیہ فراہم کرکے لائے اس سے عبداللطیف بیگ کی چوری کی بات بھی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جماعت کے لوگ کسی کو سب کچھ لکھ دیتے تھے لیکن تفصیل نہیں لکھتے تھے۔ اگر لکھ دیا کہ یہ شخص ہیں ان کو اتنا روپیہ دے دو تو وہ اپنا سب کچھ قربان کرکے اتنی رقم ضرور فراہم کرے گا۔

(4) جو لفافہ امیر حبیب اللہ خاں نے مولانا عبیداللہ کو کابل میں دیا تھا اس میں تنقیح بھر لکھتے کہ کیا کرنا ہے۔

(5) مفتی اعظم قسطنطنیہ کا مصطفیٰ کمال پاشا کے خلاف فتویٰ نہ دینا اور سلطان کی جلاوطنی واپسی قبول کرلینا بھی ایک اہم واقعہ ہے۔ وہ مولانا کے زیر اثر تھے۔ تحریری کا یہ کہنا بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمود حسن نے کل دنیائے اسلام میں انگریز کے خلاف ایک جال پھیلا رکھا تھا۔

(6) راجہ مہندر پرتاپ کی افغانستان میں سرگرمیاں جو آزادی ہند کے لیے تھیں اور مولانا عبیداللہ کا وہاں کابل جاکر کام کرنا بھی اسی سلسلے کا ایک اہم مد ہے۔

مولانا مدنی تحریر فرماتے ہیں:-

"حضرت شیخ الہند صرف تفسیر و حدیث و فقہ و اصول منطق اور فلسفہ حساب و مساحت وغیرہ معقولات ہی کے ماہر نہیں تھے بلکہ ان کو [illegible] کے معلومات وقت [illegible] جاتا تھا اور تعجب کرنے لگتا تھا۔ اسی طرح حضرت کی معلومات تاریخ اور سیاسی واقعات پر وسیع اور گہری تھی۔ ہندوستان کی اقتصادی، معاشی، سیاسی، تجارتی، صنعتی، تعلیمی، انتظامی، جنگی، صنعتی وغیرہ معلومات بھی اس قدر تھیں کہ بڑے بڑے ڈاکٹر اور کالجوں کے پروفیسر ان تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اخبار بینی اور واقعات عالم پر اطلاع کا بہت شوق تھا۔ بہرحال ان کو انگریزی حکومت اور ہندوستان کے واقعات نے مجبور کیا کہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر انگریزی استبداد و مظالم کا مقابلہ کیا جائے اور کسی قسم کے خطرے کو بھی مرعوب

یا متاثر کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔"

ایک مرتبہ میں نے مولانا حسرت موہانی سے کہا کہ مولانا محمود حسن مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریرات سے متاثر ہوئے مولانا حسرت تڑپ اٹھے اور بولے کیا کہا۔ مولانا محمود حسن اور کسی کی تحریر سے متاثر ہوں۔ وہ اور چیز تھے۔ یہ تھا مقام حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کا۔

عبداللہ ہارون جعفر، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور تمام مسلمانوں کے لیڈروں کا مولانا کا مطیع و منقاد ہونا ان کے مقام کو ظاہر کرنے کے علاوہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ مولانا نے اندرون ہند کتنا کام آزادی کا کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ کثرت سے انقلابی جماعتیں بھی بنی ہوئی تھیں اور غرض یہ تھی کہ جب اسکیم کے مطابق افغانستان یا آزاد قبائل کا ہندوستان پر حملہ ہو تو وہ سب مسلح نکل پڑیں۔ توڑ پھوڑ کریں، پٹریاں الٹ دیں کارخانے برباد کر دیں، انگریزوں کو گولی مار دی جائے اور ہندوستان آزاد ہو جائے۔

دوسرا نتیجہ جو اخذ ہوتا ہے وہ "جماعت مخلصین" کے قیام کا ہے جو کاغذ کے ایک پرزے پر لوگوں کا ہزارہا روپے لے کر دوڑنا کیا ظاہر کرتا ہے۔ حضرت شیخ الہند کی اسکیم ایک اینٹ کے بھٹے کی طرح تھی جو اوپر بالکل ٹھنڈی اور اس کے اندر آگ بھری تھی۔

مولانا نے جاں نثار اور فدائے ملت لوگوں کا ایک بڑا گروہ تیار کر لیا تھا جو انقلابی جذبے سے معمور اسلام کے شیدائی، آزادی کے لیے سربکف اور بڑے عزم و حوصلے کے لوگ تھے جنھوں نے اپنی پوری زندگی جدوجہد کی نذر کر دی۔ ان میں سے ایک مولانا عبیداللہ سندھی تھے۔ مولانا سندھی گورنمنٹ کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے چنانچہ جب وہ افغانستان چلے گئے تو سی۔ آئی۔ ڈی۔ ان کو گرفتار کرنے کے لیے حرکت میں آئی اور زوروں سے کام شروع کیا۔ ایک شخص جو مولانا سندھی سے مشابہت رکھتا تھا گرفتار کر لیا گیا اور وائسرائے کو تار چلا گیا کہ عبیداللہ گرفتار ہو گیا۔ جو شخص گرفتار ہوا تھا وہ اسی جماعت مخلصین کا فرد تھا۔ وہ خاموشی سے جیل چلا گیا۔ جب اس کو یقین ہو گیا کہ اب مولانا افغانستان پہنچ گئے ہوں گے تو اس نے شور مچایا کہ مجھے کیوں گرفتار کیا گیا ہے میں عبیداللہ سندھی نہیں ہوں۔

عبداللطیف کرتپوری یہ بھی بتلاتے تھے کہ مولانا کے رضاکار تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ بڑے متقی اور پرہیزگار، عابد اور خدا شناس ہوتے تھے لیکن ان کو اجازت تھی کہ اگر شراب پلا کر کوئی کام نکلتا ہو تو شراب تک پلا سکتے ہو۔ چنانچہ ایران میں اسی کی آمد کا پتہ رضاکاروں نے انگریزوں کو شراب پلا کر چلایا تھا۔ مشہور ہے کہ انگریز بہت جلد نشہ میں بدمست و متوالا اور مدہوش ہو جاتا ہے۔

الغرض یہ ایک وسیع میدان جہاد بالسیف کا تھا جہاں سرفروشوں کا گروہ اسی طرح حکومت برطانیہ

کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کے لیے کام کر رہا تھا، جس طرح انگریز اسلام کو دنیا سے مٹا دینے کے لیے سرگرم عمل تھا اور یہ سب صرف خلافت اسلامیہ کے بقا و قیام کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائی جا رہی تھی۔ ہندوستان کی آزادی تو دیگر اقوام مشرق کی آزادی کی طرح ان رہنماؤں کا مقصد بالذات تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ایک نقطہ یہ بھی تھا کہ خلافت مقدسہ کو بچانے کے لیے ہندوستان جیسے زرخیز ملک سے برطانیہ کو نکال باہر کر دینے کے بعد اس کا نوآبادیاتی نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر اس کی تیزی دندان اور شوخی چشم شرر افشاں کا وجود باقی نہ رہے گا۔

آج کے حالات دیکھنے کے بعد یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ ناکامیاب ہوئے یا تحریک خلافت ناکامیاب ہوئی۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں انھیں تاریخ اور سیاست، علت و معلول کے مسئلہ میں مطالعہ کی کمی اور فکر کی خامی ہے۔

چوتھا باب

جنگ عظیم اور ہندوستانی سیاست

عالمگیر جنگ 1914 ـــــ 1918

سربیا، مانٹی نیگرو، یونان اور بلغاریہ نے ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے ترکی سے جنگ شروع کی۔ سلطان عبدالحمید کو معزول کرنے کے بعد نوجوان ترکوں نے زمام حکومت سنبھالی۔ ابھی صرف چند سال ہوئے تھے کہ اکتوبر 1912ء سے یہ جنگ شروع ہوگئی۔ جنگ شروع ہونے پر سب کا گمان یہ تھا کہ ترکی کامیاب رہے گا اس لیے انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر اسکوئتھ اور فرانس کے وزیر اعظم موسیو گلے مینو دونوں نے ایک متفقہ بیان جاری کیا کہ کوئی بھی کامیاب ہو جغرافیائی حدود برقرار رکھے جائیں گے۔ مگر نتیجہ برعکس نکلا اور ترکی کو شکست ہوگئی۔ تب ان دونوں وزرائے اعظموں نے اپنا رخ بدل دیا اور بڑی دلیری سے یہ اعلان کیا کہ کوئی وجہ نہیں کہ فاتحین کو فتح کا ثمرہ نہ ملے۔ یہ لڑائی مئی 1913ء میں ختم ہوگئی۔ اور 13 مئی 1913ء کو لانڈن کے مقام پر معاہدہ ہوا جس سے ترکی کے یہ صوبے آزاد ہو گئے۔ اس کے بعد سربیا یونان اور رومانیہ نے بلغاریہ پر حملہ کر دیا اور یہ دوسری جنگ بلقان اگست 1913ء میں ختم ہوئی اور رومانیہ کے دارالسلطنت بخارسٹ میں، آخری معاہدۂ صلح مرتب ہوا۔ اس معاہدہ کی رو سے سربیا کی مملکت میں کافی اضافہ ہوگیا۔

28 جون 1914ء کو مملکت آسٹریا کے تاج و تخت کے ولیعہد آرچ ڈیوک فرینک فرڈیننڈ کو سرجیوو کے مقام پر قتل کر دیا گیا۔ سرجیوو آسٹریا کے صوبہ باسنیا کا دارالسلطنت تھا۔ باسنیا پہلے سربیا کی قدیم حکومت میں شامل تھا۔ آسٹریا نے سربیا کو اس قتل کا ذمہ دار قرار دیا اور سربیا کے خلاف 28 جولائی 1914ء کو اعلان جنگ کر دیا۔ روس عرصہ سے سربیا کا حامی اور سرپرست تھا۔ اس نے اپنی فوجوں کو تیاری کا حکم دیا۔ جرمنی نے روس کو منع کیا اور روس کے نہ ماننے پر اس کے خلاف 30 جولائی 1914ء کو جس دن بلگریڈ پر گولہ باری ہو رہی تھی روس کے خلاف بھی اعلان جنگ کر دیا۔ فرانس روس کا حلیف تھا اس لیے 3 اگست 1914ء کو جرمنی نے فرانس کے خلاف بھی اعلان جنگ کر دیا اور فرانس پر حملہ کرنے کے لیے بلجیم سے راستہ مانگا۔

برطانیہ، یوروشیا، فرانس، آسٹریا اور روس نے 1839ء میں بلجیم کی غیر جانبداری کے تحفظ کی گارنٹی کی تھی، اس لیے برطانیہ نے جرمنی کو الٹی میٹم دیا کہ وہ بلجیم سے راستہ نہ طلب کرے۔ یوروشیا اب جرمنی کا ایک جزو ہے۔ جرمنی کے کچھ جواب نہ دینے پر 4 اگست 1914ء کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ 23 اگست 1914ء کو جاپان نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اور رفتہ رفتہ یہ عالمگیر جنگ بن گئی جس میں 1917ء یعنی آخر میں امریکہ بھی شریک ہو گیا۔ جس کی پالیسی اب تک یورپ کی سیاست سے علیحدگی کی تھی۔ برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کا نام اتحادی رکھا گیا۔ اتحادیوں میں حسب ذیل ممالک شامل تھے۔

(1) برطانیہ (2) فرانس (3) اٹلی (4) امریکہ (5) جاپان (6) بلجیم (7) بولیویا (8) برازیل
(9) چین (10) کیوبا (11) زیکوسلوویکیا (12) یونان (13) یوسیتہ (14) پرتگال
(15) رومانیہ۔ اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جن کو لے کر مجموعی تعداد 17 تک پہنچتی ہے۔

جنگ میں ترکی کی شرکت

برطانیہ کے کارنامے ترکوں کے سامنے کھلے پڑے تھے۔ جس طرح ایک ایک صوبہ کو ترکی کے قبضے سے نکال کر دوسروں کو ان پر اقتدار جمانے میں برطانیہ نے امداد و اعانت کی تھی وہ عیاں تھے۔ مثلاً 78-1877ء میں روس و ترکی کی جنگ میں ترکی کے دو صوبے بوسینا اور ہرزی گووینا آسٹریا کے زیر انتظام برطانیہ ہی کی سازش سے دیے گئے تھے۔ بعد کو 1908ء میں آسٹریا نے ان دونوں کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ مصر پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ اور طرابلس کی جنگ میں ترکوں کا راستہ مصر سے روک دیا تھا۔ الغرض ایک داستان پھیلی ہوئی تھی۔ نوجوان ترکوں نے اصلاحات نافذ کر کے برطانیہ کی حمایت حاصل کرنی چاہی تھی لیکن جو طرز عمل بلقان میں برطانیہ اور فرانس نے اختیار کیا اس نے نوجوان ترکوں میں آخر مایوسی پیدا کر دی اور کچھ بھی ہو نومبر 1914ء میں ترکی بھی جرمنی کی طرف سے جنگ میں شریک ہو گیا۔

جرمنی کی فوجی طاقت کا اس وقت ایک عالم لوہا مانتا تھا۔ اس نے اپنی سائنسی اور تکنیکی معلومات کی برتری کی بنا پر ایسے آلات حرب تیار کیے تھے جن کا دنیا کو تصور بھی نہ تھا۔ بلجیم کا وہ قلعہ جو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا جرمنی کی ہاوتزر توپوں نے روئی کے گالے کی طرح اڑا دیا۔ سربیا کے پرخچے اڑ گئے۔ فرانس بھاگنے لگا۔ شروع میں جو جرمنی کے سامنے آیا اس نے منہ کی کھائی۔

ترکوں نے جنگ میں داخل ہوتے ہی انور پاشا کی قیادت میں کوہ قاف کے علاقوں پر زبردست حملہ کیا۔ لیکن اس کو پسپا ہونا پڑا اور روس نے ارض روم پر قبضہ کر لیا۔ 2 فروری 1915ء کو مصر میں

نہر سویز پر ترکوں نے حملہ کیا لیکن وہاں بھی ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اب اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے ترکی کو جنگ سے خارج کرنے کا پروگرام بنایا۔ برطانیہ اور فرانس کی متحدہ بحری قوت نے 19 فروری 1915ء کو درہ دانیال پر بھرپور بحری طاقت سے وار کیا۔ اتحادیوں کا خیال تھا کہ درہ دانیال جو ایک طویل درہ ہے اور جس کے دونوں کناروں پر قلعے بنے ہوئے ہیں، ان قلعوں پر توپیں نہیں ہیں اور وہ بآسانی درہ دانیال ہو کر قسطنطنیہ پہنچ جائیں گے۔ کیونکہ سلطان عبدالحمید نے ان قلعوں کو زیر حکم آف ... غیر مسلح کر دیا تھا لیکن ان کو سخت مقابلے کا سامنا ہوا۔ نوجوان ترکوں نے آتے ہی ان قلعوں پر توپیں چڑھا دیں اور ہر طرح کا سازوسامان حرب مہیا کر دیا تھا۔ سینکڑوں توپوں کی زد سے جبکہ اس زمانہ میں ہوائی جہاز نہ تھے بحری جہازوں کا بچ کر نکل جانا محال تھا لیکن یہ معاملہ اتحادیوں کی عزت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ 19 فروری 1915ء کو پسپا ہونے کے بعد 23 فروری 1915ء، 6 مارچ 1915ء، 18 مارچ 1915ء کو زبردست تیاریوں سے حملے کیے گئے جن کی نگرانی کے لیے لارڈ کچنر بنفس نفیس بھی موقع پر آئے لیکن سب بے سود۔ اتحادیوں کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی تو 25 اپریل 1915ء کو بحری و بری مشترکہ حملہ شروع ہوا۔ اسکیم یہ تھی کہ گیلی پولی کے ذریعہ خشکی کے راستے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا جائے لیکن ترکوں نے جس طرح بحری حملہ رد کر دیا تھا اپنی روایتی شجاعت اور دلیری کو قائم رکھتے ہوئے غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں، اتحادیوں کو شکست فاش دی اور آخر کار خود اتحادیوں کے قول کے مطابق 31389 ہلاک 78740 مجروح اور 9708 گمشدہ کو چھوڑ کر اتحادی وہاں سے فرار ہو گئے۔ اس جنگ میں ترکوں نے جس جانبازی و جوانمردی کا ثبوت دیا وہ ان کی شجاعانہ کارروائیوں میں بھی عدیم المثال ہے۔ لیکن میسوپوٹامیہ میں ہندوستان کی ہندو مسلم فوجوں اور عربوں کی بغاوت سے ترکوں کو شکست پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ شروع میں تو ترکوں نے اپنی بہادری کا سکہ جمایا لیکن بعد میں موصل اور دریائے فرات پر ترکوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ حتیٰ کہ 28 ستمبر 1916ء کو تکریت پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ پھر جنرل ماؤڈ کے تحت برطانوی و ہندوستانی فوجوں کے ساتھ غازہ کی طرف بڑھا۔ ادھر فلسطین کا یہ حال ہوا کہ برطانوی و ہندوستانی فوجیں غازہ تک بڑھتی چلی گئیں اور 26 مارچ 1917ء کو غازہ کے مضبوط مسلح شہر پر حملہ ہوا۔ دو دن کی خونریز جنگ کے بعد انگریزوں کو پسپا ہونا پڑا۔ تب فرانس سے جنرل النبی کو بھیجا گیا۔ جنرل النبی نے 31 اکتوبر 1917ء کو بیر سبع پر قبضہ کر لیا اور 7 نومبر 1917ء کو غازہ کا سقوط بھی عمل میں آیا۔ اس کے بعد 16 نومبر 1917ء کو جنرل النبی نے ترکوں کو یافہ تک دھکیل دیا اور 9 دسمبر 1917ء کو بیت المقدس فتح ہو گیا۔

1917ء موسم بہار میں جنرل النبی نے دریائے اردن کو عبور کر لیا اور جنرل النبی کی سوار فوجوں نے ترکوں کے لیے مغرب کی طرف پیچھے ہٹنا ناممکن کر دیا۔ مشرق کی طرف امیر فیصل اور کرنل لارنس کی قیادت

ہیں تعاون کرنے والے عربوں نے راستہ کاٹ دیا۔ اکتوبر 1917ء کے آخر میں جنرل ایلنبی یروشلم میں داخل ہوا اور فلسطین کی فتح مکمل ہوگئی۔ آخرکار 30 اکتوبر 1918ء کو مدراس کے مقام پر عارضی صلح کی بات چیت کا آغاز ہوا اور اسی دن ترکی کی جنگی سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔

"مشرق" مورخہ 13 مارچ 1919ء کے صفحہ 18 پر نوٹ اور خبروں کے زیر عنوان حسب ذیل عبارت درج ہے:۔

"ہز ایکسیلنسی کمانڈر انچیف نے وائسرائے کی مجلس قانون ساز میں ایک بیان پیش کیا ہے جس میں دکھایا ہے کہ ہندوستان نے مختلف رزم گاہوں میں اب تک 579252 جنگجو آدمی بھیجے ہیں جن میں 3,02,199 عراق عرب، 1,40,419 مصر، 86382 فرانس، 34511 مشرقی افریقہ، 24401 خلیج فارس، 9711 درہ دانیال وسالونیکا اور 11573 عدن میں بھیجے گئے ہیں۔ ان افواج کے نقصانات کی تفصیل یہ دکھائی گئی ہے کہ 19010 آدمی مارے گئے، 61910 زخمی ہوئے، 3341 لاپتہ ہیں اور 6146 قید ہیں اور 1223 آدمیوں کے متعلق بھی قید کا گمان ہے۔ غیر جنگجو جو ہندوستان سے بھیجے گئے تھے ان کی تعداد 5 لاکھ سے زائد ہے۔"

9 نومبر 1918ء کو جرمنی نے صلح کی درخواست کی۔ قیصر جرمنی ولیم دوم نے تاج و تخت سے دستبرداری دے دی۔ اور فرار ہوگیا اور جنگ بندی کے شرائط طے ہوئے اور بعدہٗ ہر محارب ملک سے اتحادیوں نے الگ الگ صلحنامے کیے۔

دوران جنگ ہندوستان کا حال

کانگریس اس وقت تک ایک معتدل جماعت تھی جس کا نصب العین ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان دوستی قائم کرکے ہندوستان میں آہستہ آہستہ زیر سایہ حکومت برطانیہ حکومت خوداختیاری قائم کرنا تھا۔ کانگریس برطانیہ کے ساتھ تھی اور مہاتما گاندھی جنگ میں انگریزوں کے حامی تھے اور رنگروٹ بھی بھرتی کرتے تھے۔ ابھی ان کا عدم تشدد کا عقیدہ ان کے ضمیر پر حاوی نہیں ہوا تھا۔ سیاسی انقلابی جماعتوں کو جو بزور تشدد ذاتی حکومت لانا چاہتی تھیں اس جنگ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ یورپ کا معاملہ تھا اور ابھی دنیا آج کی طرح سمٹ کر اتنی چھوٹی نہیں ہوئی تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں امریکہ یورپ کی سیاست سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ 1917ء میں اوّل بار امریکہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر کے یورپ کی سیاست میں

نئی دلچسپی کا اظہار کیا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ عجیب مخمصے کے عالم میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف ہر ایک فرد کو ترکان آلِ عثمان سے گہری عقیدت تھی۔ دوسری جانب علی گڑھ تحریک جو سرسید نے چلائی اس نے برطانیہ کی عظیم وفاداری کا سبق دے کر ان کو حکومت کا پختہ حامی مداح بنا دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں ان کی بقا کا انحصار برطانوی حکومت کے قیام میں مضمر ہے۔ اس لیے ایک طبقہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو سرکاری نوکریوں اور سرکاری مراعات پر تکیہ کیے ہوئے تھے یا جاگیردار یا نواب یا تعلقدار تھا۔ وہ جوان کے زیر اثر تھا۔ اس کشمکش کی زیادہ تر وجہ علی گڑھ تحریک تھی جس کی بنیاد سرسید نے رکھی تھی۔ 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں میں جو عظیم شخصیت ابھری وہ سرسید کی تھی۔ سرسید ایک بڑے ذی علم روشن خیال، ذہین اور عالی دماغ انسان تھے۔ ان کو اگر عہد آفریں کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔ سرسید مسلمانوں کی پسماندگی اور مفلسی سے حد درجہ متاثر تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے پاس نہ اسکول ہیں اور نہ کالج اور نہ زمانہ حاضرہ کے علوم جدید کی روشنی ہمارے بچوں تک پہنچی ہے۔ لے دے کر چند عربی مدارس ہیں جہاں قدیم علوم اور درس نظامیہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ سوچ سمجھ کر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مغرب کی اچھی چیزوں سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ قدامت پرستی مسلمانوں کے رگ وپے میں اس درجہ سرایت کر گئی تھی کہ کسی جدید خیال کا قبول کرنا آسان نہ تھا۔ خاص کر جبکہ مسلمان گرداب مایوسی میں پھنسے ہوئے تھے اور سوچتے تھے کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔ سرسید نے انگلستان کا سفر کیا۔ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کو دیکھا۔ وہاں کے کلب اور مباحثے دیکھے، کھیل کے میدان دیکھے اور ان کے دل میں یہ آواز پیدا ہوئی کہ مذہبی علم کے ساتھ ساتھ ان باتوں کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ ہمارا ملک بھی آکسفورڈ اور کیمبرج بن جائے۔ یہاں بھی طالب علموں کے کلب ہوں جہاں وہ مباحثے کریں۔ کھیل کے میدان ہوں جہاں ہر قسم کے کھیل میں امتیاز لائیں اور مسلم معاشرے کا ایک نیا ڈھانچہ تیار کیا جائے۔

سرسید ایسے روشن ضمیر اور دانا تھے کہ انھوں نے اس زمانہ میں جب کوئی اس کا خواب بھی نہ دیکھ سکا تھا آج کا منظر دیکھ لیا تھا اور اس کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی تھی حتیٰ کہ درسگاہ کا اقامتی کردار جس کی ضرورت اور جس کے محاسن کا تصور جدید ہے سرسید کا وہ بھی ایک خواب تھا۔ انھوں نے آکسفورڈ اور اور کیمبرج کی نقل کی۔ لیکن انھوں نے مذہب پر بھی نظر رکھی انھوں نے کہا کہ جس طرح وہاں لڑکے گرجا میں جاتے ہیں یہاں مسجدوں میں جانا، نماز پڑھنا اور دین کی تعلیم حاصل کرنا لازمی قرار دیا جائے۔ انھوں نے ولایت کی طرح یہاں بھی لڑکوں کا لباس مقرر کیا لیکن ان کا لباس نہیں لیا بلکہ ترکی ٹوپی، پائجامہ اور ترکی کوٹ

شو ور موزہ سب میں قرار دیا۔ جو اسے زیب نہ دے وہ ڈائننگ ہال میں گھس نہیں سکتا جہاں سب مل کر ہی ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ الغرض سرسید نے دینداری اور مذہب کو جدید علوم اور جدید تہذیب سے ملا کر ایک نیا معاشرہ تعمیر کیا اور ان کی عظمت کے لیے اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ آج وہی چیز ہر شخص کو محبوب و مرغوب ہے۔ سرسید انتہائی مخلص انسان تھے، اور استقلال مزاج، صبر، بردباری، سنجیدہ شعور میں یکتائے روزگار تھے۔ انھوں نے مراسم کی زنجیریں توڑیں اور نئے آئینِ تہذیب و تمدن مرتب کیے جو آج بھی رائج ہیں۔ سرسید ایک عظیم انسان تھے۔ ایسے انسان جن کا مثل صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے قوم کو ایک فکر دی اور ایسی فکر جس نے مسلم قوم کے دماغ پر قبضہ کر لیا اور بے شمار دانشور ان کے گرد جمع ہو گئے۔ علامہ شبلی جیسا مورخ، حالی جیسا شاعر و مفکر، ڈاکٹر نذیر احمد جیسے انشاپرداز و ادیب، نواب محسن الملک، مولوی ذکاء اللہ، نواب وقار الملک جیسے فاضل مدبر و مخلص سب سرسید کے ہمنوا، معین و مددگار تھے اور سب نے مل کر ایک ایسا کالج بنایا جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے پکارا جاتا ہے اور جس نے ملت اسلامیہ ہند کو سچے خدمت گزار اور وہ سب کچھ دیا جو اسے درکار تھا۔ سرسید نے علی گڑھ میں فرقہ واریت کو کبھی گھسنے نہیں دیا اور وقت کے قانون کے مطابق اگر وہ علی گڑھ کو صرف مسلمان بچوں تک محدود رکھتے تو کوئی امر مانع نہ تھا۔ لیکن سرسید نے انتہائی وسعت قلب کا اظہار کرتے ہوئے کالج کو ہر طبقہ و خیال، ہر مذہب و ملت کے لیے کھلا رکھا، تنگ نظری سے گریز کیا اور سب سے پہلا طالب علم جو علی گڑھ سے گریجویٹ ہو کر نکلا وہ مسلمان نہیں ہندو تھا۔ اس طرح سرسید کے صحیح خیالات اور مزاج کا اندازہ ہوگا۔

1883ء سے 1894ء تک سرسید کی یہی کیفیت رہی۔ اس زمانہ کی تحریریں اور تقریریں یہی بتاتی ہیں کہ سرسید قوم سے مراد ہندو و مسلمان دونوں لیتے تھے اور مشترک حکومت ہی نہیں مشترک تہذیب کے بھی قائل تھے جسے آج سیکولرازم کہا جاتا ہے اس کی بنیاد سرسید نے رکھی۔ اینگلو محمڈن اورینٹل کالج ہندو مسلمان بچوں، ہندو مسلمان اساتذہ کا ایک خوش گوار امتزاج تھا۔ یہیں سے پہلے گریجویٹ ایشوری پرشاد نکلے اور یہاں علامہ شبلی اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے ساتھ چکرورتی جادوں چندر، چکرورتی بھوانی چندر بھی اساتذہ میں تھے اور 47 اساتذہ میں 17 ہندو تھے اور وہ کلیدی جگہوں پر فائز تھے۔ سب سے پہلا سپاسنامہ علی گڑھ کالج کی طرف سے مہاراجہ ہنبارہ کو دیا گیا۔ اسی لیے علامہ اقبال نے لوح سرسید سے حسب ذیل پیغام اخذ کیا ہے جو بالکل صحیح در حقیقت پر مبنی ہے۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

علی گڑھ کالج میں سرسید نے ہندو مسلم اتحاد قومی یکجہتی و سیکولرازم کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ سرسید نے نوجوان نسل کے لیے پوری طرح اسلام پر قائم رہتے ہوئے علوم جدیدہ کی تعلیم و تحصیل کا جو خواب دیکھا تھا وہ بھی پورا ہوا۔ علی گڑھ کے ترک اس پیغام کے مصداق ثابت ہوئے۔

زمانے بار سطو آشنا باش دمے باساز بیکن ہمنوا باش

ولیکن از مقام شاں گزر کن مشو گم اندریں منزل سفر کن

کالج پھلا پھولا۔ میرے ایک انگریز پروفیسر نے مجھ سے کہا کہ ان کا ایک دوست کلکتہ میں ملا اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو۔ پروفیسر نے کہا علی گڑھ۔ تو اس نے کہا اچھا علی گڑھ؛ جہاں کے لڑکے فیز کی تنی لال ٹوپی پہنتے ہیں اور کرکٹ اتنا عمدہ کھیلتے ہیں؛

سرسید نے قوم کو ہمت دلائی۔ کام کرنے کے لیے اکسایا۔ مایوسی میں امید کا چراغ جلایا۔ اس سے کہا کہ اپنی خامیوں کا احساس کرو اور ان کو دور کرو کیونکہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر انقلاب پیدا نہ کرے۔ خودشناسی و خود اعتمادی اور قول و عمل میں راستبازی کی تعلیم دی اور اپنے صبر و استقامت سے قوم مسلم کے مردہ جسم میں تازہ خون دوڑایا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ آج بھی وہی ہے، اس کا کردار بھی وہی ہے، اس کا خمیر بھی وہی ہے اور اس کا انداز فکر بھی وہی ہے۔

اس طرح سرسید کی عظیم شخصیت ایک انقلاب آفریں شخصیت تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ فلسفہ ہمارے داہنے ہاتھ میں ہوگا نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لاالٰہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر، وہ انھوں نے کر دکھایا۔ انھوں نے سیکولرازم کا جو بیج کالج کے اندر رکھا تھا وہ آج تناور درخت بن چکا ہے اور باد حوادث کے کسی جھونکے سے بھی وہ سرنگوں نہیں ہوا۔

سرسید اور سیاست ہند

لیکن سرسید ہندوستان کی سیاست پر اس وقت نمودار ہوئے جب 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمان بری طرح کچلا گیا تھا۔ قتل، پھانسیوں اور جائدادوں کی ضبطی کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ جو عرصہ تک جاری رہا تھا۔ اور مکمل تسلط ہونے کے بعد ہی انگریز حکومت نے جو نیم ملازمتوں سے مسلمانوں کا مکمل اخراج کر دیا تھا۔ بڑی نوکریاں تو خیر ہندوستانیوں کو ملتی ہی نہ تھیں۔ سرسید ان حالات سے بے انتہا متاثر تھے

اور اس کا انھوں نے کچھ زمانے کے بعد یہ حل سوچا کہ:۔

(۱) مسلمانوں کے افلاس کو دور کیا جائے۔

(2) ملک کی آزادی کو جہاں تک ممکن ہو ٹالا جائے۔ اور مسلمانوں کے افلاس کو دور کرنے اور باعزت زندگی حاصل کرنے کے لیے حکومت کی مکمل وفاداری کا تمغہ حاصل کیا جائے کیونکہ اگر ملک آزاد ہوا تو $\frac{3}{4}$ ہندو اور $\frac{1}{4}$ مسلمان ہوں گے تو پیس دیے جائیں گے چنانچہ ۱۱ اور 12 جنوری 1888ء کے پائیر میں سر سید کی ایک تقریر شائع ہوئی جو انھوں نے 28 دسمبر 1887ء کو ایک مجمع کے سامنے کی تھی جس میں تعلقہ دار اور حکومت کے سول اور فوجی افسران، وکلاء، نمائندگان اخبارات، فضلاء اور دانشور ہر فرقہ و خیال کے ہندو میں سنی و شیعہ علماء ہندوستان اور انگلستان کے نوجوان تعلیم یافتہ موجود تھے۔ تقریر میں انھوں نے زور دیا تھا کہ مسلمانوں کو ہرگز کانگریس میں شریک نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اگر ہندوستان میں نمائندہ حکومت قائم ہوئی تو ان کا مستقبل تاریک ہوگا اور ان کو تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ اور اس سے مسلمانوں کو دائمی غلامی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ سر سید نے اس کے تین وجوہ بتلائے تھے۔

(۱) ہندو اور مسلمان دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ فرض کیجیے کہ انگریز اپنی فوجیں وغیرہ لے کر چلے جائیں تو کون یہاں حکومت کرے گا ظاہر ہے کہ تخت حکومت پر ہندو اور مسلمان دونوں نہیں بیٹھ سکتے۔ کوئی ایک دوسرے کو مغلوب کرے گا۔ یہ امید کرنا کہ دونوں مساوی اختیارات رکھیں گے امر ناممکن اور ناقابل عمل تصور کی تمنا کرنا ہے۔

(2) انتخابی حکومت ہندوستان کے لیے غیر موزوں ہے اس لیے کہ اگر ووٹ لیے گئے تو مسلمان مسلمانوں کو اور ہندو ہندوؤں کو ووٹ دیں گے۔ ایسی صورت میں $\frac{3}{4}$ اور $\frac{1}{4}$ کی نسبت ہوگی

(3) مسلمانوں کو انگریزی حکومت پر پورا بھروسہ کرنا چاہیے۔ وہ ان کے حقوق کا تحفظ کر سکتی ہے اور ان کو انتظامیہ میں باوقار نمائندگی عطا کر سکتی ہے

یہ تقریر جس عظیم الشان مجمع میں اور جس ماحول اور زمانہ میں کی گئی تھی اس کی وجہ سے اس کی بہت اشاعت ہوئی۔ ہندوستان کے اخبارات میں غصہ اور نفرت پھیلنے لگے۔ البتہ لندن ٹائمز نے 16 جون 1888ء کی اشاعت میں اس تقریر کو ایک ہندوستانی کی زبان سے بہترین مباحث سیاسی قرار دیا۔

سر سید نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ سیاست سے بالکل الگ رہیں اور صرف تعلیم تک اپنے آپ کو محدود رکھیں۔ سیاست کو شجر ممنوعہ قرار دینے میں سر سید کا منشا یہ تھا کہ مسلمان انگریزی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے

رہیں۔ انگریز ہندوستان سے نہ جائیں کیونکہ وہی مسلمانوں کا تحفظ کرسکتے ہیں۔ سرسید مسلمانوں کو زیادہ عرصہ تک الگ رکھ سکے اور جیسے جیسے مختلف نیم سیاسی سوسائٹیاں قائم ہوتی رہیں اور آخرکار 1906ء میں مسلم لیگ کا ظہور ہوا۔ مسلم لیگ پر نوابوں اور جاگیرداروں کا قبضہ تھا اور اس کا رنگ رجعت پسندانہ تھا۔ بعد کو رائے عامہ سے مجبور ہوکر اس نے سیلف گورنمنٹ کا نام بھی لیا اور "کونسل" کا لفظ اس کے ساتھ لگا دیا۔ مسلم لیگ ہی کے بارے میں مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا تھا۔

ع وہ لیگ ہر پہر بدلتی ہے جو کروٹ

صرف سامراج پسند گروہ سے اور تحریک خلافت کے ایک قلیل عرصے کے سوا جو تمام وقت جب اپنے اس نظریے پر قائم رہی تا آنکہ ہندوستان تقسیم ہوگیا اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کو جن ہولناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور کرنا پڑ رہا ہے وہ ہر ایک کے سامنے ہے۔

کم و بیش نوے سال سے زیادہ گزرنے کے بعد آج جب ہم سرسید کی تقریریں پڑھتے ہیں تو جہاں تک سیاسی فکر کا سوال ہے ہمیں سرسید عظیم نہیں معلوم ہوتے لیکن جہاں تک ان کی تعلیمی خدمتوں کا معاملہ ہے وہ انسانی عظمت کے حدود پر نظر آتے ہیں۔ بعض لوگ سرسید کی بعض تقریروں کے جستہ جستہ فقروں سے سرسید کو نیشنلسٹ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ تاریخ کو مسخ کرنا ہے۔ مثلاً مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے سرسید کے سیاسی عقائد پر بحث کی ہے[1] اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ صرف نیشنلسٹ نہیں بلکہ انقلابی تھے۔ مولانا نے سرسید کی 1884ء کی دو تقریروں کو اساس بنایا ہے جو 1888ء کے اعلان بالجبر سے قبل کی ہیں۔ بلاشبہ اس وقت جن وسائل سے وہ مسلمانوں کا افلاس اور ان کی پستی کو دور کرسکتے تھے پختہ نہیں ہوئے تھے اور جیسا کہ پہلے کہا گیا ان میں فرقہ پروری برائے نام بھی نہ تھی۔ سرسید کشادہ قلب اور صاف دماغ انسان تھے لیکن بعد کو بطور وسیلہ حصول مقصد ان کے خیالات میں جہاں تک ملک کی آزادی کا تعلق ہے ایک زبردست انقلاب آیا چنانچہ 1887ء میں یعنی اس کے تین سال بعد انھوں نے ایک عظیم الشان مجمع میں اعلان کیا کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں اور ہندوستان نمائندہ حکومت کا اہل نہیں ہے۔

اس طرح سید امیر علی کی مجوزہ نیشنل محمڈن کانفرنس میں سرسید کی عدم شرکت سے ہرگز یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سیاست میں فرقہ واریت کے خلاف تھے بلکہ اصل وجہ یہی تھی کہ وہ مسلمانوں کے تحفظ کے لحاظ سے ہندوستان کو انگریزوں کے زیر سایہ رکھنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے

---

[1] "برہان" دہلی ماہ ستمبر 1972ء صفحہ 158 سے صفحہ 166 تک

کے خلاف تھے اور اسی لیے انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کی۔ اس کے خلاف "دی یونائیٹڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" بنائی جو ہندوستان کے گلے میں ابدی غلامی کا طوق ڈالے رکھنا چاہتی تھی۔ انھوں نے سید جمال الدین افغانی کی تحریک کی پرزور مخالفت کی اور وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کو غلط ٹھہرایا۔ ان سب باتوں کو تاریخ کا کوئی طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مولانا اکبر آبادی نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ "ہندوستان اور مسلمانوں کا مشترکہ پلیٹ فارم ہو یا کوئی انجمن صرف مسلمانوں کی ہو، سرسید کو یقین تھا کہ مسلمانوں کے لیے کسی سیاسی تحریک میں شریک ہونا مضر ہوگا۔

مگر یہ یقین کیوں تھا، اس کے اسباب کیا تھے؟ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ موجودہ نظام حکومت میں کسی ادنیٰ ترین تبدیلی کے خواہاں نہ تھے اور یہی تھا فرق سرسید اور معتدل کانگریسی رہنماؤں میں۔

مولانا اکبر آبادی نے مولانا حالی کا وہ قول بھی نقل کیا ہے جس میں مولانا حالی نے مسلمانوں کی سیاست میں شرکت مسلمانوں کی نااہلی قرار دیا ہے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں "اصل بات یہ ہے کہ جب کانگریس کے بلند ارادوں پر نظر کرتے ہیں اور پھر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے ہیں تو ہم کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ سلوہ خوردن روئے باید"

لیکن انگریز بھی تو یہی کہتا تھا کہ ہندوستانی حکومت کے لیے نااہل ہیں اور ہم ان کو تربیت دے رہے ہیں۔ پھر مولانا حالی کے قول کو کسی نظریے کی تائید میں جس کا تعلق سرسید سے ہو پیش کرنا فعل عبث ہوگا۔ حالی ایک بہت بڑے شاعر، بڑے حق پرست اور مخلص انسان تھے لیکن مسدس حالی ہی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ایسے مرثیہ خواں ہیں جن کو ہر جگہ زندگی ماتم نظر آتی ہے اور اس کے علاوہ سرسید کے وہ ہمیشہ حامی اور ذہنی ساتھی تھے۔ بقول اکبر مرحوم ؎

سید کا حال حضرت حالی سے پوچھیے — بالے میاں کا حال موفالی سے پوچھیے

سرسید صرف انگریزوں کی حکومت ہی سے مرعوب نہ تھے بلکہ ان کی تہذیب سے بھی انتہائی مرعوب تھے۔ جس کسی نے تہذیب الاخلاق انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا مطالعہ کیا ہے یا سرسید کی تحریروں کو دیکھا ہے اسے معلوم ہے کہ وہ انگریزوں کی عادات اور ان کے اطوار، ان کے رہنے اور کھانے کے طریقوں کے کتنے مداح تھے۔ بلکہ مشرقی طرز کو غیر مہذب اور دیہاتی پن قرار دیتے تھے۔

مذہب کے معاملہ میں بھی ان کی مرعوبیت کا یہی عالم تھا چنانچہ کلام پاک کی جو تفسیر انھوں نے لکھی ہے اس میں ملائکہ، اجنہ، معجزات، معراج جسمانی سب کا انکار کیا۔ جبریل امین کا بھی انکار کیا۔ خود کہتے ہیں کہ

بجبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم — ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم

سرسید کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اندازہ ہی نہ کر سکے کہ ملک ضرور آزاد ہو گا اور وہ یہ سوچ سکے کہ تب مسلمانوں کا کیا حال ہوگا۔ ان کے بس میں ہندوستان کی مختلف قوموں اور خاص کر ہندو مسلمانوں کے مسئلہ کا کوئی حل نہ تھا اس لیے انھوں نے راہ فرار اختیار کی بڑی جرأت کا کام ہے۔ جس شخص نے اتنا بڑا ذہنی انقلاب پیدا کر دیا ہو جس نے دوستوں کی پرواہ نہ کی ہو اور جدید سود و تہمت کو گلے کا ہار بنایا ہو وہ اتنا کم نظر تو نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ سرسید نے اپنی دیدہ وری سے اس کو محسوس کر کے جان لیا ہو کہ اب اس کا توڑ ان کے بس کا کام نہیں۔ اور ایک عبوری دور کے لیے ایک پالیسی اختیار کی ہو۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ سرسید نے سیاسی کام آخر عمر میں شروع کیا۔ اور ان کو اپنے مشن کی کامیابی کے لیے جلدی تھی۔

مسلم لیگ جو خالصتاً مسلمانوں کی جماعت تھی اور جس نے ہمیشہ سوائے ایک خدمت کے ایک عارضی وقفہ کے درمیان جب پبلک کا دباؤ اس پر تھا آزادی ہند کی مخالفت اور سرسید کی پالیسی کا ایک لازمی نتیجہ تھی۔ علامہ شبلی نے مسلم لیگ کی سیاسی پالیسی پر حسب ذیل قطعہ لکھا ہے:

معترض ہیں مجھ پہ یہ سب لیڈران قوم — جرم بس یہ ہے کہ کیوں بدلا وہ انداز کہن

میں نے کیوں لکھے یہ سب سامنے پے در پے — کیوں نہ کی تقلید طرز رہنمایان وطن

کانگریس سے مجھ کو اظہار نفرت کیوں نہیں — کیوں حقوق ہند میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن

خیر میں تو شامت اعمال سے ہوں ہوں ہوں — آپ تو فرمائیے کیوں آپ نے بدلا چلن

آپ نے شملہ میں جا کر کی تھی جو کچھ گفتگو — ماحصل اس کا یہی تو تھا بس از تمہید فن

ملک بانٹیں جب ہندوؤں کو کچھ حقوق — اس میں کچھ حصہ ہم کو بھی بہ پنجتن

یہ قطعہ سرسید کے جسم کا ... تو نہیں ہو سکا۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید نے نظام حکومت میں ادنیٰ ترین تبدیلی کو بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ انگریز اسی طرح ملک پر حکمراں رہے اور مسلمان کسی قسم کی سیاست میں حصہ نہ لیں اور اسی کا نام علی گڑھ تحریک ہے۔

علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج

علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج میں بعض لوگوں نے امتیاز نہیں کیا۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے کالج کو علی گڑھ تحریک کا ایک حصہ سمجھ کر اس سے بغض و عداوت کا اظہار کیا حالانکہ یہ بات صریحاً غلط ہے۔ علی گڑھ کالج ایک تعلیمی ادارہ ہے اور تمام دیگر تعلیمی اداروں کی طرح یہاں سے مختلف الخیال لوگ نکلے ہیں۔ اس کالج نے ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا حسرت موہانی، رفیع احمد قدوائی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، خواجہ

عبدالمجید، تصدق، حمد حسن شیروانی، ڈاکٹر سید محمود وغیرہ جیسے احرار بھی پیدا کیے۔

انگریزوں نے اپنے پروپیگنڈے کی فن کاری سے یہاں بھی تساہل نہیں برتی اور اپنے ریزہ چینوں کی معرفت یہ مشہور کر دیا کہ علماء نے سرسید پر جو کفر کا فتویٰ دیا تھا وہ اس لیے تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کذب صریح ہے۔ انگریزی زبان، علوم جدیدہ اور سائنس وغیرہ کی تعلیم حاصل کرنے کی کسی عالم نے کبھی مخالفت نہیں کی۔ سید جمال الدین افغانی جس نے سرسید پر بڑا کفر کا فتویٰ دیا تھا، خود ان علوم کی تعلیم کا زبردست مبلغ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ سرسید جس طرح قرآن پاک کی تفسیر کرتے تھے اور پھر جس طرح مسلمانوں کو انگریزوں کے قدموں میں اس وقت ڈال رہے تھے جب دنیا میں اسلام کی تباہی کا انگریز زبردست جال بچھا رہا تھا، اس سے علمائے حق نے بیزاری ظاہر کی تھی۔ سید جمال الدین نے اپنے مضمون "شرح حال نیچریان" میں سرسید کو بہت سخت الفاظ سے یاد کیا ہے۔ (اس میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں ایک فرقہ نیچریان جو کی نسبت سے نیچر کی ملاحظات اور اپنے عقائد کی وجہ سے بدنام ہے۔ یہاں نیچریان سے نیچری مراد ہیں) پس سرسید پر کفر کا فتویٰ اس لیے تھا کہ انھیں نیچری قرار دیا گیا تھا، انگریزی تعلیم دلانے کی وجہ سے نہیں۔

اس مسئلہ پر ایک ایسے عظیم ترین عالم و محقق و عارف کی رائے ذیل میں درج کی جاتی ہے جس کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن نے 29 اکتوبر 1920ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کی بنیاد رکھنے کے لیے جو اجتماع کیا گیا تھا اس کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبہ میں فرمایا۔

> "آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔"

اسباب بغاوت ہند میں خود سرسید نے لکھا۔

> "جب انگریزی کالج کلکتہ میں قائم تھے اول اول گو ان سے بھی کچھ وحشت لوگوں کو ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں شاہ عبدالعزیز تمام ہندوستان میں بڑے مولوی تھے زندہ تھے، مسلمانوں نے ان سے فتویٰ پوچھا۔ انھوں نے صاف جواب دیا کہ انگریزی کالج میں جانا اور پڑھنا اور انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب سب درست ہے۔ اس پر سینکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہوئے۔"

یہ سب باتیں یہاں اس لیے درج کی گئیں کہ 1888ء سے انگریزوں کی غلامی کا جو طوق گلے میں پڑا تھا اور جس طرح انگریز پر اعتماد کرنے کی تعلیم دی گئی تھی وہ ایک طرح اپنا کام کر گئی تھی۔ اس لیے جب حکومت

برطانیہ نے خلافت مرکزیہ اسلامیہ اور اماکن مقدسہ کے تحفظ کا وعدہ کیا تو اس طبقہ نے یقین کرلیا اور انگریز کی فوج میں ہی نہیں بلکہ بیت المقدس تک میں ترکوں کے خلاف جنگ کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی اور کثیر تعداد میں اسلام کا قلعہ خود ڈھانے کے لیے کمربستہ ہوگئے۔ اس سے اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ بعد کو جو ہنگامہ ہندوستان میں پیدا ہوا وہ اس امر کا مظہر ہے کہ یہ سب اوپری باتیں تھیں۔ دل کی اندرونی گہرائیوں میں کچھ اور ہی تھا جس طرح سرسید اپنی تمام کوششوں کے باوجود مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے سے باز نہ رکھ سکے دھیرے دھیرے مختلف سوسائٹیاں بنتی بنتی آخر کار مسلم لیگ وجود میں آگئی۔ اسی طرح علمائے اسلام نے دینِ برحق کے سایہ میں آزادی ہند کا جو آوازہ بلند کیا تھا ناکام نہیں رہا اور دلوں میں جگہ کرتا چلا گیا۔

دوران جنگ برطانیہ کا طرز عمل اور ناکام مقابلہ

جب 1914ء میں ترکی عالمگیر جنگ میں شریک ہوا تو خلیفۃ المسلمین نے اعلان جہاد کرکے تمام دنیا کے مسلمانوں کو شرکت کے لیے حکم دیا۔ ایک انگریز جریدہ گرافیک GRAPHIC میں سلطان المعظم ترکی کی تصویر بھی تھی جو ایک عام جلسہ میں جہاد کا فتویٰ پڑھ رہے تھے۔ اس تصویر کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:۔

THE SULTAN PROCLAIMING JEHAD (HOLYWAR)
TURKEY PRONOUNCING HER OWN DEATH

یعنی سلطان جہاد مقدس کا اعلان کررہے ہیں۔ ترکی اپنی موت کا فتویٰ خود ہی دے رہا ہے۔

افغانستان میں مولانا عبیداللہ سندھی نے امیر حبیب اللہ کو انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے آمادہ کرنا چاہا لیکن امیر حبیب اللہ انگریزوں کا دوست اور وظیفہ خوار تھا۔ ایسے شخص کو انگریزوں سے لڑنے پر آمادہ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ مگر اسی امید موہوم پر کتنے ذہین اور ہونہار اور دولتمند گھرانوں کے طلباء اور نوجوان بڑی مشقت اٹھاکر افغانستان بھاگ کر پہنچے جن میں مولوی محمد علی قصوری بھی تھے جو کیمبرج یونیورسٹی کے ایم اے اور رنگلر تھے اور قصبہ قصور (نزد لاہور) کے معزز تعلیم یافتہ اور ذی حیثیت خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ بعد کو ہندوستان آگئے تھے۔ قصوری خاندان کے لوگوں سے میرے خصوصی تعلقات تھے شرعی وضع و لباس اور تبلیغ کا کام اور تجارت ان کا مشغلہ تھا۔ دیندار تھے، ذی علم تھے اور صاحب ثروت بھی۔ اللہ نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتیں عطا کی تھیں۔

ترکی اور جرمنی محاذ یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ہندوستان پر حملہ ہوجائے۔ شیخ الہند کو یہ شبہ تھا کہ

شاید صرف امیر حبیب اللہ کے ذریعہ یہ کام نہ ہو سکے گا اس لیے قبائلیوں سے مدد کرانے کے لیے بھی آپ نے یاغستان کا انقلابی مرکز بنایا تھا۔ خلیفۃ المسلمین نے جہاد کا حکم نامہ امیر حبیب اللہ کو بھیج دیا تھا اور ایک ترکی جرمن مشن بھی اس غرض کے لیے افغانستان آیا۔ ایبک لکھتے ہیں:۔

"لیکن افغانستان کی حکومت سے جس میں انگریز پرستوں کا زور تھا مشن اپنی تجویزیں نہ منوا سکا۔ امیر حبیب اللہ خاں ایک طرف اس مشن کے ساتھ تھے اور دوسری طرف انگریزوں کے ساتھ بھی اچھے تعلقات رکھنے تھے۔ وہ ایک طرف تو اس مشن سے کہتے رہے کہ اگر ترک جرمن افواج افغانی سرحد تک پہنچ جائیں تو فوراً انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیں گے اور دوسری طرف مشن سے جو بات چیت ہوتی تھی اس کی انگریز حکومت کو خبر دیتے تھے۔"

امیر حبیب اللہ خاں کے قتل کے بعد لارڈ کرزن وزیر خارجہ برطانیہ نے جو بیان دیا اس سے امیر حبیب اللہ کی اسلام سے غداری پر مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے:۔

"لارڈ کرزن نے ایک صاحب سے دوران گفتگو بیان کیا کہ گورنمنٹ کو امیر حبیب اللہ خاں کے انتقال کا حال معلوم کر کے سخت رنج و افسوس ہوا ہے۔ وہ گورنمنٹ کے سچے خیر خواہ اور دوست تھے۔ دوران جنگ وہ مشکلات کے موقع پر ہمیشہ ایک گہرے دوست ثابت ہوئے۔"[1]

ترکی و جرمنی کا رخ ہندوستان کی طرف پھیرنے کے لیے جو کوششیں ہوئیں وہ بھی چنداں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے ایک ترکی فوجی دستہ ایران کے راستہ افغانستان کو روانہ ہوا۔ اس مہم کے سردار رؤف بک تھے جن کا یہ کارنامہ کہ جنگ بلقان کے زمانہ میں انھوں نے حمیدیہ کروزر HAMIDIACRUISAR کے یونانی بیڑوں پر کیسے جاں نثارانہ و بہادرانہ حملے کیے تھے ہر ایک کی زبان پر تھا لیکن افسوس یہ مہم ناکام رہی، در ایران میں انگریزی اور روسی فوجوں کی موجودگی کی وجہ سے ترکی فوجی دستہ افغانی سرحد کی طرف نہ بڑھ سکا اور اس کو ترکی واپس جانا پڑا۔ ترکی جرمن مشن بھی ناکام 1916ء میں افغانستان سے واپس گیا ہوا۔ محمود حسن نے مکہ معظمہ سے بھی اپنی مجاہدانہ سرگرمی کو جاری رکھا چونکہ مولانا حکومت ہند سے خفیہ حجاز گئے تھے جو انگریزی جاسوسی قابلیت کے مقابلہ میں ایک بڑا کارنامہ تھا۔ حکومت ہند کو جیسے ہی مولانا کی روانگی کی خبر ہوئی بمبئی گرفتاری کے لیے تار دے دیا۔ مگر مولانا وہاں سے بھی نکل گئے۔ پھر جہاز کے کپتان کو تار دیا مگر کپتان کو تار اس وقت ملا جب آپ جزیرہ سعد میں قرنطینہ کے لیے اتر چکے تھے۔ آپ وہاں اور لوگوں کے علاوہ انور پاشا اور جمال پاشا سے ملے جو مدینہ منورہ آئے ہوئے تھے اور اس سے چند دستے تحریر کرائے جن میں قبائل کے باشندوں کو امداد

[1] ہفتہ وار مشرق گورکھپور 13 مارچ 1919ء صفحہ 3

کا اطمینان دلایا گیا تھا۔ مولانا نے مولانا ہادی حسن کی معرفت بڑی ہوشیاری سے یہ دستی مکتوب، ہیم کو پہنچانے اور سرکاری خفیہ دھوکا کھا گئی۔ انور پاشا کی رائے تھی کہ مولانا خود قبائلیوں میں جائیں اور مولانا کی بھی یہی خواہش تھی مگر راستہ مسدود ہو گیا۔ تب آپ استنبول کی راہ سے جانے کے لیے تیار ہوئے اور طائف میں غالب پاشا سے ملے اور استنبول جانے کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن اسی زمانہ میں شریف مکہ نے طائف پر چڑھائی کر دی اور ترکوں کے خلاف عربوں کی بغاوت کا آغاز ہو گیا۔ مولانا بہت مشکلات جھیل کر مکہ معظمہ آئے یہاں پر مولانا سے ایک فتویٰ پر دستخط کرنے کے لیے کہا گیا جس میں ترک قوم کی تکفیر تھی۔ سلاطین آل عثمان کی خلافت سے انکار کیا گیا تھا اور شریف مکہ کی بغاوت کو حق بجانب اور مستحسن ٹھہرایا تھا۔ فتویٰ خان بہادر مبارک علی اورنگ آبادی نے بہ اشارہ حکومت ہند حجاز اگر شریفی علماء کے دستخط سے بطور استفسار مرتب کرایا تھا۔ اور اس کا عنوان تھا "مکہ مکرمہ کے علماء کی جانب سے جو حرم شریف میں درس دیتے ہیں" مولانا نے اس فتویٰ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

اس طرح بارود ہندوستان کے اندر علمائے ربانی نے بھر دی تھی کہ ایک چنگاری بھی روشن ہوتی تو شعلے نکلتے مگر افسوس کہ نیوں کی غداری سے اس کا وقت نہ آیا لیکن علمائے حق نے اپنا فرض خلافت مرکزیہ لیبیہ اور جدوجہد آزادی کا ادا کر دیا اور ان کے روشن کارناموں میں، جو مولانا سید محمد میاں کی کتاب "علمائے حق" اور "علماء کا شاندار ماضی" سے واضح ہوں گے ایک کا اور اضافہ ہوا۔

لکڑی کا صندوق

شیخ الہند نے غالب پاشا اور جمال پاشا کی تحریریں اور دستی ایک صندوق میں بند کیے، اور وہ صندوق اس طرح کا تیار کرایا تھا کہ اس میں اندر خانے ہوئے تھے جس میں وہ کاغذات رکھ دیئے گئے تھے اور وہ خانے باہر سے بالکل دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس صندوق کو لے کر حاجی ہادی حسن صاحب رئیس خان جہانپور ضلع مظفر نگر اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی روانہ ہوئے۔ جب وہ بمبئی پہنچے تو اس خیال سے کہ مولانا اس جہاز میں ہوں گے کثیر پولیس موجود تھی۔ مولانا کے ایک مخلص نے وہ صندوق لے لیا اور سامان کے ساتھ لے کر نکل گئے اور حسب پروگرام بذریعہ پارسل روانہ کر دیا۔ مولانا محمد نبی خان صاحب خان جہانپور نے ان تحریرات کو نکالا اور نقل کر رہے تھے کہ پولیس کا چھاپہ پڑا۔ انگریز کا محکمہ سراغ رسانی بھی کتنا ہوشیار تھا اس نے پتہ لگا لیا تھا کہ چند تحریرات لکڑی کی صندوق میں آئی ہیں۔ مولانا محمد نبی صاحب نے وہ کاغذات ایک صدری میں ٹھونس کر کھونٹی میں ٹانگ دیا۔ چھ گھنٹے کی تلاشی میں پولیس کی نظر اس صدری پر نہیں گئی اور وہ چیز بچ گئی۔ پولیس کو یہ بھی خبر مل گئی تھی کہ حاجی احمد مرزا صاحب فوٹوگرافر کے یہاں ان تحریروں کے فوٹو لیے جائیں گے۔ پولیس نے وہاں بھی چھاپہ مارا لیکن وہاں

تحریریں ابھی نہیں پہنچی تھیں پولیس کے جانے کے بعد وہ تحریریں وہاں پہنچیں ان کے فوٹو لیے گئے اور جہاں جہاں جانا تھا بھیج دی گئیں۔

مولانا حسین احمد مدنی تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا سندھی نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ فوٹو جلا دیئے گئے یہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا مدنی تحریر فرماتے ہیں:

"یہ تحریرات و وثائق بہت کارآمد ثابت ہوتے اور حکومت ترکیہ اور اس کے خلفاء کی پوری طرح امداد کرتے لیکن جب امریکہ کی بے شمار فوجیں اور سامان رسد انگریز اتحادیوں کی مدد کو آگئے اور عربوں نے بغاوت کر دی تو پانسہ پلٹ گیا۔"

جہاز سے اترنے پر مولانا خلیل احمد اور مولانا مرتضیٰ حسن کو گرفتار کر لیا گیا اور طرح طرح سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن یہ مولانا کے مخلصین تھے سر تسلیم پر اور قدم دار پر رکھتے تھے۔ پولیس کچھ حاصل نہ کر سکی اور بعد میں یہ چھوڑ دیئے گئے۔

مولانا کو مکہ معظمہ میں گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیے گئے۔ اس سے قبل ڈاکٹر انصاری اور ان کے بھائی اور حکیم عبدالرزاق نے مولانا کے ایک عزیز کی معرفت ایک ہزار روپیہ مکہ مکرمہ میں مولانا کی خدمت کے لیے بھیجا۔ ان سب باتوں سے اس تحریک کی ہمہ گیری معلوم ہوتی جو مولانا نے چلائی تھی۔

ریشمی رومال

ریشمی رومال کے بارے میں طرح طرح کے افسانے مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ رومال حضرت مولانا محمود حسن صاحب نے اپنی انقلابی جماعت کے مخلصین کارکنوں کو دیئے تھے۔ رومال ایسے بنے تھے کہ اگر دو ایک تار نکال دیے جائیں تو مولانا محمود حسن صاحب کا نام ابھر آتا تھا۔ یہ جماعت کے ممبر بطور نشان کے رکھتا تاکہ ایک دوسرے پر بھروسہ کیا جا سکے اور یہ ان مخصوصین کو دیے گئے تھے جو انگریز کے قتل پر مامور تھے اور ایک خاص دن اور وقت مقرر تھا کہ ان کے درمیان میں سازش ہوگیا وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ کہا گیا بہت سی باتوں پر پردہ پڑا ہوا ہے لیکن ریشمی رومال کی تاریخی حیثیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولانا محمود حسن کی اسکیم کے ماتحت مولانا عبیداللہ سندھی کابل میں مقیم تھے اور قبائل کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے اکسا رہے تھے اور ہندوستان کی انقلابی جماعتوں سے بھی نامہ و پیام رکھے تھے۔ جب انور پاشا اور غالب پاشا کے خطوط لکڑی کے صندوق سے بخیریت مل گئے اور قبائلیوں اور انقلابی جماعتوں اور مسلمانان ہند میں جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے وہ تقسیم ہو گئے تو ان کارروائیوں کی اطلاع مولانا محمود حسن صاحب کو حجاز میں دینا ضروری تھی تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ زمین تیار

ہے۔ اس کے علاوہ کابل میں ایک عارضی حکومت بھی قائم تھی جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ، برکت اللہ وزیر اعظم اور مولانا عبید اللہ سندھی وزیر داخلہ اور دوسرے حسب معمول اراکین تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ہم ہندوستان کے صحیح نمائندے ہیں اور ہندوستان برطانیہ سے باغی ہو چکا ہے۔ اور اگر ہندوستان پر حملہ ہو تو اس کی کامیابی کے روشن امکانات ہیں۔ اس کا مقصد مختلف حکومتوں سے دوستانہ تعلقات قائم کر کے ان کو انگریزوں کے خلاف ایک اتحادی بنانا تھا۔ چنانچہ بڑے آب و تاب سے راجہ مہندر پرتاپ، ڈاکٹر متھرا سنگھ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ زار روس کے پاس وفد بھیجے گئے۔ اسی طرح چین و برما و جاپان و فرانس اور امریکہ بھی مشن روانہ کیے گئے جو اس سے بڑا مشکل کام تھا کہ حکومت موقتہ ہند بالکل تہی دست تھی۔ ان باتوں کی بھی مختصر اً حضرت مولانا کو اطلاع دینی تھی۔

افغانستان سے حجاز کا راستہ بالکل بند تھا۔ اطلاع دینے کے لیے سوائے ہندوستان کے اور کوئی شکل نہ تھی چنانچہ دو خطوط خط کے ذریعے ریشمی کپڑے پر کابل کی کارروائیاں لکھ کر مولانا عبید اللہ صاحب نے شیخ عبدالحق نامی ایک نومسلم کو دیے تو اللہ نواز خاں کے باپ خان بہادر رب نواز خاں کا پروردہ تھا۔ کہ وہ یہ جا کر شیخ عبدالرحیم کو سندھ میں دے دے۔ شیخ عبدالرحیم کو اسی طرح کے تیسرے خط میں ہدایت تھی کہ وہ کسی قابل اعتماد آدمی کے ذریعہ شیخ الہند کے پاس یہ رومال بھجوا دیں اور اگر کوئی نہ ملے تو خود حج کے بہانے چلے جائیں۔ اسی کا نام ریشمی رومال یا ریشمی چٹھی ہے۔

اللہ نواز خاں معتبر آدمی نہ تھا لیکن عبدالحق نے رومال یا چٹھی خان بہادر رب نواز خاں کو دے دی اور انھوں نے یہ خط یا رومال سر مائیکل اوڈوائر گورنر پنجاب کے حوالے کر کے انعامات حاصل کیے۔ اور اسکیم ناکام ہو گئی۔ اس مسئلہ کی مزید بحث ہمارے بحث سے خارج ہے۔

میں نے ایک پیچیدہ معاملہ کو جس میں بہت سے دماغ الجھن میں مبتلا ہیں صاف اور سادہ عبارت میں بلا تفصیلات کا ذکر کیے لکھ دیا۔ البتہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہند کسی نہج پر ریشمی رومالوں کا استعمال کرتے تھے، اور یہیں سے مولانا عبید اللہ صاحب نے اشارہ لیا ہوگا۔

حکومت برطانیہ کے وعدے

2 نومبر 1914ء کو حکومت برطانیہ نے ایک سرکاری اعلان شائع کیا جس کی اشاعت، اعلان جنگ کے ساتھ ہر قصبہ و قریہ میں کی گئی۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین کر لینا چاہیے کہ ہم یا ہمارے اتحادی اس جنگ میں کوئی

ایسی بات نہ کریں گے جس سے ان کے مذہبی جذبات وخیالات کو ٹھیس لگے۔ اسلام کے مقدس مقامات بے حرمتی سے محفوظ رہیں گے اور ان کی عزت وحرمت قائم رکھنے کی ہر ممکن احتیاط برتی جائے گی۔ اسلام کے مقدس دارالخلافہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ ہم صرف ترکی وزراء سے لڑ رہے ہیں جو جرمنی کے زیر اثر کام کر رہے ہیں نہ کہ خلیفۃ المسلمین سے۔ برٹش گورنمنٹ نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ تمام اتحادیوں کی طرف سے بھی ان مواعید کی ذمہ داری لیتی ہے۔

یہ خلیفۃ المسلمین کے اعلان جہاد کا جواب تھا۔ بہت سے سادہ لوح مسلمان اور خاص کر فوج کے سپاہی اور افسران اس کے شکار ہو گئے اور یہ سمجھ لیا کہ یہ ایک ملکی جنگ ہے۔

12 جنوری 1915ء کو لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند نے لیجسلیٹو کونسل میں اقرار فرمایا۔

"اتحادیوں نے جزیرۃ العرب اور عراق کے اماکن مقدسہ کو حملے سے محفوظ رکھنے کے متعلق اعلان کیا ہے اور برٹش گورنمنٹ نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ اگر کوئی ضرورت ہو تو بیرونی حملہ آوروں کے خلاف ان کی حفاظت کرنے کے لیے تیار ہیں اور ان کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچنے دیں گے۔ گو واقعات کا رخ کتنا ہی بدلے مگر اس میں شک نہ ہوگا کہ مقامات مقدسہ کے معاملات میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کی جائے گی اور اسلام دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار ہوگا۔"

اسی طرح لارڈ کرومر نے دارالامراء (ہاؤس آف لارڈس) میں 20 اپریل 1915ء کو حسب ذیل تقریر کی:۔

"مجھ کو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں مارکوئس آف کریو کی اس رائے سے متفق ہوں کہ خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کو خود ہی طے کرنا چاہیے لیکن ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ خلیفہ کے لیے یہی ضروری نہیں ہے کہ وہ صرف مسلمان ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسا مسلمان ہو جو کسی یورپین طاقت کے زیر اثر نہ ہو۔"

وزیر اعظم برطانیہ مسٹر لائڈ جارج نے 5 جنوری 1918ء کو ایک تقریر میں فرمایا:۔

"ہم اس غرض سے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ترکی کو اس کے دارالسلطنت یا ایشیائے کوچک کے زرخیز ممالک سے جہاں ترکی النسل لوگ آباد ہیں، محروم کردیں۔"

یہ سحر طرازیاں اتنی جادوگری تو کر ہی رہی تھیں کہ خلیفۃ المسلمین کے اعلان جہاد سے جو جوش و خروش پیدا ہونے والا تھا وہ مدھم پڑ گیا۔ مسلمان سپاہی اور فوجی افسران محاذ پر چلے گئے جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچی تھی۔ ہندوستان میں صرف دس ہزار فوج رہ گئی تھی۔ اگر افغانستان اور قبائلیوں کا حملہ اس وقت ہندوستان

پر ہو جاتا تو میسو پوٹامیہ سے ہندوستانی فوج کو واپس بلانا پڑتا اور تب تاریخ کا رخ بدل جاتا۔ اس اعلان سے عام طور پر لوگوں کی بیزاری میں بھی کمی آ گئی۔ لیکن ایک طبقہ ان دانایان راز کا بھی تھا جوان طفل تسلیوں میں آنے والا نہ تھا۔ اسلامی انقلابی جماعتیں اپنا کام کر رہی تھیں اور حکومت کا محکمہ سراغرسانی جس میں زیادہ تر مسلمان تھے سرگرم کار تھا جو نوجوان ہندوستان سے بھاگ کر اور چھپ کر افغانستان کا رخ کرتے تھے ان کے بارے میں حکومت کا آرڈر تھا کہ اگر وہ پکڑے جائیں تو جو پہلا درخت نظر آئے اسی پر انہیں پھانسی دے کر لٹکا دیا جائے۔ لیکن فدا کاران ملت رات بھر چلتے دن کو چھپتے، فاقے کرتے، دریاؤں کو تیرتے بھاگے جارہے ہیں۔ ان مجنونانہ کوششوں سے دلوں کے اندرونی جذبات کی گہرائیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا محمد علی کی نظربندی

دانشوران ہند بھی اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے چنانچہ ترکی کے اعلان جنگ کے بعد ہی مولانا محمد علی نے اپنے شہرۂ آفاق انگریزی اخبار کامریڈ میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "چوائس آف دی ٹرکس" یعنی ترکوں کا انتخاب۔ اس میں ثابت کیا گیا تھا کہ ترک اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دینے میں معذور تھے۔ مولانا محمد علی اس وقت مسٹر محمد علی تھے اور ان کا ماضی حکومت سے تعاون کا تھا۔ لیکن ان میں اسلام کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور اس نازک وقت پر ان کے مذہبی جذبات و معتقدات ان کے ماضی پر غالب آ گئے۔

مولانا عبدالماجد دریاآبادی اپنی تصنیف "محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> "کامریڈ کی تو دھوم مچی ہوئی تھی، ہمدرد نکلا تو اس کی بھی دھوم مچ گئی۔ بڑے چھوٹے سب اس کے گرویدہ لیکن محمد علی کا قدم اب روز بروز اسلامیت کی طرف اور زیادہ ہی بڑھتا جارہا تھا۔ مئی 1913ء میں شہر کانپور میں ایک سڑک نکلنے کے سلسلہ میں میونسپلٹی اور کلکٹر نے ایک مسجد کے غسل خانہ کو گرادیا اور اس پر جب مسلمانوں نے اپنے پرجوش احتجاج کا مظاہرہ کیا تو ان کے مجمع پر گولیاں تک چلادی گئیں۔ ہنگامہ برپا ہوا اور اس کے لیڈروں میں محمد علی بھی تھے۔ کامریڈ اپنے احتجاجی اور تنقیدی مضامین میں کلکٹر تو الگ رہے خود صوبہ کے حاکم اعلیٰ سر جیمس مسٹن کی بھی خبر لے ڈالی۔ انگریزوں کی بھی اس وقت مسلمانوں کی زبان سے کسی کڑی نکتہ چینی کے عادی نہ تھے اور پھر سر جیمس مسٹن تو محمد علی کو اپنا پرانا "یار وفادار" سمجھ رہے تھے۔ قدرتاً بہت گھٹے۔ ادھر جنگ بلقان کے سلسلہ میں ترکی کی ہمدردی میں بھی محمد علی پیش پیش تھے

اور اب چہرے پر داڑھی بھی تھی۔

یہ تو سب ہی کو نومبر 1914ء میں یورپ کی جنگ عظیم میں ترکی جرمنی کے خلاف کی حیثیت سے برطانیہ کے خلاف ہوگیا اور کامریڈ نے ایک بڑے لمبے چوڑے زوردار مقالہ میں چوائس آف دی ٹرکس (CHOICE OF THE TURKS) کے زیر عنوان جو ٹائمس (لندن) کے مقالے کے جواب میں تھا لکھا۔ انگریز اب کیسے درگزر سے کام لیتے۔ کامریڈ فوراً بند اور محمد علی نظر بند ہوگئے۔ محمد علی جو کبھی سال دو سال قبل تک بڑے بڑے حکام کی آنکھوں کے تارے اور منظور نظر بنے ہوئے تھے۔"

مولانا محمد علی کے سب سے بڑے مداح اور ہندوستان کے عظیم الشان پرزور دانشور کے قلم سے مندرجہ بالا اقتباس نے مجھے اس بات کی تفصیل سے بے نیاز کر دیا کہ محمد علی کا ماضی حکومت برطانیہ سے وفادارانہ تھا۔ اگر یہ ثابت ہو کہ خلافت مقدسہ کے جذبے نے کتنے انقلابات پیدا کیے۔

مولانا محمد علی پہلے رامپور پھر مہرولی پھر دہلی میں نظر بند کیے گئے۔ وہاں سے لینڈاون پھر چھندواڑہ منتقل کر دیے گئے اور اس پر بھی اکتفا نہ کیا گیا تو بیتول جیل خانہ میں قید کر دیے گئے۔

حکومت شاید یہ سمجھتی تھی کہ مولانا محمد علی ایک ہی دور میں زمین دوز ہو جائیں گے اور معافیوں اور عرضداشتوں اور آئندہ کے لیے توبۂ نصوح پر عمل پیرا ہوں گے لیکن نظر بندی کا حکم مولانا محمد علی نے کس طرح سنا اسے قاضی عبدالغفار صاحب کی زبان سے سنیے جو اس زمانہ کے دیگر فضلائے عصر کی طرح محمد علی کے گرد جمع ہوگئے تھے اور ہمدرد کے رکن ادارت تھے:۔

"خوش وقتی کا یہ عالم تھا کہ جس وقت نظر بندی کا حکم آیا ہے میں دفتر میں نہ تھا بلکہ بلایا گیا اور جب محمد علی کے کمرے کے پاس پہنچا تو میں نے ایک شور مبارک باد سنا اور حیران ہوا کہ شاید کوئی بہت اچھی خبر کہیں سے آئی ہے۔ لیکن دیکھتا ہوں کہ کمرے کے وسط میں میز پر احکام نظر بندی کھلے رکھے ہیں اور ایک غلغلہ تہنیت برپا ہے جس میں دونوں بھائیوں کی آواز جو ایک دوسرے کو ہنس ہنس کر مبارک باد دے رہے ہیں سب سے زیادہ بلند ہے:

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ — عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

مولانا محمد علی کی گرفتاری نے ملک میں ایک ہیجان برپا کر رکھا تھا اور تقریباً ڈیڑھ سو تار وائسرائے اور وزیر ہند کو بھیجے گئے جس میں نظر بندی منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کا انجام اگر کچھ ہوا تو صرف یہ کہ ایک افسر ایک تحریر لے کر آیا اور مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی (جو ایک ساتھ نظر بند تھے) سے کہا گیا کہ

آپ اس پر دستخط کر دیں تو رہا کر دیے جائیں۔ اس تحریر میں صرف برطانیہ کی وفاداری کا اعلان تھا۔ علی برادران نے کہا کہ اگر اس میں اتنا اور اضافہ کر دیا جائے تو ہم دستخط کرنے کے لیے تیار ہیں "بشرطیکہ یہ وفاداری احکام مذہب اسلام کی پابندی میں حائل نہ ہو۔ کیونکہ ہماری اول وفاداری مذہب اسلام ہے۔ ابھی گفتگو ہو رہی تھی کہ علی برادران کی والدہ جو بعد کو "بی اماں" کے نام سے مشہور ہوئیں نکل کر آگئیں کہ ہمارے لڑکے کبھی حکومت سے باغی نہ تھے لیکن اسلامی فریضہ اوّلیت رکھتا ہے اور اگر وہ اس بلاشرط معاہدہ پر دستخط کر دیں گے تو اللہ تعالیٰ میرے جھرّیوں بھرے ہاتھوں میں طاقت دے گا کہ میں ان دونوں کا گلا گھونٹ دوں۔ محمد علی پہلے ہی چوائس آف دی ٹرکس لکھ کر اور نظر بندی کو خوشی خوشی قبول کر کے جس میں ایک بڑی قربانی ان کو دینی پڑی تھی ہندوستان کے مسلمانوں کے ہیرو بن چکے تھے۔ اس نکارنے ان کی مقبولیت و شہرت میں چار چاند لگا دیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

ادھر ایک اور ستارہ آسمان سیاست پر طلوع ہو چکا تھا جس کی تیز روشنی تمام دیگر روشنیوں کے بالمقابل آگئی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کم عمری میں اپنے علم و فضیلت کی وجہ سے اکابرین کی صف میں آگئے 1912ء میں آپ کے اخبار الہلال نے تمام ہندوستان میں ہنگامہ بجا دیا۔ الہلال آزادی پسند اور اسلام کا مبلغ تھا۔ مولانا اپنی خود نوشت سوانح عمری "انڈیا ونس فریڈم" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"الہلال کا پہلا پرچہ جون 1912ء میں نکلا۔ الہلال نے دو وقت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اور بہت جلد اس نے بے مثال مقبولیت حاصل کر لی۔ بے شک صرف اس کی خوب صورت کتابت و طباعت ہی سے اس کی جانب رغبت نہیں ہوئی بلکہ اس سے بھی زیادہ اس بات سے کہ اس نے مستحکم وطن پروری کی تعمیر رائے عامہ میں ایک نئی لہر پیدا ہو گیا۔ الہلال کا مطالبہ اتنا زیادہ تھا کہ صرف تین ماہ کے اندر اندر ہمارے پرچوں کو پھر سے چھاپنا پڑا کیونکہ ہر نیا خریدار شروع سے کل پرچے طلب کرتا تھا۔

"مسلم سیاست کی قیادت اس زمانہ میں علی گڑھ پارٹی کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ارکان اپنے آپ کو سرسید کی پالیسیوں کے امین سمجھتے تھے۔ ان کا بنیادی اصول یہ تھا کہ مسلمان تاج برطانیہ کے وفادار رہیں اور تحریک آزادی سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھیں۔ جب الہلال نے اس سے مختلف آواز بلند کی اور اس کی مقبولیت اور اس کی اشاعت روز بروز ترقی کرنے لگی تو ان لوگوں نے اپنی قیادت کو خطرے میں محسوس کیا۔ اس لیے الہلال کی مخالفت شروع

کردی۔ حتیٰ کہ اس کے مدیر مسئول (مولانا آزاد خود) کو قتل کر دینے کی دھمکی دی لیکن جس
قدر یہ قیادت اسلام کی مخالفت کرتی تھی اسی قدر اس کی مقبولیت بڑھتی تھی۔ دو سال کے
اندر الہلال کی اشاعت 26 ہزار ہوگئی۔ یہ تعداد اردو صحافت میں اس وقت تک کبھی سنی
نہیں گئی تھی:

اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ مولانا کو بہت سے خطوط ملے کہ اگر آپ لکھنؤ آئے تو
جان سے مار ڈالے جائیں گے۔ مولانا لکھنؤ آئے اور اس کے بعد لکھتے ہیں "میں تنہا چار باغ اسٹیشن پر اترا
اور حملہ آوروں کا منتظر رکر تارہا مگر کوئی نظر نہیں آیا افسوس ہماری قوم میں اب ایسا بھی کوئی نہیں جو کسی کی
آبرو رکھے"

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ الہلال 1912ء میں نکلا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں نے خلافت مرکزیہ
اسلامیہ کو نوجوان ترکوں کے عزم و ارادے، ہمت و شجاعت سے سنبھلتے دیکھنے کا خواب دیکھا تھا اور جنگ
بلقان سے وہ سخت اضطراب و تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ علامہ شبلی نے مسلمانوں کے دل کی آواز کو اس
شعر میں بھر دیا ہے ؎

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

الہلال نے اپنے اوعاو تکلم پر جوش اظہار بیان اور ایک نئی جاذب اسلوب تحریر کے ذریعہ ان
جذبات کو جو دلوں کے گوشوں میں چھپے ہوئے تھے جرأت و بے باکی کی پوری طاقت سے ترجمانی کر کے حق قیادت
ادا کیا اور ان کا مقبول ہونا لازمی تھا کیونکہ یہ تو نبی کے دل کی آواز تھی۔ علی گڑھ تحریک کے قائدین کے پاس
اسلام کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کے لیے کوئی تدبیر نہ تھی۔ اس کے علاوہ الہلال کا لب و لہجہ خصوصیت سے
جاذب تھا۔

"میں وہ صور کہاں سے لاؤں جو خفتگان خواب غفلت کو بیدار کر دے۔"

الہلال واقعی صور اسرافیل تھا جس نے موت کی نیند سونے والوں کو بھی چونکا دیا۔ انگریز الہلال کو
ایک باغی رسالہ تصور کرتا تھا اور وہ اس میں حق بجانب تھا چنانچہ اس نے دس ہزار کی ضمانت مانگی۔ جس
وقت یہ ضمانت مانگی گئی ہندوستان میں تہلکہ مچ گیا۔ تار پر تار مولانا آزاد کو روپے کے لیے ملتے تھے۔ اگر
وہ لینے پر راضی ہوتے تو لاکھوں روپیہ جمع ہو جاتا مگر مولانا آزاد نے سب کو جواب دے دیا اور الہلال میں
لکھا کہ الہلال ان کا اخبار ہے اس کا منافع ان کو ملتا ہے تو اس کا خسارہ بھی انھیں کو برداشت کرنا چاہیے
ضمانت دی گئی اور جلد ہی ضبط کر لی گئی۔ دوبارہ بیس ہزار کی ضمانت طلب ہوئی اور وہ بھی دی گئی اور

وہ بھی بعدہٗ ضبط کرلی گئی۔ اور یہ کل روپیہ مولانا نے دیا۔

مولانا آزاد پہلے ایک انقلابی جماعت کے رکن تھے۔ انڈیا ونس فریڈم میں لکھتے ہیں:۔

"ان ایام میں انقلابی گروہ کے ممبر صرف متوسط طبقہ کے ہندو تھے۔ درحقیقت کل انقلابی جماعتیں مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں کو ہندوستان کی تحریک آزادی کے خلاف استعمال کر رہی ہے اور مسلمان گورنمنٹ کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہیں۔ مشرقی بنگال ایک علیحدہ صوبہ بن گیا تھا۔ اور اس کے لیفٹیننٹ گورنر بمفیلڈ فلر نے علانیہ کہا تھا کہ گورنمنٹ مسلمانوں کو اپنی محبوب زوجہ تصور کرتی ہے۔ انقلابیوں کا خیال تھا کہ مسلمان آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور دوسری رکاوٹوں کی طرح اس رکاوٹ کو بھی دور کرنا ہوگا۔"

مولانا آزاد حکومت کی آنکھوں میں کھٹک رہے تھے۔ ان پر ہر وقت ایک سی آئی ڈی لگا رہتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ مولانا جس کو ایک مرتبہ دیکھ لیں پھر کبھی دیکھیں خواہ کتنی مدت بعد فوراً پہچان لیتے تھے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی ذکر آزاد میں لکھتے ہیں کہ ان کو آٹھ سال بعد دیکھا اور فوراً پہچان لیا۔ میرے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا مجھے اول مرتبہ بریڈ لا ہال لاہور میں دیکھا اور پھر 4۔5 سال کے بعد جب میں اول مرتبہ دلی سٹیشن پر محمد علی قصوری کے ساتھ ملا تو فوراً کہا "کہیے عدیل صاحب مزاج تو اچھے ہیں" اسی حافظ کا نتیجہ تھا کہ وہ کتابوں کی عبارتیں صفحہ وسطر کے حوالے بلا کتاب سامنے رکھے نقل کر دیتے تھے اور کبھی ایک شوشہ بھی غلط نہیں ہوا چنانچہ روایت ہے کہ اسی حافظ کی وجہ سے اکثر یہ ہوتا تھا کہ مولانا ٹرین میں جا رہے ہیں سخت سردی ہے۔ ایک فقیر کانپتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے اللہ کی راہ پر فقیر کو ایک پیسہ دے دیا جائے تو فوراً فرماتے ہیں "خان بہادر فلاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ آئیے جائے پیجیے" وہ رخصت ہوئے تو دوسرے یا تیسرے اسٹیشن پر ایک اور آیا اور اس نے کہا بھگوان کے نام پر ایک پیسہ دے دیا جائے۔ پھر مولانا بولے "رائے بہادر فلاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی تشریف لائیے بیٹھیے کیوں پریشان ہوتے ہیں"

الہلال کے مضامین اور مولانا کی انقلابی روش کا ایسا غلغلہ تھا کہ ضلع بستی میں ایک انگریز کلکٹر آر پی ڈیوہرسٹ تھا جو مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کا شاگرد اور عربی و فارسی کا ایک بڑا عالم تھا۔ وہ یہیں سے "الہلال" کا ترجمہ انگریزی میں کر کے انڈیا گورنمنٹ کو بھیجتا تھا۔ ڈیوہرسٹ کے زمانے کے عجیب واقعات لوگ بیان کرتے ہیں۔ وہ کسی وکیل کو انگریزی میں بحث کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا بلکہ اردو میں بحث کرنے پر اصرار کرتا تھا۔ ایک صاحب سے ایک مرتبہ پوچھا ان کا کیا نام ہے انھوں نے کہا نصرت علی اس نے فوراً درست کیا

نصرت علی۔ انھوں نے کہا غلطی ہوئی۔ پھر اس نے کہا غلطی ہوئی۔

۱۹۱۴ء میں لڑائی شروع ہونے کے بعد گورنمنٹ نے پریس ایکٹ کا استعمال کرکے الہلال پریس کو 1915ء میں ضبط کرلیا مگر مولانا کی جانبازی میں فرق نہ آیا اور نہ ان کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی۔ اور مولانا نے پانچ ماہ بعد ایک دوسرا پریس "بلاغ" قائم کیا اور "الہلال" کو اسی پریس سے پھر جاری کیا۔ الہلال کلکتہ سے نکلتا تھا اور وہیں الہلال پریس تھا۔ اور وہیں البلاغ پریس قائم ہوا تھا۔ حکومت کسی حال میں الہلال کو زمانہ جنگ جاری رہنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ اور مولانا کے استقامت اور قوت مقابلہ سے یہ واضح ہوگیا تھا کہ اب صرف پریس ایکٹ سے کام نہ چلے گا اس لیے ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشن کا استعمال کرکے مولانا کو کلکتہ سے جلاوطن کردیا گیا۔ پنجاب، دلّی، یوپی اور بمبئی کی حکومتیں اسی ریگولیشن کے ماتحت ان صوبوں میں مولانا کا داخلہ پہلے ہی ممنوع قرار دے چکی تھیں۔ صرف بہار باقی تھا لہٰذا مولانا رانچی چلے گئے چھ ماہ بعد رانچی میں نظر بند کردیے گئے اور وہیں 31 دسمبر 1919ء تک نظر بند رہے۔ یکم جنوری 1920ء کو شاہی فرمان کے تحت مولانا دوسرے قیدیوں اور نظر بند اشخاص کے ساتھ رہا ہوئے۔ یہ ایک دانشور مرد مجاہد اور اسلامی علوم کے ایک عظیم ماہر کی سرفروشانہ جدوجہد کے زرّیں کارناموں کا ایک مختصر باب ہے۔

مولانا نے ایک جماعت "حزب اللہ" بھی بنائی تھی۔ مولانا کا منشا یہ تھا کہ مذہب کے راستے مسلمانوں کو سیاست میں لایا جائے۔ اس طرح کی ایک کوشش مولانا نے اور کی جس کا ذکر بعد کو آئے گا۔ جماعت حزب اللہ نے صرف ابتدائی منزلیں طے کی تھیں۔ داروگیر کا وہ سلسلہ جاری ہوا کہ حزب اللہ کا کوئی عملی ریکارڈ نہ بن سکا۔ میں نے لکھا ہے کہ مولانا کا خیال تھا کہ مذہب کے راستے مسلمانوں کو سیاست میں لایا جائے۔ صحیح بات یہ ہے کہ سیاست مولانا کے نزدیک مذہب کا ایک جزو تھی اور ان کا عقیدہ شروع سے برطانیہ کی غلامی سے نکل کر ایک متحدہ قومیت کی بنا پر جمہوریت ہندوستان میں قائم کرنا تھا۔ اسی لیے وہ نہایت دلیری اور اپنے روایتی حسین و پرجوش انداز سخن کے ساتھ علی گڑھ تحریک کی مخالفت کرتے تھے۔ مولانا یک عشر دقیقے کے لیے بھی علی گڑھ تحریک کے موافق نہ ہوسکے اور پوری سرگرمی سے اس کے نقائص اور مہلک اثرات مسلمانوں پر ظاہر کرتے تھے۔

عارضی صلح یا التوائے جنگ

آپ نے مدبرینِ برطانیہ اور حکومتِ برطانیہ کے اعلانات ملاحظہ کیے اب دیکھیے کہ انھوں نے جنگ میں کامیابی کے بعد کن شرائط کو عائد و نافذ کیا۔

30 اکتوبر 1918ء کو رؤف بے وزیر بحریہ اور برطانوی امیر البحر کالتھراپ کے دستخطوں سے حسب ذیل شرائط طے ہوئے:۔

(1) درہ دانیال اور باسفورس اور اس کے علاوہ وہ قلعے جو ان پر ہیں سب کو خالی کر کے اتحادیوں کے حوالے کر دیے جائیں۔

(2) کل فوج غیر مسلح کر دی جائے۔

(3) تمام جہازات اتحادیوں کے حوالے کر دیے جائیں۔

(4) اتحادیوں کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ کوئی خطرہ محسوس ہو تو جو بھی مقامات وہ چاہیں ان پر قبضہ کر لیں۔

(5) ترکی ریلوں کا انتظام اتحادیوں کے ہاتھ میں رہے گا۔

(6) تمام ترکی بندرگاہ اتحادیوں کے لیے کھول دیے جائیں گے۔

(7) تمام تار کی لائنیں اتحادیوں کے اقتدار میں دے دی جائیں گی۔

(8) ترکی افواج کے جو لوگ گرفتار ہو گئے ہیں وہ سب قید رہیں گے۔

(9) ترکی افواج جو جہاں جہاں ہیں ان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا جائے گا۔

(10) اتحادی فوجوں کے جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں وہ فوراً رہا کر دیے جائیں گے۔

ایسی ذلت خیز شرائط شاید ہی کسی فاتح نے کسی مفتوح پر عائد کی ہوں۔ جرمنی سے جن شرائط پر التوائے جنگ کا مسودہ تیار کیا گیا تھا وہ بالکل مختلف تھا۔ اب کل اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے کر قسطنطنیہ پر انگریزوں نے قبضہ کر کے اور ترکان احرار کے سربرآوردہ لوگوں کی تلاش ہوئی کہ ملیں تو فوراً تہ تیغ کر دیے جائیں۔ وزیر اعظم طلعت پاشا، وزیر حرب انور پاشا، وزیر بحریہ جمال پاشا وغیرہ یورپ بھاگ گئے اور جو رہ گئے تو انڈرگراؤنڈ ہو گئے۔ ان کی عجیب داستان ہے کہ کس طرح وہ لوگ اپنے کو محفوظ رکھنے کے لیے بھیس بدلتے اور مختلف قسم کی تدبیریں کرتے تھے۔ خلیفۃ المسلمین عبدالحمید خان نے طوق غلامی اپنے گلے میں ڈال لیا اور یہ آس لگائی کہ ان کی پنشن مقرر ہو جائے گی اور وہ زیر سایہ دولت برطانیہ آرام و آسائش کی زندگی گزاریں گے۔ مفتی اعظم اور علمائے اسلام بھی احساس کمتری کے شکار ہو گئے۔

عارضی صلح کی شرائط سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اب ان کو اندازہ ہوا کہ مستقل صلح جب ہوگی تو نہ ترکی باقی رہے گا، نہ خلیفۃ المسلمین، نہ اماکن مقدسہ، نہ فلسطین، نہ بیت المقدس۔ بدحواسی اور بے چارگی میں مسلمانوں نے جلسے اور تجاویز کا انبار لگا دیا۔ غرض یہ تھی کہ حکومت برطانیہ دب کر وہ سب کچھ نہ کرے جس کا اندیشہ تھا۔

راہ عمل کی تلاش

30 اکتوبر 1918ء کو ترکی نے التوائے جنگ کے صلح نامہ پر دستخط کیے اور مئی 1920ء میں سیورے کے مقام پر اتحادیوں نے شرائط صلح ترکی پر نافذ کیے۔ یہ وقفہ انتہائی پر آشوب تھا۔ خیالات میں ہیجان تھا۔ راہ عمل کی تلاش تھی۔ ایک طرف حکومت برطانیہ کے ذمہ داروں نے مسلمانان عالم سے خلافت مرکزیہ اسلامیہ اور اماکن مقدسہ کے قیام کا وعدہ کر رکھا تھا۔ دوسری جانب صیہونی جماعت سے ان کو فلسطین میں وطن دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ان دو متضاد وعدوں کا نبھانا آسان نہ تھا۔ اس لیے ایک رائل کمیشن مقرر کیا گیا۔ رائل کمیشن نے اپنی رپورٹ میں ان دونوں کا تذکرہ کر کے لکھا کہ ہم نے دو متضاد وعدے کیے اور ہم کو ایک وعدے سے منحرف ہونے اور وعدہ خلافی کے مجرم بننے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ دوسری طرف اس نے لڑائی میں شرکت کے بدلے کانگریس سے ہندوستان کو اصلاحات دینے کا وعدہ کر لیا تھا جس کی ایک اعلیٰ طاقتی کمیٹی لندن میں جانچ کر رہی تھی۔ ہندوستان کو ذمہ دار حکومت دینے کا وعدہ مسٹر مانٹیگو نے بذریعہ اعلان شاہی مورخہ 18 اگست 1917ء کو کیا تھا اور چند ماہ بعد خود ہندوستان آکر وائسرائے کے ساتھ تمام ہندوستان کا دورہ کیا تھا، کہ پبلک کے خیالات معلوم ہوں۔ معتدلین انگلستان وفد لے کر گئے اور اپنے نقطۂ نگاہ کو پیش کر رہے تھے۔ اس میں یہ بھی سوال تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کیا ہوں۔ کیا سندھ کو الگ صوبہ بنایا جائے کیا سرحد کو بھی اصلاحات دیے جائیں؟

1916ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتہ ہو کر ایک باہمی معاہدہ مرتب ہوا تھا جس کا نام تاریخ میں میثاق لکھنؤ ہے۔ اس میں حسب ذیل باتیں طے ہوئی تھیں:۔

(1) صوبائی کونسل کے متعلق طے ہوا تھا کہ بڑے صوبوں میں 125 ممبروں کی اور چھوٹے صوبوں میں 50 سے 75 ممبروں تک کی کونسلیں ہوں۔

(2) 4/5 حصہ ممبروں کا انتخاب کے ذریعہ ہو۔ حق رائے دہندگی میں توسیع ہو۔ ہر اقلیت کے انتخاب کے لیے معقول انتظام ہو 1/5 کے نامزد کرنے کا اختیار گورنر کو ہو۔

(3) مسلمانوں کی نمائندگی خاص نشستوں کے ذریعہ ہو جس کی صوبہ وار تفصیل یہ تھی۔

نام صوبہ	فیصد آبادی	کونسل میں مسلمان ممبروں کی فیصدی تعداد
پنجاب	55	50
بنگال	53	40
یوپی	14	30
بمبئی (سندھ)	20	33
بہار و اڑیسہ	10	25
صوبہ متوسط (سی پی)	4	15
مدراس	7	15

جس وقت یہ میثاق ملی مرتب ہوا تو مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد نظر بند تھے مسٹر جناح مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اس میثاق سے نہ مسلمان مطمئن ہوئے نہ ہندو۔ مسلمان کو اعتراض یہ تھا کہ اکثریتی صوبوں کو اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور ہندو اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کی مخصوص نشستوں کو ناپسند کرتے تھے۔ مورخین اور ماہرین سیاست کا فیصلہ ہے کہ کانگریس نے اس پر رضامندی دے کر بہت بڑی غلطی کی کیونکہ اس میں جداگانہ انتخاب کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اسی بنیاد پر آئندہ پاکستان کا محل تعمیر ہوا۔ یہ میثاق بھی راستہ کا ایک روڑا تھا۔ اس کی وجہ سے ہندو اور مسلمان کی نظر حصول آزادی سے ہٹ کر حصے بخرے پر لگ جاتی تھی اور اختلاف رونما ہوتا تھا۔

مسلمانان ہند کے سامنے جزیرۃ العرب فلسطین اور بیت المقدس ہی کے مسائل نہ تھے۔ خلافت مرکزیہ اسلامیہ ترکی کا قیام مذہبی حیثیت سے اولیت رکھتا تھا، وہ مدینہ اور بیت المقدس کو خلیفہ کے اقتدار سے باہر دیکھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انگریز نے ہندوستان کو اصلاحات دینے کا جو وعدہ کیا تھا وہ تو لندن میں زیر تحقیقات تھا اور یہاں 18 جنوری 1919ء کو رولٹ بل شائع ہوا۔ جس پر رولٹ کمیٹی 1917ء سے کام کر رہی تھی اور جس کے مسودے سے سب کو اختلاف تھا۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ تمام ہندوستان میں آگ لگ گئی۔ سب لوگ سمجھ گئے کہ سارا انوغا بیکار ہے اب رولٹ ایکٹ بن کر رہے گا۔ بجز گنے چنے کاسہ لیسان حکومت کے پوری قوم نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ کل سیاسی جماعتیں اور لیڈران ایک رائے ہو گئے۔ اس بل کا منشا ہندوستانیوں کو ہر قسم کی آزادی سے محروم کرنا اور انھیں غلام بنانا تھا۔ لوگ سوچتے تھے کہاں شاہی اعلان 1917ء اور کہاں یہ بل ہے۔

مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف آواز اٹھانے کا نادر موقع پایا اور ہندو بھائیوں سے مل گئے۔

ہندو مسلم اتحاد کا دل افروز نظارہ سامنے ناچنے لگا نتیجہ یہ ہو کر پورا ہندوستان کوہِ آتش فشاں بن گیا جو آگ اگل رہا تھا۔ رولٹ بل پر تو زبردست شورش تیزی سے بڑھ رہی تھی لیکن مسلمان سر سے کفن باندھ کر میدان میں نکل آیا تھا چنانچہ جگہ جگہ علماء کے جلسے ہو رہے تھے۔ ہر صوبہ میں علماء کی کانفرنسیں ہوئیں۔ علمائے کرام سیاسی جماعتوں میں بھی شریک ہونے لگے جو ایک نئی بات تھی۔ مثال کے طور پر جنوری 1919ء میں علماء بنگال کا دوسرا سالانہ جلسہ مولانا آزاد سبحانی صاحب پرنسپل مدرسہ الٰہیات کانپور کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں علاوہ دیگر اکابرین کے مولانا عبدالباری صاحب نے بھی شرکت فرمائی جو اس وقت صدر علمائے ہند تصور کیے جاتے تھے۔ اسی سال علمائے کرام نے مسلم لیگ کے جلسہ میں بھی شرکت کی جس کے لیے مسلم لیگ نے اپنی ایک تجویز میں علماء کرام کا شکریہ ادا کیا۔ مسلمان سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے آمادہ تھا۔ کوئی شہر یا قریہ ایسا نہ تھا جہاں جلسے نہ ہوئے ہوں اور مسلمانوں نے اپنے اضطراب کا اظہار نہ کیا ہو۔

مسز بسنٹ اور ہوم رول

یکم ستمبر 1916ء سے مسز اینی بسنٹ (جو ایک انگریز خاتون ہندوستان کی حمایت کی دعویدار تھیں) کی قیادت میں ہوم رول لیگ نے اپنا کام شروع کیا۔ اس کا مقصد بھی آئینی ایجی ٹیشن سے ہندوستان کے لیے حکومت خود اختیاری حاصل کرنا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میدان جنگ میں ہندوستان نے انگریز کا ساتھ دیا ہے بلکہ اس لیے کہ یہ اس کا حق ہے اور انصاف کا تقاضہ ہے لیکن مسز بسنٹ کی تحریک کا منشاء اب معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کامل سے محض توجہ ہٹانا تھا۔ وہ ہندو مذہب سے بھی ہمدردی کا دعویٰ کرتی تھیں۔ لیکن جب ہندوستان نے واقعی انگڑائی لی اور منزل آزادی کی جانب قدم اٹھایا تو وہ مخالف ہوگئیں۔ چنانچہ جب جب مہاتما گاندھی کی تحریک ترک موالات کا زور ہوا اور طلباء کالجوں سے نکلنے لگے تو الٰہ آباد کے مقام پر طلباء اور پبلک کے سامنے تقریر کرتے ہوئے مسز بسنٹ نے جو ایک بڑی مقرر تھیں خطابت کی پوری طاقت سے سوال کیا "ہندو مذہب نے کب یہ جائز رکھا ہے کہ بیٹا باپ کی حکم عدولی کرے۔ یا کوئی مثال ہے کہ کسی بیٹے نے باپ کے حکم کے خلاف کیا ہو" میور سنٹرل کالج الٰہ آباد کا ایک لڑکا کھڑا ہوا۔ تقریر انگریزی میں ہو رہی تھی۔ اس نے بھی انگریزی میں گرج کر کہا "پرہلاد نے اپنے باپ کے حکم کی خلاف ورزی کی" مسز بسنٹ مبہوت رہ گئیں اور بیٹھ گئیں۔

اس سے پہلے لوکمانیہ تلک یہ نعرہ دے چکے تھے کہ سوراجیہ ہمارا پیدائشی حق ہے اور یہ کہہ چکے تھے کہ سوراجیہ ہم ہر ممکن ذریعہ سے حاصل کریں گے۔ اسی زمانہ میں تلک کا مقدمہ لندن میں چل رہا تھا جس پر کثیر مصارف

مجبور ہو رہے تھے۔ مولانا حسرت موہانی تلک کے چیلے اور ان کے بڑے معتقد تھے۔ تلک کے بارے میں حسرت موہانی نے کہا تھا ۔

اے تلک اے افتخار جذبۂ حب وطن — حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن
سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فخر قوم — خدمت ملک و وطن میں محنت رنج و محن

یہ طرح طرح کے اضطراب یہ قسم قسم کی بےچینیاں ہمہ گیر تھیں۔ دل کا چین اور دماغ کا سکون غائب ہو چکا تھا اور مسائل کے حل کی تلاش تھی خواہ کتنی قربانی دینی پڑے۔ لیکن کوئی راہ عمل سامنے نہ تھی۔

لیڈر کی آمد

الغرض مادرِ ہند کو دردِ زہ تھا اور ملک آزادی کا بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ ایک دایہ کی ضرورت تھی عوام و خواص تیار تھے۔ ایک لیڈر درکار تھا جو سب کے دلوں میں ترجمان ہو جس کا ہاتھ سب کی نبض پر ہو جو حالات کو پہچان سکے اور صحیح تیاری اور سنجیدہ و قابل عمل پروگرام مرتب کرے جس کا دماغ روشن اور جس کا دل صاف ہو اور جس پر پوری قوم بھروسہ کر سکے۔ چنانچہ اس وقت موہن داس کرم چند گاندھی مطلع ہندوستان پر آفتاب و ماہتاب بن کر طلوع ہوئے اور بہت جلد دوسرے لیڈروں کا ستارہ غروب ہو گیا اور سب نے ان کے آگے سر خم کر دیا۔ یہ وہی مہاتما گاندھی ہیں جن کے بارے میں ایک لطیفہ بستی کے ایک ڈپٹی کلکٹر، جو بعد کو کمشنر ہوئے مسٹر یادو نے مجھے سنایا انھوں نے کہا کہ لندن گیا تھا وہ ایک گھر میں۔ مدعو و مہمان تھا۔ ایک درجن سب لوگ آپ کے گرد بیٹھے تھے کہ ایک چھ سات سال کے بچے نے اپنی ماں سے کہا کہ "مدر کیا میں آپ سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں" ماں نے منع کیا اور کہا کہ چپ وہ سوال میرے کان میں کہہ دو۔ مگر یادو صاحب نے لجاجت سے کہا کہ بچے کو پوچھ لینے دیجیے۔ تھوڑی بے تکلف گفتگو کے بعد لڑکے نے جو سوال کیا وہ یہ تھا "کس قسم کا طاعون گاندھی ہے" یادو نے کہا کہ گاندھی طاعون نہیں ہے ایک انسان کا نام ہے۔ تو لڑکا تعجب سے کود پڑا اور حیرت سے منہ پھیلا کر بولا "کیا؟ گاندھی ایک انسان ہے میں نے تو سمجھا تھا کوئی طاعون ہے۔"

مہاتما گاندھی واقعی غلامی کے لیے طاعون تھے۔ انگریز کے غرور و تکبر، دجل ساری و وعدہ خلافی کے لیے طاعون تھے۔

مہاتما گاندھی نے مسئلہ خلافت سے دلچسپی ظاہر کی اور نہ صرف دلچسپی ظاہر کی بلکہ اس میں شرکت کا وعدہ کیا اور نہ صرف شرکت کا وعدہ کیا بلکہ اس میں کود پڑے اور بہت جلد مسلمانوں نے اور مسلمانوں کے تمام لیڈروں نے ان کو اپنا لیڈر مان لیا۔

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تو ان کو "باپو" کہتے تھے۔ اور کراچی کے مقدمہ میں سزا پانے کے بعد جب وہ رہا ہوئے تو لوگوں نے پوچھا کہ تحریک کا کیا حال ہے تو انھوں نے کہا میں تو جیل میں ہوں، البتہ میں یہ جانتا ہوں کہ رسول کے بعد میرے اوپر گاندھی جی کا حکم نافذ ہے۔ مولانا آزاد سبحانی گاندھی جی کے آشرم میں چلے گئے تھے اور ایک لباس پہن لیا تھا جو صرف گھٹنا اور کفنی بند تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد قولاً اور عملاً گاندھی جی کے ہمنوا تھے۔ حضرت شیخ الہند کا بہت جلد انتقال ہو گیا اور اب مسلم قیادت کو کوئی سنبھالنے والا نہ تھا۔۔۔۔ احمد آباد کانگریس کے موقع پر مولانا عزیز گل (رفیق حضرت شیخ الہند) نے ایک مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے، جس میں میں خود موجود تھا کہا:۔

> "ہم نے گاندھی کو اپنا رہنما مان لیا ہے۔ آگے جانے کو کہے گا تو آگے جائیں گے۔ پیچھے ہٹنے کو کہے گا تو پیچھے ہٹیں گے۔ لیکن گاندھی کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم مسلمان اپنے خلیفہ کو بھی نہیں مانتے، جب وہ راہ حق سے تجاوز کرتا ہے۔ گاندھی جب تک راہ حق پر رہے گا ہمارا رہنما ہے۔"

مگر یہ سب بعد کی باتیں ہیں 30 اکتوبر 1918ء سے مئی 1920ء تک کا زمانہ روحی و قلبی اضطراب، بے پناہ جوش اور ہر طرح کی قربانی کی تیاری اور راہ عمل کی سرگرم تلاش کا زمانہ تھا۔

یہاں اگر حسرت موہانی کا ذکر نہ کیا جائے تو ناانصافی ہوگی۔ مولانا حسرت موہانی ہمیشہ گاندھی جی سے کتراتے رہے۔ تلک کے شاگرد ہونے کی وجہ سے ان کا نقطۂ خیال بالکل مختلف تھا۔ مولانا حسرت موہانی پکے سیاسی آدمی تھے اور ان کا نظریہ آزادی کامل بیرون حکومت برطانیہ تھا۔ اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی گوکھلے کے شاگرد ہونے کی وجہ سے معتدل خیالات رکھتے ہیں اور آخر کار حکومت سے ڈومینین اسٹیٹس (یعنی زیر سایہ برطانیہ) پر صلح کر لیں گے۔ لیکن حسرت کا ذکر مفصل بعد کو کیے گا۔ اس زمانہ کی تاریخ میں کوئی جگہ حسرت کے ذکر سے خالی کیسے رہ سکتی ہے۔ لیکن اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ اختلاف کرتے ہوئے وہ ہر تحریک میں گاندھی جی کے ساتھ رہے۔ اب چارہ ہی کیا تھا۔

اسی طرح اس دور میں ایک عظیم انسان تھا جس کی بے لوث عظیم خدمات، جس کی دیدہ وری موہ جہاں ہیں جس کی فدائیت اور ستائش و صلہ کی آرزو سے بے نیازی جس کی بلند فکری اور خاموش فداکاریاں اوراق تاریخ پر بکھری پڑی ہیں۔ یہ تھے ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ ڈاکٹر انصاری کے کارنامے جابجا بکھرے ہوئے ملیں گے جن کا جوڑنا اور مرتب کرنا بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے لیکن مطالعہ بتلاتا ہے کہ ان کے دل میں جذبات حق کی گہرائیاں کیا تھیں اور کس طرح ہر نازک وقت پر انھوں نے دلیری اور ہوش مندی

سے قوم کی رہنمائی اور تحریک خلافت اور تحریک آزادی کی خدمت کی ہے۔

رولٹ بل

اسی وقت انگریزوں نے فتح کے غرور اور طاقت کے نشہ میں رولٹ بل پاس کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہندوستان کا حال یہ تھا کہ مسلمان جماعت کے لوگ رہنما بننے کے لیے لندن وفد لے گئے تھے وہاں بھی کام کر رہے تھے اور یہاں بھی۔ اور فرمان شاہی پر تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ مسز اینی بسنٹ ہوم رول کا پرچار کر رہی تھیں ان کے ساتھ اچھے اچھے لیڈر ہو گئے تھے جن میں گوکھلے کے متبع بھی تھے۔ رولٹ بل کے خلاف برابر ایجی ٹیشن جاری تھا۔ رولٹ بل مرتب ہوا اور نافذ ہو رہا تھا۔ مسلمان اخبار نگار نظربند ہوتے رہتے تھے اور مسلمانوں نے اب تک صرف یہ کام کیا تھا کہ مسئلہ خلافت پر پوری طرح متحد ہو گیا تھا اور اپنی آواز بلند کر رہا تھا۔ انگریز ان تمام باتوں سے بے پرواہ اپنی طاقت اور فتح کے غرور کے نشہ میں چور تھا اس لیے اس نے تمام قومی حقوق سے بے نیاز ہو کر رولٹ بل کے بارے میں کارروائی نہیں روکی بلکہ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے ایک تقریر میں اس بل کی مدافعت میں ایسی باتیں کہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بل ضرور ایکٹ کی شکل اختیار کرے گا۔ گویا کہ انگریزی شامت آئی ہوئی تھی وہ اپنے دوستوں سے کام لے رہی تھی لیکن سب نے مخالفت کے باوجود رولٹ بل مرتب کر کے شائع کر دیا اور اس رولٹ بل کے مقابلے کے لیے گاندھی جی میدان میں آ گئے۔ انھوں نے ستیہ گرہ سبھا قائم کی اور اس پر بہت سے لوگوں کے دستخط لیے تو بہت سے لیڈر ٹوٹ پڑے جنھوں نے اس پر دستخط کر دیے اور بہت سے لوگ دستخط کرنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ وہ تھا گاندھی جی یعنی عدم تشدد یعنی ستیہ گرہ کا آغاز یہ عدم تشدد تھا جو گاندھی جی نے بتایا اور انھوں نے آزادی کا راستہ دکھایا۔ یہاں سے تاریخ کا ایک نیا موڑ ہے۔ ایک نئی سیاست ایک نیا دور شروع ہوا یہ وہ طریقہ کامیابی و کامرانی تک لے جا رہا ہے۔ قوم پرانے تخیلات سے نکل کر ایک نئے طرز فکر اور راستے کی طرف رواں دواں ہوتی ہے جس سے وہ اپنے کو بچا لے اور غلامی سے آزاد ہو۔

رولٹ بل کے چند دفعات کا مختصر تجزیہ درج ذیل ہے:

(1) حکام کو اختیار دے دیا گیا کہ جس شخص سے چاہیں ضمانت نیک چلنی یا حفظ امن طلب کریں۔

(2) جس شخص کو چاہیں حکم دے دیں کہ اس کو کسی ایک جگہ نظربند کر دیں۔

(3) مقامی احکام بعض معمولی معاملات میں بھی جاری کرنے کے جرم قرار دیے گئے مثلاً جھنڈے لے کر پمفلٹ تقسیم کرنا، جلوس یا جلسوں میں شریک ہونا وغیرہ۔

(4) حکام کسی شخص کو حکم دے سکتے ہیں کہ وہ اپنی موجودگی کی رپورٹ پولیس میں اوقات معینہ پر درج کرائے۔

(5) حکام جس کو چاہیں بلا وارنٹ اور بلا وجہ بتائے گرفتار کر لیں۔

(6) حکام جس کو چاہیں بلا عدالت کی سزا کے قید رکھیں۔

(7) جو ہندوستانی ملک سے باہر ہیں ان کا ہندوستان میں داخلہ ممنوع قرار دے دیں۔

(8) اگر کسی کے قبضہ میں کوئی ضبط شدہ کتاب یا مضمون پایا جائے تو خواہ وہ چھپے یا شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہو محض قبضہ میں پائے جانے کی وجہ سے مستوجب سزا ہوگا۔

یہ بل فروری 1919ء میں شائع ہوا جب کہ گاندھی جی بیماری سے اٹھے تھے اور احمد آباد میں اپنی کمزوری کا علاج کر رہے تھے وہ سخت بے چین ہوئے۔ ولبھ بھائی پٹیل سے انھوں نے کہا کہ اگر چند آدمی تحریری احتجاج کر دیں اور اس پر عمل کیے جا سکیں تو ستیہ گرہ کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ 24 فروری 1919ء کو ستیہ گرہ آشرم میں ایک چھوٹی سی کانفرنس ہوئی جس میں ولبھ بھائی پٹیل، مسز نائیڈو، بی۔ جی۔ ہارنیمین، عمر سوبانی، شنکر لال بینکر اور انسویا بہن شریک ہوئے اور وہاں طے کیا گیا کہ ستیہ گرہ کا ایک حلف نامہ تیار کر کے اس پر لوگوں سے دستخط لیے جائیں اور یہ بھی طے ہوا کہ ایک ستیہ گرہ کمیٹی قائم کی جائے، وہ جو لائحہ عمل تیار کرے بس اس لائحہ عمل کے سب لوگ پابند ہوں۔

مرد میدان گاندھی درحقیقت خود اس جابرانہ ایکٹ نے وہی کام کیا جو آگ پر پٹرول کرتا ہے۔ چنانچہ گاندھی جی نے ستیہ گرہ کرنے کا عزم مصمم کر لیا اور ستیہ گرہ کمیٹی نے 23 مارچ 1919ء کو فیصلہ کر کے ستیہ گرہ کا یہ طریقہ منظور کیا کہ جو لٹریچر ضبط اور ممنوع قرار دے دیا گیا ہے چھاپا اور بانٹا جائے اور اخبارات کے رجسٹریشن کے قوانین کی بھی خلاف ورزی کی جائے۔ گورنمنٹ نے بجائے اپنا طریقہ عمل ترک کرنے کے مارچ 1919ء کو ترمیم شدہ ضابطہ فوجداری کا ایک بل پاس کر کے 18 مارچ 1919ء کو ایکٹ بنا دیا۔ اس ایکٹ کی رو سے گورنمنٹ نے ایسے اختیارات لوگوں کی آزادی کو سلب کرنے کے حاصل کر لیے تھے۔ ستیہ گرہ کمیٹی کی طرف سے 6 اپریل 1919ء کا دن اس کی مخالفت میں مظاہرے کے لیے مقرر کیا گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ لوگ دن بھر بھوکے رہیں دریا کو کسی مقام پر جمع ہو کر ایشور سے دعا کریں۔ لوگ ننگے سر اور ننگے پاؤں مجمع میں جائیں اور تمام کاروبار بند رکھیں۔ گاندھی جی کا ارشاد تھا کہ اس ستیہ گرہ میں بھوکے رہنا اور کاروبار بند کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس سے ہماری روحانی قوت بڑھے گی اور اس کے بڑھنے سے ہمارے دلوں سے سچی باتیں نکلیں گی اور وہ بلاشبہ خداوند تعالیٰ کی درگاہ میں مقبول ہوں گی۔ انھوں نے بھوکے رہنے کا جواز مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب

ثابت کیا اور اس کی چار دانگ ہند میں تبلیغ کی گئی جس طرح پہلے کوئی مثال نہ تھی تمام قوم ہندو و مسلمان سب اس پروگرام پر عمل درآمد کرنے اور جا بجا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

6 اپریل 1919ء کو گاندھی جی نے خود بمبئی میں ستیہ گرہ کا آغاز اس طرح کیا کہ ایک اخبار "ستیہ گرہ" نامی کا بغیر قانونی رجسٹریشن کے جاری کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے دو تین ممنوعہ کتب و رسائل ہند سوراج جیسی کی ضبط شدہ بھی فروخت کرنا شروع کر دیں۔ ان کے ساتھ مسز سروجنی نائیڈو بھی تھیں مگر حکومت نے کوئی باز پرس نہ کی۔ بمبئی میں گاندھی جی نے تمام پبلک کو چوپاٹی کے میدان میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ وہاں سمندر میں غسل کرنے کے بعد جلسے اور جلوس نکالا گیا۔ گاندھی جی ساتھ ساتھ تھے۔ پھر گاندھی جی پنجاب اور دہلی کے لیے روانہ ہوئے 9 اپریل کو جب گاڑی کوسی پہنچی تو پنجاب گورنمنٹ کے ایک افسر نے آپ کو یہ حکم دیا کہ پنجاب میں داخل ہونے کی آپ کو اجازت نہیں ہے۔ گاندھی جی نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ جب دوسرے اسٹیشن پلول پر ٹرین پہنچی تو حکومت دہلی اور پنجاب کی طرف سے یہ احکام دیے گئے کہ آپ حدود پنجاب میں داخل نہیں ہو سکتے ہیں اور حکومت ہند کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ آپ کی نقل و حرکت بمبئی میں محدود کر دی گئی ہے۔ اس کو بھی گاندھی جی نے ماننے سے انکار کر دیا۔ پولیس نے جب ان سے کہا کہ گاڑی سے اتر جائیے مگر گاندھی جی نے انکار کیا اور کہا جب تک میں گرفتار نہ کیا جاؤں گاڑی سے نہ اتروں گا۔ تب پولیس افسر نے گاندھی جی کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر [illegible]۔ وہاں سے متھرا لے گئے اور متھرا سے بذریعہ اسپیشل ٹرین بمبئی روانہ کر دیے گئے۔

پلول اسٹیشن پر گاندھی جی نے ایک پیغام ملک کے نام مسٹر مہادیو دیسائی کو دیا اور کہا قوم سے تو اس وقت میرے پیغام کا خلاصہ یہ ہے:

(1) میری گرفتاری مجھ کو آزادی دلاتی ہے۔ مجھے ڈر جس بات کا تھا یعنی یہ کہ حکومت مجھے روپوش کر جائے یا میں جیل خانہ بھیج دیا جاؤں۔

(2) اب آپ کے لیے ایمانداری فرض ادا کرنا باقی ہے جو ستیہ گرہ کے عہد نامہ کے موجب آپ پر عائد ہوتا ہے۔ اس فرض کو ادا کیجیے۔ اسی میں کامیابی ہے۔

(3) ستیہ گرہی جو اس بڑی جنگ میں شریک ہیں وہ پوری طرح کے عدم تشدد سے بال برابر بھی ہٹے یا انھوں نے کسی انگریز یا ہندوستانی پر زیادتی کی تو اس مقصد کو سخت صدمہ پہنچے گا۔

(4) مجھے امید ہے کہ ہندو مسلم اتحاد جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ اب سب عوام کے دلوں میں اتر چکا ہے، اصل رنگ میں نظر آئے گا۔

(5) آخر میں میرا ایمان یہ ہے کہ ہماری مرضی اور آزادی کا راز تکالیف و مصیبت برداشت کرنے

یقین ہے کہ انگلستان کے اصلاحات بخشنے میں خواہ اصلاحات کتنی ہی وسیع اور غیر محدود کیوں رہی ہوں۔

(۵) مجھے امید ہے کہ ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی یہودی اور وہ تمام لوگ جو ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں یا اس ملک میں بود و باش اختیار کر لی ہے اس قومی جدوجہد میں پورا حصہ لیں گے مجھے اس کی بھی امید ہے کہ عورتیں اور بچے جتنا ان کو چاہیے حصہ لیں گے۔

(موہن داس کرم چند گاندھی)

سوامی شردھانند کی جامع مسجد میں تقریر

دلی میں غلط فہمی کی بنا پر 30 مارچ ہی کو ستیہ گرہ کا دن منایا گیا۔ گورنمنٹ اب پوری طاقت سے اس تحریک کو کچلنے کے لیے تیار ہو گئی تھی چنانچہ فوج بلوائی گئی اور دہلی کے عظیم الشان جلسے کو منتشر ہونے کے لیے کہا گیا۔ فوج اور پولیس ہتھیاروں کے علاوہ مشین گن سے بھی مسلح تھی۔ دو مرتبہ گولی چلی۔ کچھ آدمی قتل اور بہت سے مجروح ہوئے۔

یہی 30 مارچ 1919ء کا دن ہے جب ہندو مسلم اتحاد اتنے عروج پر پہنچ گیا تھا کہ آریہ سماج کے لیڈر سوامی شردھانند نے جامع مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی اور مسلمانوں نے ذوق و شوق سے ان کو ایسا کرنے دیا۔ اس کے بعد جب جلوس نکلا اور چاندنی چوک پہنچا تو وہاں گورکھا فوجوں کی سنگینوں کے سامنے سوامی جی نے اپنا سینہ کھول دیا۔ اس واقعہ کی عام شہرت ہوئی اور تمام ہندوستان جوش سے دیوانہ ہو گیا۔

اسی دوران حکومت ناک میں تھے فوراً شور و غوغا مچانا شروع کیا کہ ایک ہندو کو مسجد میں کیوں آنے دیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو اس وقت رانچی میں نظر بند تھے قلم ہاتھ میں لیا اور ایک رسالہ معہ احادیث صحیحہ تیار کر دیا اور ایسا مسکت جواب دیا کہ پھر لوگ خاموش ہی ہو گئے۔ تب کھسیانے ہو کر ان لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ مسجد کا منبر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جگہ ہے۔ وہاں ان کو کیوں کھڑا کیا لیکن سانپ نکل گیا تھا اب لکیر پیٹنے سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔

صرف دلی اور بمبئی کی شرط نہیں ہندوستان کا کوئی بڑا یا چھوٹا شہر نہ تھا جہاں عظیم پیمانے پر جلسے نہ ہوئے ہوں جن میں پندرہ ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک کے مجمعے ہوئے۔ لوگ دن بھر بھوکے رہے اور ننگے سر اور ننگے پیر جلسہ گاہ تک جا کر خدا کے سامنے الحاح و زاری سے دعا کر رہے تھے کہ اے اللہ انصاف کر، اے اللہ انصاف کر۔ تمام ہندوستان ابل پڑا تھا۔ بڑے بڑے لوگ گاندھی جی کے

جنو ہوگئے۔ مولانا حسرت موہانی جو گاندھی جی کی ستیہ گرہ کے کبھی موافق نہ ہوئے اس جنگ میں پیش پیش تھے۔ حسرت صاحب کو تو آزادی کے لیے لڑنے مرنے کا محاذ منا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر انصاری، سوامی شردھانند وغیرہ سب میدان میں آگئے۔ اس تحریک کا نام کسی نے "خاموش مقابلہ" رکھا جسے انگریزی میں PASSIVE RESISTANCE کہا گیا ہے۔ گاندھی جی نے ایک گشتی چٹھی نشر کی جس میں رولٹ بل کی خرابیوں کو بیان کرتے ہوئے صاف صاف اعلان کیا کہ "اصلاحات ممکن ہے کیے جائیں یا نہ کیے جائیں۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مسئلہ پر ٹھیک اور واجبی سمجھوتہ ہو جانا چاہیے۔ سول سروس جماعت کو سمجھانا چاہیے کہ وہ ہندوستان میں صرف اس کی ہندوستان کی خادم بن کر رہ سکتی ہے۔ وحشی نہیں بلکہ عملی۔ اور برطانوی تجارتی جماعت کو خیال کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں ان کا وجود اسی حالت میں قائم رہ سکتا ہے جبکہ وہ اس کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کریں نہ کہ وہ ہندوستانی صنعت وحرفت اور تجارت کی تباہی و بربادی پر آمادہ ہوں۔ ... مسودات مذکورہ کے باعث ہم کو اس حکومت کے خلاف ناراضی و تنفر زیادہ سختی سے دکھلانا چاہیے جس کے استبدادی کارنامے خود اس کی شہادت دے رہے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ اس گشتی کو ایک ستیہ گرہی کی طرح گاندھی جی نے وائسرائے کے پاس بھیج دیا۔ وائسرائے نے گاندھی جی کو بات چیت کے لیے بلایا۔ اور گاندھی جی گئے۔

گاندھی جی اور وائسرائے کی ملاقات کا خلاصہ جو کتر بیونت کر اخبارات نے مکالمے کی شکل میں چھاپا حسب ذیل ہے:۔

گاندھی جی:۔ سختی کے ساتھ پیسو رزسٹنس PASSIVE RESISTANCE یعنی خاموش مقابلے سے کام لیا جائے۔

وائسرائے:۔ PASSIVE RESISTANCE میں بہت جلدی کی گئی۔

گاندھی جی:۔ میرا خیال تھا کہ برٹش گورنمنٹ کی بیرونی قوت بڑی قوت ہے۔

وائسرائے:۔ میری رائے اس کے خلاف ہے اور آپ کے بیان پر مجھ کو شک ہے۔

گاندھی جی:۔ اگر برٹش گورنمنٹ کی بیرونی طاقت بڑی ہے تو عام ہندوستانی کو خود دار سمجھنا چاہیے اور اس حالت میں میں پہلا شخص ہوں گا جو خود دار کہلانے کا مستحق ہوگا۔

آج کل اگر کسی کی زبان پر یہ گستاخی ہوتی تو یک لخت اس کا اس قدر جلد محبوس ہونا ممکن تھا۔ لیکن لوگوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا موقع ملا اور لوگ اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ مسلمان و خلافت کی وجہ سے اضطراب عظیم میں مبتلا تھے ہی۔ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے یہ رولٹ بل ایک چیلنج تھا لیڈر مل

گیا اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک عجیب نظارہ سامنے آیا۔

جلیانوالہ باغ کا قتل عام

یکم مارچ 1919ء کو ستیہ گرہ کی تجویز مقابلے کے لیے جب پاس ہوئی تھی تو امرتسر اور پنجاب کے دیگر اضلاع میں بھی دوسرے صوبوں کے مراکز اور اضلاع اور شہروں کی طرح 6 اپریل کو ہڑتالیں ہوئیں اور پرجوش مظاہرے کیے گئے۔

گورنمنٹ سختی سے ان مظاہروں کو کچل دینے کے لیے میدان میں اتر آئی۔ فتح اور طاقت کا گھمنڈ عروج پر تھا اور گورنمنٹ برطانیہ نے وہی غلطی کی جو ابھی حال میں جنرل یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان میں کی جس سے بنگلہ دیش بنا۔ گورنمنٹ بھول گئی کہ عوامی جذبات کو کچلا نہیں جا سکتا۔ کہا گیا ہے کہ سمندر میں جب طوفان آتے ہیں تو بجز خدا کے اور کسی میں طاقت نہیں ہے کہ وہ کچھ درست کر سکے۔ ہر وقت فوج متحرک رہتی تھی، مشین گنوں کا مظاہرہ ہوتا تھا، مگر گاندھی جی اور دیگر لیڈروں نے وہ صورت پیدا کی تھی کہ اب بند کا کوئی سوال نہ تھا۔

انہی سخت کارروائیوں کے تحت 10 اپریل 1919ء کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ 15 اپریل 1919ء کو لاہور اور امرتسر میں جہاں تحریک زوروں پر تھی مارشل لا جاری کر دیا گیا۔

10 اپریل 1919ء کو یہ خبر مشتہر ہو کر "گاندھی جی گرفتار کر لیے گئے ہیں" امرتسر میں ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا اور چونکہ بہت زیادہ تعداد تھی اور لوگ ستیہ گرہ کے بنیادی اصول یعنی عدم تشدد کو سمجھے نہیں تھے، ایک بینک پر حملہ کر دیا، بعض انگریز افسروں اور ایک میم کو قتل کر ڈالا، ایک عمارت کو آگ لگا دی۔ پولیس حالات پر قابو نہ پا سکی لیکن جنرل ڈائر دو ہزار فوج لے کر امرتسر پہنچا۔ 13 اپریل کی صبح کو جنرل ڈائر نے ایک اعلان کے ذریعہ کسی قسم کا جلوس نکالنے کو منع کیا۔ چار آدمیوں سے زیادہ جمع ہونے کو خلاف قانون ٹھہرایا اور یہ بھی اعلان کیا کہ اگر ضرورت ہوئی تو اسلحہ کا استعمال کر کے خلاف ورزی کرنے والے مجمع کو منتشر کیا جائے گا۔ لیکن پبلک نے اس حکم کو نظر انداز کر کے شام کو 4½ بجے جلیانوالہ باغ میں جلسہ عام کا اعلان کر دیا۔ جب جنرل ڈائر کو یہ خبر ملی تو وہ آگ بگولا ہو گیا اور مشین گنیں اور فوج لے کر موقع پر پہنچا اور تمام راستے گھیر کر کوئی بھاگنے نہ پائے، گولی چلانے کا حکم دے دیا اور اس وقت تک فائر کرتا رہا جب تک ایک گولی بھی باقی تھی حتیٰ کہ 379 آدمی ہلاک اور ہزاروں مجروح ہو گئے۔ اس کے بعد نہ زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا گیا نہ پانی تک دیا گیا۔ وہیں پڑے تڑپتے رہے۔ اس کے بعد 1½ ماہ تک مارشل لا جاری رہا۔ مارشل لا قانون کے تحت شہر کے معززین کو

دفتروں میں سپاہیوں پر حاضر ہو کر حکام کو سلام کرنا پڑتے تھے۔ 8 بجے شام سے 5 بجے صبح تک کرفیو نافذ تھا۔ خلاف ورزی کی سزا کوڑے تھی۔ سب کی موٹریں اور تمام سواریاں بیگار میں لے لی گئی تھیں۔ بجلی، دستی اور پنکھے چھین لیے گئے تھے۔ معمولی شبہ پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ سناتن دھرم کالج پر ایک اشتہار حکام مارشل لا کا چسپاں تھا اسے کسی نے پھاڑ ڈالا تو تمام طلباء، پروفیسر اور حاضر کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے اور ان کو تین میل پیدل چلایا گیا تب ضمانت پر رہا کیے گئے۔ کالجوں کے ایک ہزار طلباء کو روزانہ حاضری کا حکم دیا گیا جس کے لیے ان کو روزانہ 16 میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ ذرا سے شک پر لوگوں کو تازیانے لگائے جاتے تھے۔ امرتسر میں ایک گلی تھی جہاں کچھ لوگوں نے ایک انگریز پر حملہ کر دیا تھا۔ اس گلی سے لوگوں کو پیٹ کے بل رینگ کر جانا پڑتا تھا۔ گلی بہت لمبی تھی۔ کوئی ذرا سا بھی اٹھا تو تازیانے لگتے تھے۔ لائل پور میں حکم ہوا کہ جب کوئی انگریز سامنے سے گزرے تو ہر ایک ہندوستانی گاڑی سے اتر کر اور اگر چھتری لگائے ہو تو چھتری بند کر کے مؤدب کھڑے ہو کر سلام کرے۔ فوجیں دیہات میں بھیج دی گئیں جہاں وہ ہر شخص کو جس کو چاہتیں پکڑ لیتیں اور کوڑے لگاتیں۔ ڈرانے کے لیے ہوائی جہاز سے بم پھینکے گئے اور مشین گنوں سے گولیوں کی بارش کی گئی۔ ایک لاش کی پڑی اکھڑ گئی تھی۔ قریب کے دیہات والوں پر بلا جانچ گولی چلائی گئی۔

یہ واقعات سن کر تمام ہندوستان ہل گیا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اب یہ ہندوستان گاندھی جی کا ہندوستان تھا۔ چاروں جانب سے انتہائی جوش و خروش کے ساتھ ان افعال کی مذمت کی گئی اور جب یہ خبریں انگلستان پہنچیں تو وہاں کی رائے عامہ بھی بے حد متاثر ہوئی۔ ایک بڈھے انگریز نے جس کا بیٹا حال ہی میں آئی سی ایس ہو کر ہندوستان آیا تھا، صبح کو اخبار میں جب جلیانوالہ باغ کے قتل عام کی خبر پڑھی تو غصے سے دانت پیس کر کہا۔ "میں نے اپنے لڑکے کو ہندوستان یہ ہولناک جبر کرنے کے لیے نہیں بھیجا ہے۔ میں اسے واپس بلا لوں گا" مارشل لا کے لیے ایک تحقیقاتی ٹریبونل مقرر کیا گیا۔ اس کے سامنے انگریز افسروں نے ان مظالم کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ:

"ہماری ان کارروائیوں سے مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے دماغ سے بغاوت کے جذبات فنا کر دیے جائیں۔"

جنگ کے دوران ہندوستان نے لاکھوں سپاہی، دو ارب (2,000,000,000) روپیہ اور خون اور پسینہ برطانیہ کو دیا تھا اور اس کا یہ صلہ ملا۔

امور خلافت کے سلسلے میں جذبات کا بے پناہ ابال اور ادھر حکومت کی یہ انتہائی کارروائیاں، وحشت و بربریت اور طوق غلامی کو مضبوط کرنے کی سازشیں۔ ایک طرف مسلمانوں سے وعدوں کی خلاف ورزی، دوسری طرف

ہندوستان سے وعدوں کی خلاف ورزی۔ ملک بھرپور جدوجہد آزادی کے لیے تیار تھا اور گاندھی جی کی ہیں مدی حرکت و مردانگی رنگ لا رہی تھی۔

رابندر ناتھ ٹیگور کا ردِ عمل

حتیٰ کہ ہندوستان کے مشہور فلسفی و دانشور اور نوبل پرائز کا انعام پانے والے رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنا "سر" کا خطاب 30 اپریل 1919ء کو واپس کر دیا۔ اس سے ہندوستان کا تمام تعلیم یافتہ طبقہ بے حد متاثر ہوا۔

احمد آباد میں مزدوروں نے ہڑتال کر رکھی تھی اور احمد آباد جو بڑا صنعتی شہر تھا وہاں کے لوگوں کی درخواست پر گاندھی جی 13 اپریل 1919ء کو احمد آباد گئے۔ 14 اپریل 1919ء کو امن قائم ہو گیا اور مزدوروں نے ہڑتال ختم کر دی۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ گاندھی جی کا منشا کسی قسم کا ہلڑ بازی نہیں بلکہ شعور کے ساتھ رائے عامہ کو بیدار اور موثر ثابت کرنا تھا۔

20 اپریل 1919ء کو کانگریس کمیٹی کا جلسہ تھا۔ لیکن گاندھی جی پنجاب صرف اس لیے نہیں گئے کہ ان کی گرفتاری لازمی تھی اور اس سے پبلک میں مزید ہیجان پیدا ہوتا۔ اور اس وقت تک کا تجربہ یہ تھا کہ پبلک عدم تشدد پر قائم نہیں رہی تھی۔

اس کے بعد گورنمنٹ نے جلیانوالہ باغ اور دیگر ہولناک واقعات کی جانچ کے لیے ہنٹر کمیٹی مقرر کر دی اور تب گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک روک دی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ ابھی پبلک اہنسا کے لیے تیار نہیں تھی۔ اور ستیہ گرہ کی کامیابی صرف دو بنیادی اصولوں "سچ" اور "اہنسا" پر منحصر تھی۔ ستیہ گرہ کے روک دینے سے گاندھی جی کا وقار اندرون و بیرون ملک میں آسمان تک پہنچ گیا۔

اسی دوران حکومت نے بمبئی کرانیکل کو بند کر کے اس کے ایڈیٹر ہارنیمین کو جلا وطن کر دیا۔ گاندھی جی نے ینگ انڈیا کے ساتھ ایک اور اخبار "نوجیون" نکالا جس کے ایڈیٹر مہاتما گاندھی، مہادیو ڈیسائی پبلشر اور شنکر لال بینکر پرنٹر مقرر ہوئے۔

جنگ استقلال افغانستان

انگریزی کی بدبختی کے دن آ گئے تھے۔ افغانستان نے بھی کروٹ لی۔ افغانستان کا رقبہ تقریباً 2 لاکھ 45 ہزار مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ سے کم ہے۔ یہ ایک پہاڑی ملک ہے۔ بہت سے زرخیز آباد

ہیں۔ ہندوکش اور ہمالیہ پہاڑوں کا سلسلہ ہیں جو رفعت کی بلندی تک چلا جاتا ہے۔ اکثر چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں داخلے کے لیے یہی درے ہیں۔ درۂ خیبر اور درۂ گومل پنجاب کو راستہ دیتے ہیں اور درۂ بولان سندھ کو راستہ دیتا ہے۔ افغانستان کے پورب صوبہ سرحد، پچھم ایران کا صوبہ خراسان شمال میں بخارا اور روسی ترکستان اور دکھن میں بلوچستان ہے۔ اس کی جغرافیائی پوزیشن ایسی ہے کہ ہمیشہ سے یہ روسیوں کا اکھاڑہ رہا۔ کبھی روس کے زیر اثر رہا اور کبھی برطانیہ کے۔ مختلف ادوار سے گزرنے کے بعد 1880ء میں عبدالرحمن خاں امیر افغانستان ہوئے جو برطانیہ سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔

1901ء میں ان کے انتقال پر ان کے لڑکے امیر حبیب اللہ خاں حکمراں ہوئے۔ وہ پوری طرح برطانیہ کے زیر اثر آگئے۔ ان کے عادات و اطوار بھی خراب تھے۔ انگریزوں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد ان کو ایک بڑی رقم بطور معاوضہ دی جائے گی اور خلیفۃ المسلمین بنا دیا جائے گا۔ امیر حبیب اللہ نے کابل میں مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ساتھیوں کو مسلسل قید رکھا۔ اگرچہ زبان سے وہ انھیں مہمان کہتا تھا اور ہر تحریک جہاد کی شدت سے مخالفت کی۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے افغانستان میں ہندوستان کی عارضی حکومت کی بنا رکھی تھی جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ قرار دیئے گئے تھے۔ لیکن امیر حبیب اللہ نے کبھی اس کو کام کرنے کا موقع نہیں دیا اور وہ لوگ کہا کرتے تھے جب وہ شاہی مہمان کے نام پر تنگ و تاریک کمروں میں محبوس رہے ہر لمحہ ان کی نگرانی ہوتی رہی۔

لیکن افغانستان کی استقلال پارٹی جو سید جمال الدین افغانی کی کوششوں سے عالم وجود میں آئی تھی، سرگرم عمل تھی۔ اس نے پوری فوج پر اپنا اثر جما لیا تھا۔ اس میں شاہی خاندان سے بیگم ضیا حضرت اور امان اللہ خان بھی شریک یا مددگار ہوگئے تھے۔

امیر حبیب اللہ جلال آباد شکار کو گئے تھے۔ 20 فروری 1919ء کو وہ مچھلی کا شکار کھیل رہے تھے کہ ایک مچھلی تالاب سے باہر تڑپنے لگی۔ امیر حبیب اللہ نے کہا اسی طرح ایک دن ہر انسان کی روح تڑپ کر اس جسد خاکی سے جدا ہو جائے گی۔ اسی شب میں کوئی شخص ان کے کمرے میں داخل ہوا اور گولی سے ان کو ہلاک کرکے فرار ہوگیا۔

ظفر احمد ایبک لکھتے ہیں:

"امیر حبیب اللہ خان نے مرنے سے ایک ہفتہ قبل اپنے جمعہ کے خطبہ میں خود کو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کہلایا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیر حبیب اللہ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا منتظر تھا تاکہ اپنے کو خلیفہ اعلان کرے۔ اسی غرض سے اس نے انگریزوں سے اپنی غیر جانب داری کی قیمت وصول کرنے کے

بے بنیاد قرار دی گئی تھیں۔ [illegible] کر قوم نے جنگ میں انگریزوں کی مدد کی تھی جس کا لحاظ رکھ کر خلافت اسلامیہ کے حدود و تمدن کو ہی پیش نظر رکھ کر اس نے عالم اسلام کو نقصان پہنچایا تھا۔ ان کا مقصد و معاونت حاصل کرنا [illegible] لیکن خود [illegible] دیکھیے کہ ان کو خفیہ تا اسلامیین ہند سے [illegible] اور نہ ہی ان کو [illegible] وقت پر خرچ کرنے کے لیے روپیہ ملا۔[1]

امیر حبیب اللہ خاں کے مرتے ہی پوری فوج [illegible] امیر امان اللہ خاں [illegible] امیر نصر اللہ خاں کو گرفتار کر کے کابل لائی اور امان اللہ خاں کے امیر افغانستان ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ امیر امان اللہ خاں نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور سرحد پر فوجیں بھیج دی گئیں اور مولانا عبید اللہ سندھی صاحب نے عارضی حکومت کی طرف سے ہندوستان میں پیغامات بھیجے کہ بصورت جنگ سب لوگ بروقت کے لیے [illegible] اور فوجوں کی مدد کے لیے تیار رہیں۔

جنگ چھڑ جانے کے بعد [illegible] گورنر جنرل ہند مسٹر چیمسفورڈ نے ۱۵ مئی 1919ء کو اپنی "وفادار رعایا" شہنشاہ معظم" کو آگاہ کرنے کے لیے ایک بیان جاری کیا جس کے بعض حصے اب ہیں جن سے ہمارے خطہ کلام کی تائید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو

"ہز میجسٹی نے [illegible] بے وقوفی کی ایک وجہ تو یہ قرار دی کہ امیر حبیب اللہ[2] کے قتل [illegible] اور امیر امان اللہ خاں [illegible] چھوڑ کر وزیروں کے [illegible] ہندوستان کی حکومت کے [illegible] کا تو ذرا سی حد تک [illegible] جری قسم کابل کی [illegible] اور امید موہوم کو [illegible] حاصل ہونے والا تھا۔

"ہز میجسٹی کے [illegible] کی خدمت کے [illegible] ہندوستان میں [illegible] ملک میں [illegible] ہوگی۔ [illegible] ہندوستان میں [illegible] لوگوں کا مال و اسباب سلامتی کی حالت میں [illegible] امیر نے اس طرح کے کاغذات و اطلاعات ہندوستان میں [illegible] رشوت [illegible] کا بھی [illegible] کیا [illegible] یہ کی [illegible] غلطی سے

---

[1] تاریخ [illegible] حصہ اول صفحہ 130

کہ انھوں نے اسی ہدف کا ایک ایسی طاقت سے مقابلہ کیا جو دنیا کی سب سے بڑی جنگ میں کامیاب و منصور ہو چکی ہے۔ گورنمنٹ کو اپنی مرضی کے مطابق صرف کرنے کے لیے ملک کو تیار رکھنے والی درست پر جانی ہوائی طاقت حاصل ہے اور وہ اس حرکت شرمناک کی فوراً واقعی سزا دے گی۔

سردار محمد صالح خان کمانڈر بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے 2 مئی 1919ء کو کابل سے اعلان جنگ ہونے کے قبل لڑائی چھیڑ دی۔ انگریزوں نے ہوائی جہاز سے بم گرائے جس سے اس کا ایک پاؤں زخمی ہو گیا اور وہ چیختا ہوا پیچھے بھاگا کہ "پائے من شہید شد پائے من شہید شد" امیر امان اللہ نے فوراً اس کو معزول کر دیا۔ اور اس کی سزا کے لیے مشورہ طلب کیا۔ سب لوگوں کی رائے تھی کہ قتل کر دیا جائے لیکن امیر امان اللہ خان نے حکم دیا کہ اسے عورتوں کا لباس پہنا کر گھر کے اندر رکھا جائے اور یہ ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ اگر کبھی مردوں کے لباس میں گھر کے باہر دیکھا جائے تو ہر شہری پر اس کا خون حلال کیا جاتا ہے۔ جس شخص کو بھی ملے وہ اسے قتل کر دے۔ سردار محمد صالح خان کے فرار سے فائدہ یہ ہوا کہ انگریزی فوج نے ڈکہ پر قبضہ کر لیا۔ اب جنرل نادر خان محاذ جنگ پر آیا اور اس نے تیزی سے حملے شروع کیے اور مارچ کرتا ہوا تھل کا محاصرہ کر لیا۔ نادر خان کے مقابلے کے لیے جنرل ڈائر روانہ کیا گیا۔ جنرل ڈائر نے اس وقت کے سرکاری انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں اپنا ایک بیان شائع کرایا جس میں کہا کہ نادر خان میری فوج پر اس طرح ٹوٹا جس طرح آسمان سے ستارہ ٹوٹتا ہے۔ جنرل نادر خان نے پشاور کو گھیرنے اور اس پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ادھر جنرل نادر خان کے بھائی جنرل محمود خان نے انگریزی سپاہ کو دوسرے محاذ پر پے در پے شکست دی تھی مگر 27 مئی 1919ء کو امیر امان اللہ خان نے جنگ بندی کا فیصلہ کر کے حکم دیا کہ افغانی فوجیں سرزمین ہندوستان کو خالی کر کے سرحد سے 20 میل پیچھے ہٹ آئیں۔

امیر امان اللہ خان کا عالم یہ تھا کہ جب محمد صالح فرار ہوا اب اور انگریزوں نے ہوائی جہاز سے کابل پر بمباری کی تو وہ رائفل لے کر خود نکلتا تھا اور ہوائی جہاز پر حضرت علی سلطان کے منع کرنے کے باوجود فائر کرتا تھا۔ اس فعل عبث سے اس کی بے جگری اور دلاوری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس جنگ کا منشا صرف یہ تھا کہ انگریز کا رعب افغانستان سے اٹھ جائے اور ملک خداداد افغانستان واقعی ملک خداداد ہو جائے۔ انگریزوں کی دقت یہ تھی کہ ابھی ہندوستان کی افواج واپس نہیں آئی تھیں اور روس میں بالشویک حکومت لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں 1917ء میں قائم ہو چکی تھی۔ روس اپنی اندرونی دقتوں کے باوجود پوری طرح ہندوستان اور افغانستان اور ہر محکوم ملک کی مہم آزادی کا ہر طرح کا مددگار تھا۔ اس حیثیت میں انگریز کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ افغانستان کو مثل سابق کوئی سبق دے سکتا۔ اور اسی لیے جنگ بندی اس قدر جلد طے ہو گئی۔

راولپنڈی کانفرنس

مستقل صلح کے لیے دونوں فریقوں کے نمائندے راولپنڈی میں جمع ہوئے اور وہاں 8 اگست 1919ء کو دونوں ملکوں کے درمیان معاہدت طے ہو گئے۔ اس صلح کے ذریعہ انگریزوں نے افغانستان کی مکمل آزادی کو اور افغانستان نے موجودہ سرحدوں کو تسلیم کیا۔

راولپنڈی کانفرنس میں پہلے انگریز نمائندے سر ہیملٹن گرانٹ نے تقریر کی۔ اس نے بڑی تمکنت سے افغانستان کو جنگ شروع کرنے پر ملامت کی اور پھر کہا کہ "افغانستان کی کیا حیثیت تھی جو ہم سے نبرد آزما ہوتا لیکن ہم نے افغانستان پر رحم کر کے لڑائی جاری رکھنا نامناسب سمجھا۔" اس کے بعد افغانی نمائندے سردار علی احمد خان نے زوردار گفتگو کی۔ اس کو انگلستان کے اخبارات نے حیرت خیز قرار دیا۔ افغانی مندوب نے کہا "لڑائی تم نے شروع کی اور صلح کی درخواست تم نے کی ہے۔ تم کو اپنی طاقت کا بالکل بے جا گھمنڈ ہے۔ تم جرمنی کے مقابلے میں بہت کمزور تھے مگر دنیا میں اتحاد جیتا ہے۔ تم کو اتحادی مل گئے اور تم کامیاب ہو گئے تم کو کیا معلوم کہ ہم کو اتحادی نہ مل جاتے۔" اس پر کانفرنس عارضی طور پر ملتوی کر دی گئی۔ اصل الفاظ حسب ذیل تھے:۔

"اس جنگ کے متعلق کہ برطانوی گورنمنٹ افغان گورنمنٹ سے کس قدر زیادہ طاقت ور ہے کہ اگر جنگ جاری رہتی تو یقیناً فتح برطانوی گورنمنٹ کے حق میں ہوتا۔ سردار علی احمد نے تسلیم کیا کہ اس وقت تو برطانوی گورنمنٹ کے پاس زیادہ توپیں اور ہوائی جہاز [illegible] کی بہادری سے لیکن یہی حالت جنگ یورپ میں جرمنی کی بھی تھی اور کہ جرمنی نے لندن پر اسی طرح بم گرائے تھے جس طرح کابل پر انگریزوں نے گرائے مگر آخر میں کون کامیاب ہوا۔ برطانیہ نے اس جنگ میں کامیابی حاصل کی کیونکہ وہ متحد ہو گئے تھے۔ ان کو اتحادی مل گئے تھے یہی امکانات اتحاد و امداد کے افغانستان کو بھی حاصل ہیں۔ اسی صورت میں صلح کانفرنس کا یک طرفہ درست رکھنے کا خیال نہیں ہے کہ تم کامیاب ہوتے اگر جنگ جاری رہتی۔

حکومت ہند کو اس غلط فہمی میں نہ پڑنا چاہیے کہ افغانی جاہل اور جاہل قوم ہیں:

مولوی عبیداللہ سندھی آزادی ہند کے لیے جب تک کابل میں رہے اور جاپان کے ملکوں پر بھروسہ کر کے انھوں نے [illegible] کے بعد وہاں پر اچھا اثر نہیں ڈالا ان کی بات پر شبہ کیا گیا اور انگریزوں نے خفیہ پروپیگنڈہ سے یہ خیال پیدا کر دیا کہ مسلمان افغانستان سے حملہ کرا کے درخون کی مدد کر کے ایک

متحدہ قومی جمہوریہ نہیں بلکہ افغانستان کی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس پر بحث و مباحثہ
کئی سال تک جاری رہی۔ "افغان لوگ بڑے باہمت، قوم پرور مسلمان صاف دل ہیں۔" حتیٰ کہ مولانا محمد علی سے
بھی ایک مرتبہ سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اگر افغانستان ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے
آئے گا تو ہم اس کی مدد کریں گے اور اگر وہ ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لیے آئے گا تو ہم اس کا ڈٹ کر مقابلہ
کریں گے۔ 1920ء میں مولانا حسرت موہانی نے جو الہ آباد سے واپس ہو کر آتے تھے، مجھ سے کہا کہ سر تیج بہادر
سپرو کے مکان پر اس معاملہ پر غور کرنے کے لیے ایک نشست تھی کہ اگر افغانستان ہندوستان پر حملہ کرے
تو ہمارا رویہ کیا ہوگا۔ مولانا حسرت خاموش بیٹھے رہے پھر بات کو چھوڑ کر کہنے لگے کیا فضول بحث ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ
افغانستان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کر سکے۔ آپ اس کو سوچئے کہ اگر روس حملہ کرے
تو ہمارا رویہ کیا ہوگا۔ سر تیج بہادر نے پوچھا کہ آپ بتلائیے کہ کیا رویہ ہوگا۔ مولانا حسرت نے کہا کہ ہم فوراً ان کا
خیر مقدم کریں گے۔ سپرو صاحب نے کہا کہ وہ ہم کو غلام بنا لیں گے تو حسرت صاحب نے جواب دیا کہ تجربہ یہ
بتلاتا ہے کہ ان کی پالیسی سامراج پسندانہ نہیں ہے وہ دوسری غلام قوموں کو آزاد کراتے ہیں۔ سپرو صاحب نے
کہا کہ مولانا وہ آپ کا گھر لوٹ لیں گے۔ مولانا نے کہا کہ بلا سے لوٹ لیں ملک تو آزاد ہو جائے گا۔ ان سب
باتوں سے معلوم ہوگا کہ 1919ء مسلمانوں کے تحت دلی خلجان کا زمانہ تھا اور یہ بھی کہ انگریز نے لڑائی تو جیت
لی تھی لیکن یہ جنگ آزادی کے لیے آگ بھڑک گئی تھی۔

امیر امان اللہ خاں

اے امیر کامگار اے شہریار — نوجوان و مثل پیراں پختہ کار

امیر امان اللہ خاں نے شروع سے جہاد اور اصلاحات کا نعرہ دیا۔ وہ جوشیلی اور پرزور تقریریں کرتے
تھے۔ اپنی قوم سے کہتے تھے کہ ہر مسلمان بندوق رکھ کر سویا کرے۔ کیا معلوم کب میں جہاد کے لیے پکاروں۔
اپنے پوری اعلیٰ قوت سے پکارتے تھے "امان اللہ اللہ کی راہ میں ہر وقت اپنی جان دینے کے لیے
تیار ہے۔" ان تمام لوگوں کو جو آزادانہ جذبات رکھنے کی وجہ سے قید تھے امیر امان اللہ نے رہا کر دیا۔ جن میں
ہندوستان کے ڈاکٹر عبدالغنی بھی تھے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، اور ان سب کی بڑی عزت کرتے تھے
اسی لیے ڈاکٹر عبدالغنی کو راولپنڈی صلح کانفرنس کے لیے افغانستان کے نمائندوں میں شامل کیا تھا۔
امان اللہ نے پوری قوم افغان کو حکم دیا کہ وہ چھ ماہ کا کھانا تہہ خانوں میں جمع کرلے (افغانستان ایک بہت
سرد ملک ہے اور وہاں پکا ہوا کھانا بھی چھ ماہ تک سڑتا نہیں ہے) انہوں نے سودیشی اشیاء کو رواج دیا۔ کہا کہ اپنے

ملک کا کپڑا پہنو۔ اگر کوئی شخص بیرون ملک کے کپڑوں میں ملبوس نظر آیا تو فوراً اس کے قریب جا کر اس کی بہت تعریف کی اور قینچی نکال کر ایک ٹکڑا کاٹ لیا اور کہا کہ "نمونہ گیریم" اور لباس کو برباد کر دیا۔ وہ راتوں کو اکیلے گھومتا تھا اور چونکہ یہ حکم تھا کہ کوئی اکیلے نہ گھومے، ایک مرتبہ سپاہی نے اسے گرفتار کر لیا جس کو اس نے انعام دیا۔ امان اللہ نے اپنے ملک میں تعلیم جاری کی علوم حاضرہ و سائنس کی تعلیم اور کچھ لڑکوں کو لندن بھی بھیجا مگر ان کے ساتھ یک عالم بھی گیا۔ تاکید تھی کہ جب عیسائی لڑکے گرجا میں جائیں تو یہ لڑکے قرآن پاک کی تلاوت کریں۔

تحریک اسلام اور خلافت مرکزیہ اسلامیہ کا وہ بدل و جان معتقد تھا چنانچہ جب 1921ء میں تاج برطانیہ کا ایک نمائندہ شرائط صلح پر دستخط کرنے کے لیے امیر امان اللہ خاں کے پاس گیا اور کہا کہ انگلستان اور افغانستان میں صلح مکمل ہو رہی ہے تو امان اللہ نے جواب میں کہا کہ ہم صرف تعلقات ہمسائگی قائم کر رہے ہیں۔ تم نے جو سلوک آل عثمان سے کیا اور جس طرح تم سمرنا میں مظالم کر رہے ہو اور ہندوستان کے علماء کو قید کر رہے ہو تمہارے ساتھ صلح ناممکن ہے۔

افغانستان آزاد ہو گیا تھا اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ انگریز کی غلامی کا طوق نکال پھینکا تھا۔ اور خودداری اور خودشناسی کی باتیں کر رہا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب انگریزوں نے افغانستان کو موسم گرما میں عیش سے گزارنے کے لیے تجویز کیا تھا۔ افغانیوں نے انگریز مقیم افغانستان کا قتل عام کر دیا اس کے انتقام کے لیے برطانوی فوجوں نے غزنی اور کابل کو روند ڈالا۔ آج وہ وقت گزر گیا تھا کیونکہ روس میں جو انقلاب آیا تھا، اور لینن کی جو خارجہ پالیسی تھی اس کے تحت انگریز ایک دوسری جنگ عظیم کا آغاز کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ کر سکتا تھا۔ اس طرح آزادی کا جو بیج مولانا محمود حسن نے بویا تھا وہ یہ جگر رنگ لا رہا تھا۔ استقلال افغانستان نے تحریک خلافت اور اس کے ذریعہ تحریک آزادی ہند کو بروقت اور بے مثال طاقت بہم پہنچائی جیسا کہ اس کا تذکرہ تحریک خلافت کے سلسلہ میں ناگزیر ہے۔ اگرچہ انگریز کی شاطرانہ سیاسی چالیں ختم نہیں ہوئی تھیں اور کہہ رہی تھیں ؎

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں ہنوز بادۂ ناخوردہ در رگ تاک ست؟

آل انڈیا مسلم کانفرنس

تحریک خلافت کے سلسلے میں جیسا کہ پہلے کہا گیا تمام ہندوستان میں احتجاجی جلسے ہو رہے تھے اور مطالبہ ہو رہا تھا کہ معاہدہ کے مطابق جس وعدہ خلافت مرکزیہ اسلامیہ کو ترکی بحال رکھا جائے اور اماکن مقدسہ جزیرۃ العرب بیت المقدس، فلسطین، بغداد، نجف اشرف وغیرہ کو خلیفہ کے زیر نگین رکھا جائے خواہ ان کو مکمل آزادی دے

دی جائے۔ لیکن ابھی ترکی کی قسمت کا فیصلہ نہیں ہوا تھا اور جو دو تو سب کا فیصلہ ... کہ حکومت برطانیہ اور حکومت ہند کے سربراہوں کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا جائے تاکہ صلح نامہ ترکی کا مسودہ تیار کرتے وقت برطانیہ ممالک دیکھ بھال کر ... پر مسلمانوں کا خیال رکھے۔ اس ... سے ... مسلسل کوشش ... سے نام تبلیغ ہو رہی تھی۔ ملک بھر میں جلسے ہو رہے تھے جن میں ... مسلمان شریک ہوتے تھے ... ایک عظیم الشان جلسہ ... مسئلہ خلافت کے لئے 18 ستمبر 1919ء کو لکھنؤ میں منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے ہر طبقہ خیال کے علماء ... شریک ہوئے۔ ... اور کوئی طبقہ ایسا نہیں تھا جس کے نمائندے شریک نہ ہوئے ہوں۔ اس کانفرنس کے داعیان حسب ذیل ہیں:۔

(1) آنریبل نواب ذوالفقار علی خان	لاہور	(13) آنریبل محمد عبد القدوس	مدراس
(2) مسٹر آغا محمد صفدر	سیالکوٹ	(14) آنریبل مولوی فضل الحق	کلکتہ
(3) مولوی غلام محی الدین	قصور	(15) آنریبل مولوی [illegible]	بردوان
(4) مولانا ابوالوفا محمد ثناء اللہ صاحب	امرتسر	(16) مولوی مجیب الرحمٰن	کلکتہ
(5) آنریبل نواب سرفراز حسین خان	پٹنہ	(17) ڈاکٹر مختار احمد انصاری	دلی
(6) آنریبل خواجہ محمد نور	گیا	(18) آنریبل سید رضا علی	الٰہ آباد
(7) آنریبل سید نورالحسن	بانکی پور	(19) حکیم محمد اجمل خان	دلی
(8) آنریبل سر فضل بھائی کریم بھائی	بمبئی	(20) شیخ ظہور احمد بیرسٹر	الٰہ آباد
(9) حاجی جان محمد چھوٹانی	بمبئی	(21) مولوی محمد فاخر	فیض آباد
(10) آنریبل سیٹھ ابراہیم ہارون جعفر	پونہ	(22) مولوی محمد یعقوب	مراد آباد
(11) سیٹھ عبداللہ ہارون	کراچی	(23) آنریبل سید آل نبی	آگرہ
(12) آنریبل میر اسد علی خان	مدراس	(24) تصدق احمد شیروانی بیرسٹر	علی گڑھ

لہ چودھری خلیق الزماں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ کانفرنس ان کے ذہن کی پیداوار تھی PATHWAY TO PAKISTAN لیکن ان کے اس دعوے کی تائید کسی اور ذریعے سے نہیں ہوتی۔ یہ قرین قیاس بھی نہیں ہے کیونکہ اس وقت خلیق الزماں ایل ایل بی کے طالب علم ہی تھے اور اتنی بڑی کانفرنس کا اہتمام کرنا کسی طالب علم کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور پھر اس کانفرنس کے داعیوں کی فہرست بھی ان کے نام سے خالی ہے۔

(25) شیخ عبد اللہ وکیل — علی گڑھ
(26) حافظ محمد حلیم — کانپور
(27) حافظ ہدایت حسین — کانپور
(28) مولوی فضل الرحمن وکیل — کانپور
(29) شیخ شاہد حسین تعلقدار گدیہ — بارہ بنکی
(30) منشی نواب علی وکیل — بارہ بنکی
(31) مولوی سید نبی اللہ بیرسٹر — لکھنؤ
(32) منشی محمد نسیم ایڈوکیٹ — لکھنؤ
(33) منشی احتشام علی رئیس کاکوری — لکھنؤ
(34) چودھری نعمت اللہ وکیل — لکھنؤ
(35) ڈاکٹر محمد نعیم انصاری — لکھنؤ
(36) شیخ محمد علی حیدر خاں — لکھنؤ
(37) سید ظہور احمد وکیل — لکھنؤ

یہ بھی طے ہوا تھا کہ جملہ خط و کتابت سید ظہور احمد آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ کے نام ہونی چاہیے۔ یہ امر بذات خود ظاہر ہیں گے کہ اس آل انڈیا مسلم کانفرنس کی نوعیت کیا تھی۔ اس کے اشتہار کی سرخی تھی "مسلمانوں کے موت و حیات کا مسئلہ" اور اشتہار میں درج تھا:

"یہ امر محتاج بیان نہیں کہ سلطنت ترکیہ اور خود ترکی و قسطنطنیہ کا مستقبل کی بابت موجودہ کس قدر بیم و رجا کی حالت میں ہے۔ صرف یہی تجویز پر قناعت نہیں ہے کہ ان مقبوضات کو جو دوران جنگ حاصل کیے گئے ہیں ہمارے خلیفہ اور سلطان سے لے کر علیحدہ سلطنت مستقر کر دیا جائے بلکہ دیگر صوبہ جات اور تمام یورپین ترکی بجز قسطنطنیہ کے واسطے بھی تجویز ہے۔ یہ بھی زیر غور ہے کہ جو حصص اس طرح حاصل کیے جائیں وہ یورپ کی مسیحی طاقتوں میں سے کسی کے زیر انتظام کر دیے جائیں۔ جہاں تک اس حصہ ملک کا تعلق ہے جس کو سلطان کے قبضہ میں چھوڑ دینا قرار پایا اس میں بھی سلطان کے اختیارات شاہانہ محدود کر دینے کا خیال معلوم ہوتا ہے۔ ان تجاویز کو مجلس صلح نے جو پیرس میں اپنے اجلاس کر رہی ہے، ابھی حتمی طور پر منظور نہیں کیا ہے لیکن یہ خبریں ملی ہیں اور اس امر کا اندیشہ ہے کہ برطانیہ اعظم بھی اگر سب نہیں تو ان میں سے بعض تجاویز کا مؤید ہے۔ کافی پر زور معروضات اور شکایات اس مسئلہ کے متعلق حکومت برطانیہ کے ساتھ اور چند حامیان برطانیہ کی معرفت مجلس صلح کے سامنے بھی پیش کیے جا چکے ہیں مگر تا اختتام اب تک ان کا حسب دلخواہ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ تازہ ترین اخبار دنیائے اسلام کے لیے دل شکن ہیں۔

"اکثر لوگ جو اس تجویز کے حامی ہیں اس امر کو نظر انداز کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کے جذبات پر اس مسئلہ کا کس قدر گہرا اثر پڑے گا۔

"آل انڈیا مسلم لیگ ... [illegible] ... رہی ہیں ... کی
کی گئی ہے اور مختلف مقامات پر جلسے منعقد ہو چکے ہیں۔ ہم ... مسلمانان ہند کے
جو جذبات ... [illegible] ... کے
کے خلاف ... 21 ستمبر 1919ء ... [illegible] ... ہیں۔
... [illegible] ... مسلمانان ... کا ... [illegible]
ہو ... [illegible] ...
... [illegible] ... کے ... [illegible] ... کی سلطنت کے ... ہیں
اعلان کرتے ہیں۔"

یہ بات ذہن نشین رکھنی ... [illegible] ... تھے ... تھے اس لیے مولانا عبدالباری
کا صدارت کے لیے ... حالات ... [illegible] ... ہو۔

بعد ازاں ... جعفر نے صدارت ... خطبۂ صدارت کا ایک حصہ پڑھا اور
مطبوعہ خطبہ بانٹ دیا گیا۔

کانفرنس کا پہلا ریزولیوشن خلافت عثمانی کے تقدس کو برقرار رکھنے کی بابت مولانا سید محمد فاخر
الہ آبادی نے پیش کیا اور مولوی سید حسن صاحب آرزو نے اس کی تائید کی۔ دوسرا ریزولیوشن جس میں ترکی
سے عرب، شام، عراق، فلسطین، ... آرمینیا وغیرہ کو ترکی کی سلطنت سے علیحدہ کر کے غیر مسلم حکمراں
طاقتوں کے ماتحت رکھنے پر ... [illegible] ... عرب کو غیر مسلموں کی ... سے پاک
رکھنے پر زور دیا گیا تھا مولانا ... [illegible] ... نے پیش کیا اور شیخ عبداللہ صاحب وکیل
علی گڑھ نے اس کی تائید کی۔

تیسرا ریزولیوشن ... [illegible] ... ترکی ... [illegible] ... کے
... قسطنطنیہ میں دارالخلافہ ... کی بابت ... [illegible] ... نے ایک
پرزور انگریزی تقریر ... [illegible] ... ہوتے اس کا مفہوم ...

چوتھا ریزولیوشن ... [illegible] ... مولوی ... نے ایک
دردناک و رقت انگیز تقریر میں بیان کیا جس نے مسلمانوں کی گزشتہ عظمت ... کو تھوڑی دیر کے
لیے مجلس ماتم بنا دیا۔

پانچویں ریزولیوشن میں ... [illegible] ... ہز ایکسیلنسی وائسرائے

کو بھیجے جائیں کہ وہ اپنی سفارش کے ساتھ ان کو امپیریل گورنمنٹ میں ارسال فرمادیں۔

چھٹے ریزولیوشن کے ذریعہ 17 اکتوبر کا دن ہندوستان میں فقط ترکی کے لیے دعائیں مانگنے اور جلسے کرنے کی غرض سے معین کیا گیا۔

ساتویں ریزولیوشن میں بمبئی کی خلافت کمیٹی کے کام پر اظہار پسندیدگی کیا گیا اور اس کی شاخیں صوبوں اور مختلف مقامات پر قائم کرنے کی ضرورت جتائی گئی۔ آخر میں مولانا عبدالباری نے جناب صدر اور بیرونی ڈیلیگیٹوں کا ان کے وقت صرف کرنے پر شکریہ ادا کیا۔ اور جناب صدر نے چند اختتامی الفاظ میں اہل لکھنؤ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلسہ کی کامیابی پر اظہار مسرت کیا اور کامیابی مقصد کی دعا مانگی۔[1]

اس آل انڈیا مسلم کانفرنس کی کارروائی کو تفصیل سے درج کرنے کا منشا یہ ہے کہ حسب ذیل باتیں واضح ہو جائیں یعنی:۔

(1) تمام ہندوستان کے مسلمان خواہ ہز اکسلنسی کی کونسل یا ہز آنر کی کونسل کے ممبر ہوں، خان بہادر یا خطاب یافتہ امرا ہوں یا غریب ہوں، عالم ہوں یا کالج کا تعلیم یافتہ ہو کسی گروہ یا طبقہ خیال کا ہو یکساں طور پر مضطرب تھے اور سب نے متحد اور منظم ہو کر اپنی آواز بلند کی جو ہندوستان کے کل مسلمانوں کی آواز تھی۔

(2) کوئی راہ عمل سامنے نہ تھی اس لیے حکومت برطانیہ کی خوشامد اور عرضداشتوں اور وفود یا تقریروں اور جلسوں پر اکتفا کیا جا رہا تھا۔ صلح کانفرنس کے فیصلے کا بھی انتظار تھا لیکن اصل بات یہ ہے کہ کوئی راہ عمل سامنے نہ تھی اس لیے صرف فریاد و فغاں سے کام لیا جا رہا تھا مگر اسی فریاد و فغاں سے آئندہ راہ عمل پیدا ہونے والی تھی۔

جس جوش و خروش کا اظہار مسلمانان ہند نے 30 اکتوبر 1918ء کے التوائے جنگ سے چند ماہ کے اندر کیا اس کا خلاصہ بھی ہفتہ وار مشرق سے پیش کیا جاتا ہے جو گورکھپور سے حکیم برہم کی ادارت میں نکلتا تھا وہ برطانیہ کا عدم یکجہتی کار تھا لیکن خبریں سب دیتا تھا اور اپنی مخالفت کی سطح اونچی رکھتا تھا "ہمدرد" میں مولوی فاروق ایم۔ ایس دیوانہ نے اس کا نام "یک و مشرک" رکھا تھا۔ لطیفہ یہ تھا کہ "مشرق" کے سرورق پر انگریزی میں بھی نام لکھا رہتا تھا جسے "مشرک" بھی پڑھ سکتے ہیں۔ دوسرا نام انھوں نے "مخالف قبلہ" تجویز کیا تھا جو مشرق و مغرب کے تضاد کی وجہ سے بہت ہی دلچسپ تھا۔ بہر حال اس کا بیان مسلمانوں کے جوش و خروش کے بارے

---

[1] مشرق (گورکھپور)، مورخہ 11 و 25 ستمبر 1919

میں نہایت قابل اعتماد ہے۔ مخالف کی شہادت سے بہتر کون شہادت ہوتی ہے۔ مشرق کے مضمون کے جستہ جستہ فقرے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

یوم دعا

گورکھپور: بہ حسب تحریک آل انڈیا مسلم کانفرنس انجمن اسلامیہ نے 17 اکتوبر 1919ء کو جامع مسجد میں دعا کا انتظام در خلافت ترکی کے اظہار رنج و غم کو عملی صورت میں لانے کے واسطے 16 اکتوبر 1919ء بوقت 5 بجے شام ہندو مسلمانوں کا ایک جلسہ بصدارت منشی عبداللہ خاں شاکر علی صاحب مرحوم کی کوٹھی پر منعقد کیا جس میں بڑی تعداد میں ہندو بھائیوں نے شرکت کی اور اتفاق رائے سے طے پایا کہ 17 اکتوبر 1919ء بروز جمعہ ہندو اور مسلمان اپنے کاروبار بند کر دیں اور سلطنت ترکیہ اور خلیفۃ المسلمین کے دوام و بقا کے لیے دعائیں کریں۔ چنانچہ 17 اکتوبر کو تمام ہندو مسلمانوں نے اپنے کاروبار بند کر دیے اور محمد علی نگر اردو بازار، جعفرا بازار، صاحب گنج اور تمام شہر کے دوکانداروں نے اپنی اپنی دوکانیں تمام دن بند رکھیں۔ ہر مسجد میں بعد نماز جمعہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ دعائیں مانگیں۔ بازاں مسلمان اپنی اپنی مسجدوں سے نکل کر جامع مسجد میں مجتمع ہو گئے۔ مجمع اس کثرت سے تھا کہ یہاں تک تل رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ گورکھپور کے مسلمانوں نے دعا کے بعد ایک لاکھ بار درود شریف اور ایک ہزار بار استغفار کا ورد کیا اور سب ننگے سر اور بادیدۂ پرنم تھے۔ ایک کثیر تعداد میں ہندو بھائی بھی تشریف لائے۔ گورکھپور کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کی امامت جناب مولانا فاخر صاحب نے کی جو حسن اتفاق سے اسی روز پہنچ گئے تھے۔ بعد نماز دعائیں اس سوز و گداز سے کی گئیں کہ حاضرین کے قلوب بے چین ہو گئے اور بے اختیار چیخ چیخ اٹھے۔ کچھ ایسا سماں تھا جس کا اظہار لفظوں میں ناممکن ہے۔ اس کے بعد مولانا ممدوح نے ایک پر مغز اور پر اثر تقریر غایت دعا و خلافت پر کی۔ بعد ازیں عام مسلمانوں نے خلافت کمیٹی قائم کر کے قاضی فراست حسین صاحب کو پریسیڈنٹ اور جناب حکیم مولوی محمد محسن صاحب اور مولوی ظہور الدین صاحب ممبر میونسپل بورڈ کو سکریٹری منتخب کیا۔ وائسرائے ہند اور خلافت کمیٹی کو تار بھیجے اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کی تجاویز منظور کی گئیں۔ بابو بھگے چرن وکیل اور بابو جگدمبا پرشاد وکیل و ممبر میونسپل بورڈ، بابو بولکشور وکیل و ممبر میونسپل بورڈ اور دیگر ہندو معززین اور عوام نے بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا۔

اعظم گڑھ: یہاں یومِ خلافت نہایت شاندار کامیابی اور جوش سے منایا گیا۔ تمام مسلمانوں نے روزہ رکھا اور خلافت کی سلامتی کے لیے جامع مسجد میں دعا مانگی۔ اور آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کے ریزولیوشن منظور کیے گئے۔ تمام کاروبار ہندوؤں اور مسلمانوں نے بند کر دیا تھا۔ کچہریاں بھی ڈھائی گھنٹے کے لیے بند کر دی گئی تھیں۔

لکھنؤ: 17 اکتوبر 1919ء کو یومِ خلافت و دعا بڑی سرگرمی سے منایا گیا۔ ایک بجے نمازِ جمعہ شاہ محمد [illegible] کے [illegible] ہوئی جس میں دس ہزار مسلمانوں نے شرکت کی اور خلافت ترکی کے قیام کی دعا مانگی۔ دیگر مساجد میں بھی نماز و دعا ہوئی۔ بعد نمازِ [illegible] 5 بجے شام [illegible] کے پیچھے وسیع میدان میں شامیانے کے نیچے اور باہر لوگ جمع ہوئے۔ شامیانہ لبالب بھرا ہوا تھا جس میں ہندو حضرات بھی شامل تھے۔ مسٹر [illegible] صدرِ جلسہ نے پرجوش تقریر کی۔ تجاویز منظور ہوئیں اور طے ہوا کہ ان کی نقلیں وزیرِ اعظم انگلستان کو، وزیرِ ہند و وائسرائے اور لیفٹیننٹ گورنر صوبہ جات متحدہ کے پاس بھیجی جائیں۔

بنارس: بنارس میں ہندو مسلمانوں نے کاروبار بند رکھا۔ مسلمانوں نے روزہ رکھا اور دعائیں مانگیں۔ جامع مسجد میں نماز کے بعد دعا مانگی گئی۔ ایک مسجد میں مسلمانوں کا جلسہ کیا جس میں اہلِ ہنود بھی شریک تھے۔ تجاویز منظور ہوئیں اور ان کے نقول وزیرِ ہند کو بھیجنا طے ہوا۔ ایک ہندو نوجوان نے ایک مختصر تقریر میں ہندوؤں کی شرکت کا پرجوش ثبوت دیا۔

علی گڑھ: نہایت کامیابی کے ساتھ یومِ خلافت و دعا منایا گیا۔ تمام ہندوؤں اور مسلمانوں نے دوکانیں بند رکھیں۔ بعد نماز جمعہ مولانا صاحب نے نہایت موثر مناجات پڑھی اور دعا مانگی۔ اس کے بعد دیگر مقررین نے تقریریں ارشاد کیں جن سے متاثر ہو کر لوگ [illegible] ہو گئے۔ تجاویز مطابق آل انڈیا مسلم کانفرنس منظور کی گئیں۔ 77 اشخاص کا ایک تار وزیرِ اعظم برطانیہ و وزیرِ ہند وغیرہ کی خدمت میں ارسال کیا گیا۔

بنگال: یومِ خلافت تمام صوبہ بنگال میں کامیابی کے ساتھ منایا گیا۔ کلکتہ میں تقریباً تمام ہندوستانی دوکانیں بند کر دی گئی تھیں۔ نمازِ جمعہ کے بعد خلافت کے قیام و بقا کے لیے دعائیں مانگی گئیں۔ دوسرے دن ٹاؤن ہال میں مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع ہوا جس میں ہندو بھی شریک تھے۔ کثرتِ تعداد کی وجہ سے ہال سے باہر بھی جلسے ہوئے۔ صدارت ہال کے اندر آنریبل فضل الحق نے کی۔ تجاویز منظور ہوئیں۔

الٰہ آباد:۔ یوم خلافت نہایت خاموشی کے ساتھ منایا گیا۔ دوکانیں بند تھیں۔ مسجدوں میں دعائیں مانگی گئیں۔

دہلی:۔ دہلی کا [illegible] ذریعہ [illegible] مسلمانوں [illegible] کر کے [illegible] ہندو [illegible] دہلی سے ہندو اور مسلمان [illegible] سلطانِ ترکی [illegible] کی آزادی اور سلطنت ترکی کے حصے بخرے کرانے کی تجویز پر رنج و غم اور [illegible] کرتے ہیں۔ جامع مسجد [illegible] لال کنواں، چاندنی چوک، صدر بازار [illegible] کی سب دکانیں بند تھیں۔ مسجد میں نہایت خشوع و خضوع سے دعائیں مانگی گئیں۔ مسلمانوں کی گریہ و زاری [illegible] کی آواز ادھ گھنٹہ تک گونجتی رہی۔ پھر سب لوگ [illegible] ہو کر دعا میں مشغول ہوئے اور [illegible] ہوئے۔ پھر جلسہ ہوا جس میں ہندو مسلمان قریب ایک لاکھ کی تعداد میں شریک تھے۔ [illegible] نہایت [illegible] اور بے باکی سے تقریر کی۔ مولوی [illegible] صدیقی اور [illegible] علی نے بھی تقریریں کیں۔

بمبئی:۔ مسلمانوں نے یوم خلافت [illegible] کے ساتھ [illegible] ہندوؤں نے بھی شرکت کی۔ [illegible] بند تھیں۔ بمبئی کی [illegible] بند تھے [illegible] خاص طور پر بند تھے۔ [illegible] خانے بھی بند رہے۔ [illegible] میونسپل کمشنر [illegible] کے جلوس [illegible] صاحبوں نے صاف انکار کر دیا۔ ایک جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ہوئی۔ [illegible] لوگ جمع ہو گئے تھے [illegible] مسجد میں [illegible] تھے۔ دعا [illegible] ہندو مسلمانوں کے [illegible] طور پر دعا مانگی۔ [illegible] مسجد میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں حاجی جان محمد چھوٹانی صدر جلسہ کمیٹی نے اس جلسے کی صدارت کی اور [illegible] کے مطابق تجاویز منظور ہوئیں اور اس کی نقل وزیر اعظم صاحب [illegible] اور گورنر بمبئی کو تار سے بھیجی گئی۔ [illegible] کا شکریہ ادا کیا [illegible] ہندوؤں نے [illegible] میں دعا مانگی [illegible] اور جلسوں اور [illegible] نے جلوس میں شرکت کی۔ [illegible] ۱ــــہ

خلافت کمیٹی اور مہاتما گاندھی

23 نومبر 1919ء کو خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس دلی میں ہوا تھا۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس لکھنؤ کے بعد وزیر اعظم برطانیہ لائڈ جارج نے لارڈ میئر کی دعوت میں ایک دلخراش تقریر کی جس سے یہ اندازہ ہوا کہ وزیر اعظم سلطنت برطانیہ اب اپنے اور حکومت برطانیہ کے وعدوں سے انحراف کرنے والے ہیں۔ اس تقریر نے مسلمانوں میں بہت جوش بھر دیا اور فوراً 23 نومبر 1919ء کو خلافت کانفرنس کا ایک جلسہ دلی میں بڑی دھوم دھام سے مسٹر فضل الحق (بنگال) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہاتما گاندھی بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے ان کے خیر مقدم کا خاص اہتمام کیا گیا تھا اور اتنا ہجوم خلائق تھا کہ چاندنی چوک اور جامع مسجد کی راہ دو گھنٹے میں طے ہوئی۔ اس اجلاس میں صرف خلافت کمیٹی کے قائم مقام شریک کیے گئے جو تمام صوبوں سے آئے تھے البتہ مہاتما گاندھی کو ان کی عظمت کی وجہ سے شریک جلسہ کیا گیا تھا، اور کچھ ان ہندو بزرگوں نے بھی شرکت کی تھی جن کو مسلمانوں نے بطور نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ سندھ، رنگون، بنگال، بہار، صوبہ متحدہ وغیرہ سے جو ہندو آئے تھے ان کو مسلمانوں نے خلافت کمیٹیوں کی طرف سے بھیجا تھا۔ شیعہ حضرات بھی اس میں شریک تھے۔

مولانا محمد علی کی رہائی اور اجلاس کانگریس امرت سر

دسمبر 1919ء میں مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی بیتول جیل سے رہا ہوئے۔ اسی وقت امرت سر میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا اجلاس مقرر تھا اور اسی کے ساتھ خلافت کانفرنس بھی ہو رہی تھی۔ دونوں بھائیوں کو کانگریس کی طرف سے دعوت دی گئی اور دونوں بھائی براہ راست جلسہ گاہ میں پہنچے۔ مولانا محمد علی نے ایک طویل تقریر کی جو بے حد جذباتی اور پر اثر تھی۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا محمد علی کی شرکت گویا تمام مسلمانان ہند کی شرکت تھی کیونکہ وہ اپنے علم و فضیلت، اسلام نوازی، جرأت حق گوئی و بے باکی، عظیم ایثار و قربانی کی وجہ سے ہندوستان کے مسلم لیڈر بن چکے تھے۔ بیتول جیل سے رہائی کے بعد وہ جن جن اسٹیشنوں سے گزرے وہاں ان کا عظیم الشان استقبال کیا گیا۔ امرت سر سے ان کا بلاوا دلّی کا ہوا اور وہ دلی گئے تو پبلک امڈ گئی۔ اس طرح کے عظیم الشان مجمعے اور جلسے اس امر کی نشاندہی کرتے تھے کہ مسلمان سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار ہیں۔ اب مسلمانوں کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ خلافت مرکزیہ اسلامیہ کی بربادی، جزیرۃ العرب کی شکست و ریخت اور پوری دنیائے اسلام کی تباہی کی ذمہ داری برطانیہ پر ہے اور مسلمانوں کو اپنے ہندو بھائیوں سے مل کر ایک متحدہ قومی جمہوریہ برطانیہ کے اثر سے آزاد بنا لینی چاہیے۔ اسی سے برطانیہ کے غرور

اور اس کی طاقت کا توڑ ہو سکتا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس

۹ جنوری ۱۹۱۹ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ منعقد ہوا۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ انھوں نے ایک ایسا جامع، پُرمغز اور حق گوئی و بے باکی سے مملو خطبہ دیا جس سے تمام ہندوستان کی توجہ ادھر مبذول ہو گئی۔ لیکن اس کے بین السطور میں وہی جذبۂ وفاداری کارفرما ہے۔ گرچہ اس سے بغاوت بھی جھلک رہی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

"حضرات! ہم آج ایک نہایت نازک زمانہ میں اس جگہ جمع ہوئے ہیں۔ وہ جنگ عظیم جس میں مشرق و مغرب کی قومیں مقابل تھیں اور جدال و قتال کی وہ گرم بازاری تھی، ختم ہو گئی۔ لیکن باوجودیکہ جنگ ختم ہو گئی اب ہمارے تردّدات کی ابتدا ہے۔ کیسے کیسے اہم معاملات کا فیصلہ ہونے والا ہے اور صلح ہے جو کانفرنس صلح کے آخری فیصلے ایک طویل مدت کے لیے طے کر دیں گے کہ حیات انسانی کی تاریخ کیونکر لکھی جائے۔"

"مسلمانوں کے لیے یہ زمانہ خاص طور پر تشویش پیدا کرنے والا ہے۔ یہ صورت تیرہ سو برس کی تاریخ میں جو تردد سے خالی نہیں۔ مسلمانوں کو کبھی پیش نہیں آئی تھی جو آج نظر کے سامنے ہے۔"

"برطانوی حکومت نے ہمیشہ اپنے تمام بین الاقوامی معاملات اور تعلقات میں دنیا پر اپنے اس حق کو بار بار جتایا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ چونکہ شاہ انگلستان مسلمانان عالم کی سب سے بڑی تعداد پر حکومت کرتا ہے اس لیے برطانوی حکومت خاص طور پر توجہ کی مستحق ہے۔"

"لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حق کے ساتھ فرائض بھی ہوتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ملک معظم کی مسلمان رعایا اس امر کا مطالبہ کرے کہ وہ جن کے ہاتھ میں سلطنت برطانیہ کی قسمت کی باگ ہے ایسے ان فرائض کو ادا کریں جو مسلمانان ہند سے متعلق ان پر عائد ہوتی ہے۔"

اس کے بعد انیسویں صدی سے اسلام کی دنیوی طاقت کی تباہی اور یورپ کی پُرفریب پالیسی اور اسلامی سلطنتوں کے خلاف غارت گری اور قزاقی اور سفید فام اقوام کے کاموں پر حکومت کے جواز کے پرفن طریقوں کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اسلامی سلطنتوں کا وہ غیر منقطع سلسلہ جو کبھی بحر اوقیانوس کے سواحل سے سلطنت چین

سے محروم نہ ہو سکا۔ ترکی حکومت جو کہ [illegible] ترکی کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یورپ میں خود اسلام کے
شمالی ساحل جیسے الجزائر، تونس اور مراکش وغیرہ بھی کچھ عرصہ بعد سے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔
اور یہی ممالک فرانس، [illegible] اور [illegible] کی طرح [illegible] اور وسط ایشیا کی اسلامی
ریاستیں ختم ہو گئیں۔ 1907ء میں روس اور برطانیہ کے درمیان ایران کے [illegible]
آزادی کے متعلق جو معاہدہ ہوا اس کے الفاظ پر ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایران کی آزادی
ایک سیاسی مذاق سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ [illegible]
[illegible] کی بھی بالکل وہی حالت ہے [illegible] زندگی کو ترک کر کے یورپ کے طرز کو
تہذیب حالوں کی عصمت فروش رقاصہ پر اپنی بدویت نثار کر دیں۔

آج خود ترکی وہ لڑکی ہے جس نے صدیوں تک اسلام کی عزت کے لئے تلوار چلائی ہے
اس حالت میں ہے کہ [illegible] تسلیم کر لیا جائے۔ عالم اسلامی کے
لیے یہ نہایت تشویشناک وقت ہے۔

اس کے بعد خلافت کی حیثیت کے بارے میں ایک مختصر مگر جامع گفتگو کی ہے۔

"تاریخ میں یہ مسلّم ہے کہ 918ھ مطابق 1518ء میں بنی عباس کے آخری خلیفہ محمد
عباسی نے جو قاہرہ میں تھے سلطان سلیم [illegible] کے حق میں [illegible] خلافت [illegible] اسلامی
کی روحانی حکومت و سلطنت [illegible] سلطان سلیم عثمانی کی طرف منتقل کر دی۔ اس وقت
خلیفہ کے ساتھ ہی تبرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] اور حرمین شریفین کی کنجیاں سلطان
کے [illegible] کے سپرد کر دیئے گئے اور وہ [illegible] تبرکات [illegible] لے آئے۔ ساتھ ہی
محمد [illegible] نے خود بھی [illegible]۔ اس وقت سے سلطنت عثمانیہ کا ہر فرمانروا خلیفۃ المسلمین
سلطان [illegible] کے [illegible] خطابات سے یاد کیا جانے لگا اور اسی
وقت سے آج تک [illegible] مسلمان [illegible] کو امام روحانی [illegible] اور پیغمبر خدا
صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین [illegible] کے ترجمہ [illegible]
کے [illegible] جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں ان کے جو
القاب اور ان کی فتح و نصرت کے لئے دعائیں مانگی جاتی رہی ہیں۔ [illegible] جب ان کے
ہاں سلطان سلیم [illegible] وغیرہ [illegible] کے ساتھ [illegible] تسلیم [illegible] اور
حکم عام دے دیا کہ دعاؤں میں بھی ترکی سلطان کا نام بحیثیت خلیفۃ المسلمین شامل کیا جائے۔

اس دن سے آج تک کسی شریف مکہ نے کبھی تاباں روم کے تقدس کے متعلق اختلاف نہیں کیا۔
خود شریف حسین سلطان المعظم کو مسلمانوں کا جائز خلیفہ [illegible] تسلیم [illegible]
اطاعت کا اعتراف کرتا رہا اور وہ صد تک سلطان ترکی کی روحانی سیادت سے [illegible]
نہ ہو سکا لیکن جنگ یورپ کے دوران اس نے [illegible] نفسانی خواہشات کی وجہ
سے خلیفہ [illegible] کے خلاف جس کی خلافت کا وہ خود اور [illegible] عالم اسلامی [illegible]
علی [illegible] اس [illegible] حدوث [illegible] کی گئی ہے [illegible]
[illegible] کی [illegible] سے خدا اور رسول کے [illegible] کی [illegible]
کا ارتکاب کیا گیا ہے۔

اس کے بعد [illegible] ثابت کیا ہے کہ اگر کوئی خلیفہ سے بغاوت یا روگردانی کرے تو
اس سے جنگ لازم ہے اور اس کا قتل کر دینا [illegible] مقامات مقدسہ پر خلیفہ کے تقدس کے بارے میں تحریر ہے۔

"[illegible] اور [illegible] مقامات مقدسہ کی حفاظت سے خلافت کا صحیح اور اصلی
مفہوم سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ مقامات مقدسہ پر سلطان کا قبضہ کامل اور ناقابل انکار
ہو اور وہ مقامات مطلق غیر مسلموں کی مداخلت سے محفوظ و مامون ہوں۔

"[illegible] اسلامیہ کا [illegible] اور ان کا قول [illegible] ہے کہ سلطان سلیم کے [illegible]
آج تک آل عثمان نے مقامات مقدسہ کے متعلق اپنے فرائض بوجوہ احسن ادا کیے ہیں۔

"مسلمانوں کے اس دعوے کی صحت کا کہ ان کے سوا کوئی بھی اس معاملہ یعنی کون خلیفہ ہو، کا
تصفیہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ خود برطانوی گورنمنٹ کی طرف سے اعلان کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ
29 نومبر 1917ء کو لارڈ رابرٹ سیسل نے دارالعوام میں مسٹر کنگ کے سوال کا جواب
دیتے ہوئے جو صاف اور صریح الفاظ استعمال کیے ہیں وہ حسب ذیل اقتباس سے صاف
ظاہر ہوتے ہیں:-

"ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کبھی اس رائے سے منحرف نہیں ہوئی کہ خلافت کا سوال
ایسا سوال ہے جس کا تصفیہ صرف مسلمان ہی اپنی رائے سے کر سکتے ہیں۔[1]

اس کے بعد ڈاکٹر انصاری نے اس کی پرزور تردید کرتے ہوئے کہا کہ خلافت مقدسہ اسلامیہ سے عقیدت

---

[1] روئداد کارروائی دارالعوام جلد 99 صفحہ 3192

ہرگز وطن دوستی اور ہندو مسلم اتحاد میں حائل نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ہمارا یہ غیر متزلزل عقیدہ ہے کہ ایک سچا مسلمان ہمیشہ ایک سچا وطن پرست ہوگا۔ اگر ہم مسلمانانِ ترکی و ایران کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تو اس کو بھی ہمارے طرزِ عمل نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں کے حقوق کی حمایت کرتے ہیں، جو غیر ممالک میں مقیم ہیں، کسی سے کم نہیں۔ وہ حق پرست سیٹھ احمد محمد کاچھلیا ہندوستان ہی کا ایک مسلمان تھا جو جنوبی افریقہ میں عرصہ تک لڑا، اور آخر تک ہمارے حقوق کے اس شیر دل علمبردار مسٹر گاندھی کی جانشینی کا پورا حق ادا کرتا رہا۔"

اس خطبہ نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک آگ روشن کر دی اور غلامانِ فرنگ اخبارات اور افراد عرصہ تک بحث کرتے رہے۔ لیکن بہرحال اس خطبہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کس طرح مسلمانوں نے برطانیہ کا طوق غلامی پہن رکھا تھا۔ اور اب خیالات کے اس محبس سے نکلنے کی جدوجہد کرنے پر غور و فکر کرنے لگے تھے۔

اس کے بعد علمائے بنگال کا جلسہ چاٹگام میں زیر صدارت مولانا آزاد سبحانی ہوا جس کا ذکر آ چکا ہے اس میں پہلے پہل علمائے اسلام نے جس میں مولانا عبدالباری بھی تھے، لیگ میں شرکت کر کے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔

مسلم لیگ کے اس اجلاس میں بھی جس کا معرکۃ الآرا خطبہ ڈاکٹر انصاری کا آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں آپ دیکھیں گے کہ پہلا ریزولیوشن گورنمنٹ برطانیہ سے وفاداری کا پاس کیا گیا اور اس کے بعد اس کے خلاف احتجاج کیا گیا کہ برطانوی افواج نے بیت المقدس اور نجف اشرف پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور ایک تجویز اس بات کی منظور ہوئی کہ مسئلہ خلافت کے متعلق ملک معظم کی گورنمنٹ نے جو اعلان کیا تھا اس کا تصفیہ خود مسلمان ہی کر سکتے ہیں اس کا خیال رکھا جائے۔

عرب میں انگریزوں کی ریشہ دوانی

ادھر ہندوستان میں مسلمان پیشِ اضطراب و بے چینی کو گورنمنٹ برطانیہ کی وفاداری کے اعلان کے ساتھ منظرِ عام پر لا رہا تھا اور جلسے اور قراردادیں مرتب کر رہا تھا۔ ادھر انگریز بھی غافل نہیں تھا۔ وہ ایک پرفریب رائے عامہ کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی کی ریشہ دوانیوں سے اسی زمانہ میں رعایائے فلسطین کا وفد زیر سرکردگی شیخ سلیمان تاجی فاروقی مرتب ہو کر ملک حجاز شریف مکہ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے شریف حسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

"ہم نے دشوار گزار راستے صرف اس لیے طے کیے ہیں، ہم نے سمندروں کی تکلیفیں نہ صرف اس لیے جھیلی ہیں کہ ہم اس حکومت اسلامی کے قائم کرنے والے کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو روشن کریں۔ وہ بانی سلطنت جو تاریخ عالم میں پہلا عربی بادشاہ ہو گا، جس کے سر پر قوم عرب کے زندہ کرنے کا سہرا رہے گا، جس نے خوابگاہ عدم سے عربوں کو نکالا اور ان کی شجاعت و حمیت میں ایک نئی روح ڈالی۔"

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عمارت کی بنیاد ڈالی تھی اور جس کو عجمی ہاتھوں نے تباہ کر دیا تھا خدا آپ کو سلامت رکھے کہ اب حضور نے اس کو گرنے سے بچا لیا۔ بلکہ ہم نے یہ دور دراز سفر اس لیے گوارہ کیا ہے کہ ہم حضور والا پر یہ ظاہر کر دیں کہ فلسطین والے جو اس امت کے بہترین اعضا رہے ہیں اور جن کے دلوں میں آپ کی محبت ہے اور جو آپ کے احکام کی بجا آوری میں ہر وقت سرگرم ہیں اس بات کی التجا کرتے ہیں کہ ہمارے وہ ہمسایہ اقوام جنہوں نے امن و انصاف کے خیال سے ہمیں ترکوں کے ہاتھوں سے چھڑایا۔ خدا نخواستہ پھر ہمیں پہلے سے بھی زیادہ کسی اور مصیبت میں نہ پھنسا دیں۔"

اسی زمانہ میں شریف مکہ نے حسب ذیل منشور عالی کریم اخبار القبلہ میں شائع کیا جس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:-

"خداوند میں تیری حمد کرتا ہوں اور تیرے غیر متناہی انعامات پر تیرا شکر ہے اور ہدیہ درود و تحمید تیرے بندے خاتم الانبیاء رحمت جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے۔ پچھلے دنوں کثرت سے ایسے خطوط میرے پاس آئے ہیں جن میں امیر المومنین کے لقب سے میں یاد کیا گیا ہوں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ یہ ہی باعزت قوم کی خصوصیات میں سے ہے۔ مگر چونکہ یہ لقب اور خطاب لفظ خلافت کے ہم معنی ہیں جس کی بحث بار بار میرے فرامین میں اسی اخبار القبلہ کے ذریعہ شائع ہو چکی ہے۔ لہٰذا ان باعزت حضرات سے میری التجا ہے کہ اپنے عنایت ناموں میں مجھ کو انہی الفاظ سے یاد کریں جن پر عراق و یمن و حلب و شام کے عربوں نے میری بیعت کی ہے خدائے قادر و توانا کے انعام عام سے امید ہے کہ لوگوں کے خیالات اور ان کی امیدیں جو میرے متعلق ہیں وہ صحیح ہوں اور پوری ہوں اور توفیق الٰہی ہر حال میں ہمارے اور ان کے شریک حال رہے۔"

یہ تھا وہ کھیل جو انگریز کھیل رہا تھا۔ خلافت سے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا اس لیے امیر حبیب اللہ کو خلیفۃ المسلمین

جس کا نواب ذکی رہا تھا اور ادھر ترتیب مذکورہ شریف مکہ کا حدث "حسن طلب"۔ ورمنٹ فقہ کا ایک نادر نمونہ ہے۔ مولانا محمود حسن کے پاس ایک شخص جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے وقت عربی ساتھ پیش کرایا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے نفرت ہے کیونکہ یہ غداروں کا لباس ہے۔

صلح کانفرنس لندن

24 جنوری 1919ء سے لندن میں صلح کانفرنس نے کام شروع کر دیا تھا جس میں دنیا کا مستقبل زیر غور تھا۔ حقوق فیصلہ ہونا تھا۔ اس کانفرنس سے پہلے مجلس اقوام کی تجویز ہو چکی تھی۔ اس صلح کانفرنس کے صدر موسیو کلیمنشو وزیر اعظم فرانس تھے اور بڑی بڑی سلطنتوں کے وزرائے اعظم اور ماہرین کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ طے ہوا تھا کہ بڑی سلطنتوں نے بیت نمائندوں کے بھیج رکھے تھے ورنہ کلیمنشو نے چھوٹی سلطنتوں کو نمائندے بھیجنے کی اجازت دی تھی۔ بڑی سلطنتوں میں ان کو بھی شامل کیا گیا۔ صلح کانفرنس میں مختلف کمیشن قائم کرنے کی بھی تجویز کو لوگوں نے پیش کی تھی۔

موسیو کلیمنشو کے اس حکم سے چھوٹی قوموں میں کچھ اختلاف پیدا ہوا اور مسٹر ہائمنز بلجیم کے وزیر خارجہ نے ... کہ دو کمیٹی میں ہونے چاہئیں اور ایک ایک نمائندہ ... خیالات ... کمیٹیوں میں ہو ... بڑی سلطنتوں کے نمائندوں کا ... ایک نمائندہ مجلس اقوام کی کمیٹی میں ہونا چاہیے۔ کینیڈا کی طرف سے کہا گیا کہ چھوٹی قوموں میں ایک نمائندہ کی حیثیت سے ہمارے ساتھ سلوک ... دولت عظمی کی نسبت ... زیادہ ضروری ہے۔ سرویا کی طرف سے کمیٹی میں بلجیم سے ... کا مطالبہ کیا گیا۔ رومانیہ کی طرف سے کہا گیا کہ اس کے نمائندے کمیٹی میں ہونے چاہئیں۔ پرتگال کی جانب سے کہا گیا کہ ... اور ... کی کمیٹی میں اس کا نمائندہ ہونا چاہیے۔ چیکوسلواکیہ کی طرف سے کہا گیا کہ ... کمیٹیوں میں ہمارے نمائندے ہوں۔ رومانیہ کی طرف سے کہا گیا کہ ... بندرگاہ اور ... راستوں کی کمیٹیوں میں ... نمائندے لیے جائیں۔ سیام نے کہا کہ کمیٹیوں میں جو معاملات طے ہونے والے ہیں ان سے ... چین نے مجلس اقوام میں ایک نمائندہ ... برطانوی قوت کے ساتھ ... ہیں۔

موسیو کلیمنشو نے ... کہ دولت عظمی کے کل ... میں ... جنگ ... شامل ہوئے ہیں ... کا ... فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ... چھوٹی قوموں ... ٹال دیا۔

ہندوستان انگلستان میں خوشخوار گیا اور اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ بھی وہ صلح کا دور [illegible] جس سے مسلمان [illegible] کی [illegible] لگائے ہوئے تھے جس میں فیصلہ کا حق [illegible] اور [illegible] طلب کیے جا رہے تھے جو مسلم لیگ نے [illegible] کو [illegible] نے ہیں۔ کہ فوج میدان میں [illegible] تب [illegible] ہوئے [illegible] سکتے ہیں کسی کی مدد کی [illegible] ضرورت تھی تو یہ خط ہندو مسلمان [illegible] آگے آئے گا [illegible] مسلمان [illegible] لیے [illegible] صلح کا دور [illegible] مطالب حاصل کیا جا سکتا ہے۔

قرارداد [illegible] کی [illegible] سید حضرت اور [illegible] ہندوستان [illegible] کی [illegible] [illegible] کو [illegible] کرتے ہیں۔

مجلس [illegible] معاہدات کو مجلس اقوام کے ذریعہ امن [illegible] کا [illegible]

[illegible]

مسٹر ولسن [illegible] 1912ء میں [illegible] کی طرف سے [illegible] کے صدر منتخب ہوئے۔ 18-1914ء کی جنگ میں [illegible] 1916ء میں [illegible] 1917ء میں [illegible] 8 جنوری 1918ء کو [illegible] چودہ نکات [illegible] کا [illegible] چودہ نکات [illegible] کے [illegible] درج کیے جاتے ہیں۔

[illegible] کے [illegible] کو [illegible] کی [illegible] کا [illegible] کے [illegible] سے کہ اس کے عظیم مقاصد

اور لیبورٹریوں میں لوگوں کا مطالعہ اور لیکچروں کے کمروں میں حاصل ہونے والی علمی ترقیاں اس وقت تہذیب کی بربادی کے لیے کام میں لائی جا رہی ہیں۔ اس جنگ میں شریک ہوتے ہوئے امریکہ نے ایک لمحہ کے لیے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ وہ یورپ' ایشیا یا دنیا کے کسی حصّہ کی سیاست میں مداخلت کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس کا خیال تھا کہ ساری دنیا اس سے واقف ہے کہ صرف ایک ہی مقصد ہے جو اس جنگ میں امریکہ کی شرکت کا باعث ہوا ہے۔ یہ مقصد ہر جگہ اور ہر قسم کے بنی نوع انسان کی آزادی اور ان کے ساتھ منصفانہ برتاؤ ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔

مسٹر ولسن دنیا کو دھوکہ دے رہے تھے یا خود فریب خوردہ تھے؟ یہ بحث ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے مگر امریکہ کا موجودہ رویہ کی روشنی میں مندرجہ بالا بیان کس قدر دلچسپ ہے۔ بہ حال لائڈ جارج' کلے مینشو اور دیگر لوگوں نے زبانی تائید کی اور کرتے ہی کیا۔!

پانچواں باب

تاج برطانیہ کی وفادار رعایا کی عرضداشتیں

انجمن مؤید الاسلام فرنگی محل کا جلسہ

فروری ۱۹۱۹ء کے اوائل میں انجمن مؤید الاسلام فرنگی محل کا ایک جلسہ زیر صدارت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل میں منعقد ہوا جس میں طے کیا گیا کہ احکام اسلامیہ کی رو سے بجز موجودہ سلطان ترکی کے کوئی دوسرا خلیفہ نہیں اور شریعت اسلامیہ کی رو سے خلافت کے باب میں ملت محمدیہ کے سوا غیر مسلم کی رائے بے اثر ہے۔ مسلمانوں نے جہاں کہیں اس بارے میں آواز بلند کی ہے وہ شریعت اسلامیہ کے بالکل مطابق ہے اور یہ جلسہ اس کی تائید کرتا ہے۔ یہ بھی طے ہوا کہ یہ جلسہ اس تجویز سے اتفاق کرتا ہے کہ ایک فتویٰ احکام خلافت سے متعلق حدود عرب و ممالک اسلامیہ کے علماء کرام سے دستخط کرا کے اور مشیر قانونی سے مشورہ کرکے گورنر جنرل اور وزیر ہند کی خدمت میں روانہ کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ جو خیالات اسلامی انجمنوں نے ظاہر کیے ہیں وہ احکام شریعت کے بالکل مطابق ہیں اگر کوئی شخص اس کے خلاف حکم ظاہر کرے تو وہ شریعت اسلامیہ کا حکم نہ سمجھا جائے اور حکومت کو غلط فہمی نہ ہونے پائے اس جلسے کی تجویز[عہ] لفظ بلفظ ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

> "یہ جلسہ اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے کہ مذہبی رواداری ہماری بنائے اطاعت ہے حضور ملک معظم کی گورنمنٹ سے اظہار وفاداری کرتے ہوئے یہ جتاتا ہے کہ ممالک اسلامیہ کا عموماً اور بلاد مقدسہ کا جس میں قسطنطنیہ بھی داخل ہے خصوصاً تحت خلافت سے وابستہ رہنا مذہب اسلام کی رو سے ایک نہ بدلنے والا حکم ہے لہٰذا اس اسلامی حکم کی رو سے مجلس ہذا گورنمنٹ برطانیہ سے پورے زور کے ساتھ مستدعی ہے کہ وہ اپنا رسوخ وار صلح کانفرنس

میں بایں عرض مسلمان کرتے کہ چونکہ اس جنگ میں سلطان معظم سے علیحدہ ہو گئے
ہیں وہ حسب سابق حقوق کے ساتھ سلطان معظم کو واپس کر دئے جائیں ورنہ بغیر اس کے
صلح مسلمانوں کو مطمئن نہیں کر سکتی ہے۔"

ونیز مسٹر ایسکوتھ وزیر اعظم کو بہت یقین تھا کہ صلح کانفرنس میں وہ اپنے اثرات مسلمانوں کے موافق استعمال کرے گا اور اپنے وعدوں کو پورا کرے گا۔ یہاں بھی موجود تھا جو ترکی کے متعلق استقلال مسلم لیگ کانفرنس میں نظر آتا تھا اور اس کے ساتھ وہی بے چینی وہی اضطراب اور وہی تلاش راہ عمل بھی ان سطور میں نمایاں ہے۔

مقیم لندن حضرات کی عرضداشت

یہی طریق کار لندن میں ہز ہائی نس سر آغا خان، رائٹ آنریبل سید امیر علی، مسٹر محمد علی، مارماڈیوک پکتھال، آنریبل مسٹر علی بیگ، مسٹر عبد الستار خان بہادر، یوسف علی، مسٹر شفیق و مسٹر ایچ اے اصفہانی وغیرہ کا بھی تھا۔ ان لوگوں نے بیس دیگر حضرات کے ساتھ ایک میمورنڈم مسٹر اسکوئتھ وزیر خارجہ حکومت برطانیہ کو دیا تھا جس کا جواب مسٹر بالفور نے نہایت خشک دے دیا تھا۔ اس میمورنڈم میں لکھا گیا تھا کہ:

(1) ہم ذیل کے دستخط کنندگان مسلمان رعایائے حضور ملک معظم، ادب کے ساتھ حضور ملک معظم کی گورنمنٹ کے سامنے یہ معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے ان تجاویز کو جو کہ حال میں مختلف ذمہ دار حلقوں سے قسطنطنیہ کے مستقبل کی نسبت مختلف اخبارات میں پیش کی گئی ہیں نہایت تردد و تشویش کے ساتھ پڑھا ہے۔ وہ تجویزیں اس قسم کی ہیں کہ قسطنطنیہ موجودہ حکمران کے ہاتھ سے نکال لیا جائے اور کئی عیسائی حکومتوں یا کسی ایک عیسائی سلطنت کے ہاتھ میں اس کا انتظام دے دیا جائے۔ اس سے قبل از قبل ہم لوگ یہ ضروری اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے کا مطلب ان قومی اصولوں کو توڑنا ہوگا جن کی بنا پر اتحادیوں نے جنگ میں شرکت کی ہے اور اس سے نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں تشویش اور بے چینی کے جذبات پیدا ہو جائیں گے۔

(2) چار صدی کے اندر قسطنطنیہ میں ایک عظیم الشان مذہب پیدا ہو گیا ہے اور اب بہ اعتبار رہے وہ ایک اسلامی شہر ہو گیا ہے۔ تمام شہر اسلامی درس گاہوں اور ایک ایک چپہ اسلامی یادگاروں سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں زیادہ تر آبادی ترکی النسل لوگوں کی ہے جو مذہباً مسلمان

ہیں جس کا کچھ عرصہ قبل دارالعوام میں اعتراف کیا گیا تھا۔

(3) وزیر اعظم نے کچھ عرصہ قبل اعلان کیا تھا کہ ترکوں کی حکومت کی حالت برقرار رہے گی اور قسطنطنیہ ان کے مقبوضات کا دارالسلطنت رہے گا۔ مسلمان جنھوں نے سلطنت کی حمایت میں جانیں دی ہیں اسے مدت ہے اب اس امید کے قائم رہنے کے مجاز ہیں کہ ترکی خود مختاری کے اصول کا ترکی کے مقبوضات پر بھی اطلاق کیا جائے گا جیسا کہ یورپی قوموں کے ساتھ ہو گا۔ ترکی اور سلطنت عثمانیہ کی تو اس بات پر نظر رکھیں گا اور مسلمان بھی مطالبہ کریں گے کہ ترکی اعلان پر نظر ثانی کی جائے اور وہ برقرار رہے اور موقع پر ان کے دوستی ہمدردی ثابت ہو سکے اس کا یہ مطلب ہو جائے کہ ترکی کے ساتھ سلوک پر دشمنی نہ ہو بلکہ ایک سدا کی سلطنت ہے۔

(4) ایشیا میں شام کی تمام مقدس جگہ لیکن اور جنوب میں جن کی مجموعی اندازاً ایک کروڑ نوے لاکھ 12 ہزار ترکی آبادی ہے جو سب ترک ہیں اور بیشتر مسلمان۔ تھریس کی بھی بالکل یہی حالت ہے۔ وہاں بھی زیادہ تر ترکوں کی آبادی ہے۔ یہ سب کمال درجہ ضروری ہے کہ کل سلطنت مع قسطنطنیہ جو اس کا دارالسلطنت ہے ترکی قوم کے ہاتھ میں وزیر اعظم کے حلف کے مطابق رہنے دی جائے۔

علمائے ربانی بالخصوص مولانا محمود حسن ان حالات سے زیادہ حیثیت ور دیدہ وری رکھتے تھے جو انگریزوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے اور ان سے کوئی امید نہیں رکھتے تھے۔ لیکن یہ تحریک خلافت کا سورج طلوع ہونے کا وہ وقت آنے والا ہی تھا جب یہ کہا جا سکے کہ:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا

وزیر ہند کا جواب

فروری 1919ء کے آخر میں وزیر ہند نے مسلم لیگ کی چند تجاویز کا جو ان کے پاس بھیجی گئی تھیں جواب دیا اس کا متن حسب ذیل ہے:

"مسئلہ خلافت کے بارے میں ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کی رائے وہی ہے جس کا وہ بارہا اعلان کر چکی ہے اور وہ اس رائے پر قائم ہے کہ خلافت کا مسئلہ اس قسم کا ہے کہ جس کا فیصلہ صرف مسلمانوں ہی کو بلا مداخلت غیرے کرنا چاہیے۔ میں اس موقع پر ان خیالات کی تو

مسلم لیگ کے ایک ریزولیوشن میں جو خطاب کیے گئے ہیں کہ گورنمنٹ نے اپنے ان وعدوں کی جو مقامات مقدسہ کے بارے میں کیے گئے تھے خلاف ورزی کی ہے، میں بڑے زور سے تردید کرتا ہوں جن ایام میں کہ ترکی کی فوجیں ان علاقوں پر جہاں کہ مقامات مقدسہ واقع ہیں قبضہ کیے ہوئے تھیں اس وقت نہ صرف اس وعدے کی لفظ بلفظ پابندی کی گئی بلکہ اس قسم کے ذرائع اختیار کیے گئے اور کیے جا رہے ہیں کہ ہمارے قبضہ کے ایام میں ان مقامات مقدسہ کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے۔ آخر میں یہ ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جب اہم معاہدات کا صلح کانفرنس میں فیصلہ کیا جائے گا ان کے متعلق ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے جو خیالات ہیں برطانوی کی گورنمنٹ ان کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور وہ گورنمنٹ ہند کو یہ اعلان کرنے کی اجازت دیتی ہے کہ برطانیہ کے قائم مقام صلح کانفرنس میں ان خیالات پر پوری توجہ فرمائیں گے۔

مسلمانوں کو فریب تازہ کھانے کا ایک اور موقع ملا۔ البتہ وہ اس بات سے بہت بددل ہوئے کہ مسلمانان ہند کو صلح کانفرنس میں نمائندگی نہیں دی گئی جس کا حسب مطالبہ حق کیا تھا۔

انگریزی حکومت غرور کے نشے میں چور تھی۔ ہم دکھلا چکے ہیں کہ مسلمان ہر جگہ ہی وفاداری کا اعلان کر کے حرف نہ برداشت نہیں کرتے تھے لیکن جلسوں کو بند کرنا" ۱۴۴ ضابطہ فوجداری نافذ کرنا" یا دفعات جلسہ میں گورا فوجوں کا مشین گن کے ساتھ خائف وہراساں کرنے کے لیے مارچ کرنا روزمرہ کا دستور تھا۔ لیکن اس کے باوجود خلافت کمیٹی کی شاخیں ہر صوبہ میں اور صوبوں کی شاخیں ضلعوں میں قائم ہو چکی تھیں۔ شاید ہی کوئی قصبہ یا قریہ ایسا ہو جہاں سے خلافت مقدسہ اسلامیہ کے لیے آواز بلند نہ ہوئی ہو۔ کانگریس حکومت اور غلامان ازلی بھی خلافت اسلامیہ کی بقا اور اماکن مقدسہ کے تحفظ کی زبانی تائید کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ البتہ وہ پر امن طریقوں سے برطانیہ کے وعدوں کے ایفا پر تکیہ کرنے کی تعلیم دیتے تھے اور بار بار مصلح قوم بن کر دہراتے تھے کہ تو دخواہ شورش سے کوئی فائدہ نہیں اس سے قوم نقصان میں پڑ جائے گی۔ وہ تو یہ کہتے تھے کہ برطانیہ کے وعدوں پر کچھ بس کب چاہتے ہیں۔ کہتے تھے کہ ہم کو صرف دعا کرنی چاہیے۔ وہ دن دور نہیں تھا کہ یہ سب وقت کے جوش کے سیلاب میں بہہ جانے والے تھے۔

یہودی اور فلسطین

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے انگریزوں نے یہودیوں کو فلسطین میں وطن دینے کا وعدہ کر کے ان سے ایک خطیر رقم جنگ عظیم میں خرچ کرنے کے لیے حاصل کی تھی اور یہودی اندر ہی اندر اپنا کام کر رہے تھے جیسا

اس سے پہلے ذکر ہو، حکومت برطانیہ نے ایک رائل کمیشن بھی اس بارے میں بٹھایا تھا لیکن یہ سب باتیں محض دفع الوقتی تھیں۔ یہودی خوب جانتے تھے کہ فیصلہ ان کے موافق ہوگا جس کی بہت سی وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ امریکا پر یہودیوں کا بڑا اثر ہے اور صدر کے انتخاب میں وہ ہمیشہ ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ دوسرے برطانیہ کی جو پالیسی خلافت اسلامیہ کو تباہ کرنے اور عرب کو ریزہ ریزہ کرنے کی تھی اس کی روشنی میں یہودیوں کو فلسطین میں وطن دے کر ایک نہ ختم ہونے والی جنگ میں کل عرب کو مبتلا کر سکتے تھے تاکہ ان کو یہ منظم ہو کر باشعور فیصلہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ جب اسرائیل حکومت بنی تو سابق صدر جمہوریہ نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلسل جنگ جاری رہے۔ چنانچہ یہودیوں کو جو اطمینان تھا اس کا اندازہ ایک بیان سے ہوگا جو پیرس کے ایک اخبار مورخہ 2 مارچ 1919ء کے ذریعہ شائع ہوا۔ اس میں لکھا تھا: "یہودیوں نے اعلان کیا ہے کہ ان کو اطمینان ہے کہ یہودیوں کے جو مطالبات صلح کانفرنس میں پیش ہوئے ہیں وہ حسب خواہش طے پائیں گے۔ فلسطین میں ایک یہودی قومی حکومت بن جائے وہ تسلیم کر لیا جائے گا۔ تفصیلات ابھی طے نہیں ہوئیں۔ فرانس نے بھی یہودی مطمح نظر کا ساتھ دیا ہے۔ جب یہودی کونسل نے امریکا سے یہ درخواست کی تو مسٹر ولسن نے ایک پیغام بھیج کر یہودیوں کو ان کی کامیابی پر مبارک باد دی۔

فرانس کے نمائندے مسٹر تارڈیو نے بیان کیا کہ فرانس کی بھی یہی خواہش ہے کہ برطانیہ عظمیٰ اقوام کی طرف سے فلسطین میں ایک حکم بردار طاقت ہو کر رہے۔

اخبارات کے تبصرے

اس وقت کے اخبارات کا تبصرہ جو شروع سے بہت تک ہوا ذیل میں اس لیے درج کیا جاتا ہے کہ ایک ایک واقعہ کی تفصیل بیان کرنا محال ہے۔ اور اس سے عیاں ہوگا کہ ہم کو برطانیہ کی وفادار رعایا ہونے کا خیال عام تھا۔

> "ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک ہیجان برپا ہے جس میں علمائے اسلام سے لے کر عام باشندگان ملک تک نے مسائل حاضرہ پر توجہ کی ہے چنانچہ لکھنؤ، کلکتہ، دہلی، مدراس، بریلی اور بہت سے شہروں کے بعد حیدرآباد، مسقط اور بمبئی میں تو جلسے علماء اور فضلاء کے ہوئے ہیں، انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانان ہند مسئلہ خلافت، مسئلہ بقائے ترکی، مسئلہ بلاد مقدسہ کے متعلق ہم آواز ہیں۔ بمبئی کے جلسے میں جو ریزولیوشن پیش ہو کر پاس ہوئے ہیں ان میں خلافت کے بعد مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، عتبات المقدسہ، بیت المقدس

کردے معنی: کاظمین تیرچھیں معدرتیف۔ بقائے سلطنت ترکی اور قسطنطنیہ کا ترکوں کے قبضہ میں رہنا سب پر بحث ہوئی اور بالاتفاق یہ طے پایا کہ سلطنت ترکی کے زیر اثر سب کو رہنا چاہیے اور صلح کی کانفرنس میں جو تقسیم کی جائے اس میں یہ لحاظ رکھا جائے کہ جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ جن کے حدود اسلامی قوانین نے معین کر دیے ہیں، ترکی سلطنت کے زیر قبضہ رہیں۔ کیونکہ سلطان ترکی خلیفۃ الرسول ہیں۔ چونکہ سلطنت برطانیہ سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے اس لیے وزرائے برطانیہ کو لازم ہے کہ مستقل صورت سے اس بات کی کوشش کریں کہ سلطنت برطانیہ اور اسلامی حکومتوں کے درمیان تعلقات سیاسی قائم رہیں اور اتحاد و اتفاق کی کوشش عہد و پیمان کے اصول پر مبنی ہو۔

ان سب تحریکات میں بمبئی کے بڑے بڑے مسلمان مثلاً مولوی رفیع الدین صاحب بیرسٹر مولوی عبدالرؤف صاحب، مسٹر محمد میاں صاحب، مسٹر رحمت اللہ کریم بھائی، حکیم مولوی سید محمد یوسف صاحب اصفہانی، مرزا علی محمد خان صاحب، مسٹر صدر الدین عبداللہ، مسٹر عبداللطیف صاحب جان محمد تریا، مولوی عبدالمنعم صاحب خطیب جامع مسجد بمبئی، کرنل مسٹر دیوجی کانجی، مسٹر ہادی طیب جی، مسٹر محمد حسن صاحب، مسٹر سید غلام عسکری محمد رفیع اور مسٹر حاجی عبدالکریم وغیرہ شریک تھے۔ اس جلسہ کے صدر میاں جان محمد چھوٹانی تھے۔ اس جلسہ میں ایک بڑا اور اہم ریزولیوشن یہ پیش کیا گیا کہ صلح کی کانفرنس میں مسلمانان ہند کے جذبات کا اظہار کر دیا جائے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی قائم مقام شریک کیا جائے۔

"علمائے سندھ کے جلسہ میں جناب مولوی خیر امام الدین صدر تھے۔ اس جلسہ میں بھی اسی قسم کے ریزولیوشن پیش کیے گئے اور جلسہ میں بہت جوش تھا۔ حضور وائسرائے کو تار دیا گیا کہ جزیرۃ العرب حسب دستور برطانوی گورنمنٹ چاہتی ہے:

اس میں آگے چل کر مسلمانوں کی وفاداری کا تذکرہ ہے اور حضور وائسرائے کی مدح کر کے کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کو صلح کانفرنس میں نمائندگی دی جائے۔ اگر ہم عالیجناب مسٹر مانٹیگو صاحب بہادر کی رائے تسلیم کریں کہ ہمارے حقوق کی حفاظت کا انتظام بھی صلح کی کانفرنس میں ہو رہا ہے تو اس میں ذرا شک نہیں کہ تمام مسلمانان دنیا تاج برطانیہ کے سامنے سر عقیدت جھکا دیں گے کہ ہم نے جس انصاف اور عدل کے لیے جنگ کی تھی اس

کا لحاظ ضرور ملحوظ رکھا جائے گا جو وقتاً فوقتاً مسلمانان عالم کو اس بات کی شکایت کا موقع نہ
کا انکار ہوسکے گا کچھ کیا گیا ہے۔

تمام دنیا میں وفد لے جانے کا خیال

بمبئی کی ایک کانفرنس میں یہ تجویز منظور ہوئی تھی کہ ایک عام کانفرنس اسلامی ملکوں کی دلی میں منعقد کی جائے جو تمام مسائل حاضرہ پر گفتگو کرکے ایک وفد مرتب کرے اور وہ وفد تصفیہ کرنے والوں کے پاس جانا ہو کر مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرے اور اسی وقت مولانا عبد الباری، نواب [illegible] جنگ اور ڈاکٹر انصاری نے ایک وفد مسلمانوں کا ایسے ممالک اسلامیہ میں جانے کی تجویز پیش کی تاکہ ہر مقام کے مسلمانوں کی حالت کا اندازہ کریں اور دیکھیں کہ مسلمانوں کی کیا حالت ہے۔ اور مسلمانان عالم کے جذبات کا کیا عالم ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تمام دنیائے اسلام کو متفق کرکے صلح کانفرنس پر دباؤ ڈالا جائے۔ یہ وفد مرتب نہ ہوسکا اور رہ گیا لیکن اس سے بھی وہی نتائج مرتب ہوتے ہیں جو ہم پہلے بیان کر آئے ہیں یعنی مسلمانوں کا عظیم اضطراب اور اب بھی صلح کانفرنس سے انصاف کی امید۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تجویز

ندوۃ العلماء نے اپنے ہنگامی جلسے میں حسب ذیل تجویز منظور کی۔

عه 9 "ندوۃ العلماء کا یہ جلسہ جو علماء کا قائم مقام ہے اپنا مذہبی فرض خیال کرتا ہے کہ یہ ظاہر کردے کہ بروئے احکام مذہبی یہ ضروری ہے کہ جملہ مقامات مقدسہ حجاز، بیت المقدس، کربلا، نجف اشرف وغیرہ کہ جن سے تمام عالم کے مسلمانوں کے مذہبی تعلقات وابستہ ہیں براہ راست خود مختار اسلامی حکومت کے قبضہ اقتدار میں رہیں۔"

عه 10 "ندوۃ العلماء کا یہ جلسہ جنگ کے ختم ہونے اور دنیا کو از سر نو امن و امان کی نعمت حاصل ہونے پر تہہ دل سے شکر گزار ہے اور امید کرتا ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ جس کے زیر سایہ دس کروڑ مسلمان آباد ہیں خاص کر ایسے اسباب و وسائل اختیار کرے گی کہ مسلمانوں کے جذبات صحیح و صاف طور پر صلح کانفرنس میں ظاہر ہو جائیں اور مسلمانوں کے مصالح کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے تاکہ آئندہ زمانہ میں بھی دنیا کو امن و امان نصیب ہوسکے۔"

دارالعلوم دیوبند کا رویہ

دارالعلوم دیوبند کے اکابرین اپنی بصیرت و فراست سے انگریزوں کو دینی دشمن قرار دے کر اتحاد و تحفظ خلافت اسلامیہ اور آزادی ہند کے لیے زمانہ دراز سے عملی جد و جہد کر رہے تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی ان کے پیر حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی و ان کے سینکڑوں اعوان انصار اسی دھن میں سر دھڑ کی بازی لگا چکے تھے۔ اس صدی کے سب سے بڑے قائد شیخ الہند مولانا محمود حسن ابھی مالٹا میں نظر بند تھے سب کی نگاہیں ان پر لگی تھیں۔ درحقیقت دیوبند ہی اس جذبہ اظہار وفاداری سے مستثنیٰ تھا۔

وفد خلافت اور مہاتما گاندھی

گاندھی جی 1918ء میں سیاست ہند پر چھا رہے تھے۔ انھوں نے ان لوگوں کو چن لیا تھا جن سے ان کو معاونت حاصل کرنی تھی۔ چنانچہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد سے رانچی میں ملنے گئے تھے مگر حکومت نے ملاقات کی اجازت نہیں دی۔ وہ برابر علی برادران سے رابطہ قائم رکھے رہے تھے۔ چنانچہ جب وہ دو ہفتہ کے لیے چھندواڑہ سے رامپور آئے تو گاندھی جی فوراً ان سے رامپور جا کر ملے۔ مولانا عبدالباری کے یہاں فرنگی محل میں تو برابر ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ گاندھی جی کے کام کا قاعدہ ہی یہ تھا کہ وہ چیدہ چیدہ لوگوں کو چن لیتے تھے اور ان کو ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ آگے چل کر جب انھوں نے ترک موالات کی تحریک ہندوستان میں عالمگیر پیمانہ پر شروع کی تو پنڈت موتی لال نہرو، حسن امام اور سی آر داس کو چنا۔ حسن امام تو پوری طرح ساتھ نہ آسکے کیونکہ اصولوں سے اتفاق کرتے ہوئے وہ اپنی وکالت چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے لیکن اپنی لڑکی کو اس کام کے لیے دے دیا اور موتی لال اور سی آر داس نے انگریزی عدالتوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔

حسن امام پر ایک نظم زمیندار مورخہ 20 فروری 1922ء میں جناب مسلم کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ در اصل مولانا ظفر علی خاں کا بدلا ہوا نام ہے جو اس وقت منٹگمری جیل میں قید تھے۔

وہ صبح صبح نہیں ہے وہ شام شام نہیں　　بلائے تازہ کا جو لا رہی پیام نہیں
کسی کو دار پہ کھینچا کسی کو ذبح کیا　　یہ انتظام حکومت ہے انتقام نہیں
وہ کون ہے جو نہیں آج کل اسیر فرنگ　　سی آر داس نہیں یا ابوالکلام نہیں
پر جیت لی یہ کہا ایک دوست نے مجھ سے　　کہ اس گروہ میں شامل حسن امام نہیں
کسی سے کہہ دو وہ ہم کو نہ عدالت میں دیکھیں　　شکست تو ہے یہ سرگرم انتقام نہیں

اگر حرامِ موالات مجھ غریب پہ ہے — تو ایسے چوٹی کے لیڈر پہ کیوں حرام نہیں
کہا یہ دوست سے میں نے وہ مرغزار ہیں — حریص روا ہیں لیکن حریص روا نہیں

نہیں یہ قید قوم اپنی تقیہ کا قائل
ہمارا دائرۂ تسبیح میں امام نہیں

نظر بندان و محبوسان فرنگ کو فرمان شاہی کے ذریعہ رہائی ملی۔ مولانا محمد علی اخیر دسمبر 1919ء میں دوسرے لوگوں کے ساتھ رہا ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی چند روز بعد یکم جنوری 1920ء کو رہا ہو گئے۔

گاندھی جی تو تحریک خلافت سے اپنی پوری ہمدردی و معاونت کا اقرار پہلے ہی کر چکے تھے۔ 20 جنوری 1920ء کو دلی میں ایک جلسہ ہوا جس میں لوکمانیہ تلک اور دوسرے کانگریسی لیڈر بھی شریک ہوئے اور سب نے مسلمانوں کے موقف کے ساتھ اپنی پوری اعانت کا وعدہ کیا۔ لالہ لاجپت رائے (پنجاب) بپن چندر پال (بنگال) وغیرہ وغیرہ سب ساتھ آگئے اور خلافت کے مسئلہ پر ہندو اور مسلمانوں میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ وائسرائے اور لندن صلح کانفرنس میں وفد لے جانے کے بارے میں جو تجاویز مولانا آزاد اور علی برادران کی قید و بند کے دنوں میں منظور ہوئی تھیں ان حضرات کی رہائی کے بعد ان پر دوبارہ غور کیا گیا اور طے پایا کہ وفد لے جایا جائے۔

چنانچہ وفد مرتب کیا گیا اور مولانا محمد علی نے ایک میموریل تیار کیا جس پر سربرآوردہ لوگوں کے دستخط ہوئے۔ مولانا آزاد نے انڈیا ونس فریڈم میں لکھا ہے:-

"وفد وائسرائے سے ملا۔ میں نے عرضداشت پر دستخط تو کر دیے تھے مگر وفد کے ساتھ میں گیا نہیں۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ معاملات عرضداشتوں اور وفدوں کی حد سے آگے بڑھ چکے تھے"[1]

مولانا آزاد ہی کے بیان کے مطابق وائسرائے نے میموریل کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ " اگر مسلمانوں کا کوئی وفد حکومت برطانیہ کے سامنے ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ پیش کرنے کے لیے جانا چاہے تو حکومت وفد کو لندن جانے کے سلسلے میں ضروری سہولتیں فراہم کر دے گی۔ لیکن خود انھوں نے کچھ کرنے سے معذوری ظاہر کی"[2]

یہ پہلا دھکا تھا جو مسلمانوں کو لگا اور جو مدبر حکومت برطانیہ کی وفادار مسلم رعایا نے ہز ایکسلنسی

---

[1] INDIA WINS FREEDOM P 8

[2] " " " " 8-9

حضور وائسرائے دام اقبالہ کی ذات بابرکات سے وابستہ کی تھیں وہ سب خاک میں مل گئیں۔ کچھ لوگ سوچنے لگے کہ:

اے تمنا ناامیدی خاک میں مل جائے گی — یہ جو اک لذت ہماری سعی لاحاصل میں ہے

لیکن صدیوں کی پالی ہوئی حفظ تمنائیں اور نارسا امیدیں کب ساتھ چھوڑتی تھیں۔ چنانچہ جو وفد مرتب ہوا اس کے صدر مولانا محمد علی اور ارکان سید حسین، مولانا سید سلیمان ندوی اور ابوالقاسم، اور سکریٹری حسن محمد حیات منتخب ہوئے۔ سید حسین اس وقت بمبئی کرانیکل میں تھے وہ حصول آزادی کے بعد مصر میں پہلے ہندستانی سفیر ہوئے۔ وفد کے سکریٹری علی گڑھ کے نامور اولڈ بوائے حسن محمد حیات پنجابی تھے۔ بعد میں انھوں نے بھوپال میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ ان کا علی گڑھ کا روایتی نام لارڈ حیات تھا۔[1]

وفد خلافت کی کارگزاریاں

وائسرائے نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ وفد اس قدر تاخیر سے لندن پہنچے گا کہ شاید ہی اس کو اپنی بات کہنے کا موقع ملے مگر مولانا محمد علی تمام رخت پر مصر تھے۔ 22 فروری 1920ء کو ارکان وفد وینس پہنچے اور وہاں سے مولانا محمد علی نے وزیر ہند اور وزیر اعظم کو تار بھیج کر فیصلہ کرنے سے پہلے ہم لوگوں کو کچھ کہنے سننے کا موقع دیا جائے۔ اس تار میں یہ بھی لکھا تھا کہ ہم لوگ راستہ میں ہیں اور ہم اس کے شکر گزار ہیں کہ مسٹر مانٹیگو کی طرف سے ہمارا استقبال ہو رہا ہے۔ اگرچہ مانٹیگو کی علالت کی خبر پا کر ہم لوگوں کو افسوس ہے۔

چونکہ مسٹر مانٹیگو بیمار تھے اور ان کی جگہ مسٹر فشر کام کرتے تھے اس لیے لندن پہنچنے کے بعد پہلے ان سے ملاقات ہوئی۔ مولانا محمد علی نے بڑے جوش و خروش سے خلافت کی مذہبی اہمیت اور مقامات مقدسہ کے متعلق مذہبی احکامات کا حوالہ دے کر حسب ذیل مطالبات پیش کیے:۔

[1] خلافت ترکی کو بحال رکھا جائے۔

[2] مقامات مقدسہ یعنی مکہ، مدینہ، بیت المقدس اور تمام مقدس مزارات خلیفہ کی نگرانی میں ہونے چاہئیں جیسے کہ جنگ سے پہلے تھے۔ ہم مسلمان بھی خوش ہو جائیں گے کہ ان کی وفاداری کے صلہ میں جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ کا احترام باقی رکھ کر خلافت کی پہلی جیسی پوزیشن قائم رہ گئی۔

---

[1] محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند اوراق — مرتبہ عبدالماجد دریابادی

مولانا محمد علی انگریزی زبان پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک بے مثال مقرر تھے انھوں نے اپنے موقف کو بڑی خوبی سے پیش کیا لیکن ان کا بنیادی خیال بھی اس میں نمایاں رہا۔ مثلاً فرمایا:

"ہمارے مسلم دوست کہتے ہیں ہم بادشاہ سلامت اور ان کی حکومت کا حق رکھتے ہیں کیونکہ ہم ان کی رعایا ہیں۔ اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو بھی معاملات ہیں ان کا ذکر ان کو کرو وہ ہمارے اہم مسئلے ہیں"

اس کے بعد مسٹر فشر نے ایک ضابطہ کا جواب دیا اور کچھ ہمدردانہ اور کچھ ہمدردی پیدا کی اور وزیر اعظم سے ملاقات کے بارے میں کہا کہ وہ دیگر مدبرین عالم سے بہت اہم تبادلۂ خیالات کرتے ہیں اور بہت مشغول ہیں میں وعدہ نہیں کر سکتا کہ ان سے ملاقات ہوگی۔

مولانا محمد علی جیسا کہ ان کی عادت تھی اپنی بات کہتے گئے۔ یہاں کی عادت کا مزاج ذرا بھی کم نہ تھا مقتدر کے سامنے ہیں بھی اور ہندوستان میں بھی ان کو مذہب پر بحث کے لیے مجبور کرنے کے سلسلے میں وہ اپنے جوش میں رواداری کی حدود کو قائم رکھنے پر کبھی قادر نہ ہوئے۔

مسٹر لائیڈ جارج سے ملاقات

مسٹر فشر نے اپنی عظمت جتانے کے لیے اگرچہ کہہ دیا تھا کہ لائیڈ جارج سے ملاقات کا میں وعدہ نہیں کر سکتا مگر ایک "وفد رعایا" کے وفد سے جو سات سمندر پار کر کے صرف اپنی وفاداری اور خدمات کا صلہ مانگنے آیا تھا سلطنت کا سربراہ کیوں نہ ملتا۔ لائیڈ جارج کے سامنے بھی مولانا محمد علی کا وہی حال رہا۔ وہ اپنے مذہبی فرائض کا ذکر کرتے رہے۔ لائیڈ جارج نے منطقی وجوہ سے مولانا محمد علی کی ہر بات کی تردید کی تاہم وہ اپنی بات کہتے رہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو بڑی جسارت سے پیش کیا۔ اس کے تو وہ مرد میدان تھے ہی۔ انھوں نے جس حسن و خوبی سے اسلامی اصول خلافت اور مسلمانوں کے مطالبات کو پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہے اور شاید کوئی دوسرا ایسا نہیں کر سکتا۔ بے شک انھوں نے حق ادا کر دیا لیکن انگریز نے ایک صدی کی محنت اور ریشہ دوانیوں سے دنیائے اسلام کی تباہی کا جو موقع پیدا کیا تھا اسے ہاتھ سے کیسے جانے دے سکتا تھا! مولانا محمد علی کی پرزور مدلل اور فصیح تقریروں کو جب میں پڑھتا ہوں تو مجھے ایک مشہور قصہ یاد آتا ہے کہ ایک عالم دین ایک بادشاہ کے پاس گئے اور ان کو سمجھایا کہ کل فوج برخواست کر دیں اور یہ روپیہ رفاہ عام کے کاموں میں لگائیں۔ فوج رکھنے سے کیا فائدہ۔ کسی دوسرے کا ملک چھیننا یا خونریزی کرنا سخت گناہ ہے۔ بادشاہ سلامت سادہ لوح تھے مگر یہ پوچھ ہی بیٹھے کہ اگر کوئی میرے اوپر حملہ کر دے تو کیا ہوگا۔ مولانا نے فرمایا میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ چنانچہ بادشاہ سلامت نے کل فوجیں برخاست کر دیں۔ قریب کے بادشاہ کو جب خبر ملی تو اس نے چڑھائی کر دی

ان کا دستہ مسلمان مولانا سے فریاد کی کہ آپ بچاؤ کی صورت کیجیے ورنہ بچے... مولانا صاحب کئی دنوں پر قرآن و حدیث و فقہ کی کتابیں لاد کر آئے اور یہ سب لے کر حملہ آور بادشاہ کے پاس گئے۔ اس نے مولانا کا بڑا استقبال کیا۔ دربار ختم ہونے کے بعد [illegible] مولانا صاحب نے تقریر شروع کی کہ خونریزی اور ملک گیری حرام ہے اور جو ایسا کرے گا اس کی یہ سزا ہے۔ اور اپنی تائید میں آیات قرآنی و احادیث نبویہ اور بزرگوں کے اقوال کا ایک سلسلہ بیان کرنا شروع کیا اور بار بار اسے خوف خدا دلاتے تھے۔ حملہ آور بادشاہ بہت ادب سے سب سنتا رہا۔ آخر کار کچھ عرصے کے بعد اس نے کہا کہ ذرا اس ملک کو میں فتح کرلوں تو ابھی ہوش کر آپ کی تقریر اطمینان سے سنتا ہوں۔ [illegible] ہے کہ مولانا کی خدمات میں حتی المقدور کوئی کمی نہ رکھیں۔ مولانا بھاگ کر اس بادشاہ کے پاس پہنچے جس پر حملہ ہوا تھا اس نے خوف زدہ لہجہ میں پوچھا کیا ہوا تو مولانا نے فرمایا کوئی حرج نہیں تمہارا تو صرف ملک گیا اس کا ایمان گیا۔

بہرحال [illegible] سے مایوس ہو کر مولانا محمد علی نے برٹش پبلک کو ہموار کرنے کے لیے جلسے کیے اور تقریریں کیں۔ وہ پیرس گئے اور وہاں فرانسیسیوں کو بھی اپنے موقف سے آگاہ کیا اور اپنی روایتی لسانی و علمی لیاقت سے منطقی دلائل کی حد کر دی۔ وہ حجاز [illegible] عرب کے لوگوں سے بھی ملے اور انھیں خلیفہ کے اقتدار کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ کرنا چاہا۔ وہ لوگ تسلیم کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم خلیفہ کے خلاف نہیں ہیں مگر [illegible] کرانے کو قوموں کا ساتھ [illegible] تو حضرت امام حسین کے ساتھ تھیں مگر ان کی تلواریں ان کے خلاف تھیں۔ [illegible] دونوں شریف مکہ کے لڑکے تھے۔ ان دونوں کو تاج و تخت کا لالچ دیا جا چکا تھا شریف مکہ کو خلیفۃ المسلمین بننے کا خواب دکھایا گیا تھا اور یہ سب برطانیہ کے وظیفہ خوار تھے۔ یہ منطق سے کیا راضی ہوتے۔ [illegible] نے ایک بیان خلافت کی موافقت میں شائع کر دیا مگر یہ ایک کھلی ہوئی منافقت تھی۔

مولانا محمد علی وفد کے ساتھی ان ناکام مساعی کے بعد جو کچھ حاصل ہوئیں اکتوبر 1920ء کے آخر تک ہندوستان واپس آئے۔ ان کے جانے کے وقت سے ہی بعض لوگوں میں جو وفد کے حقیقی منشا سے واقف نہیں تھے [illegible] پیدا ہو گیا تھا جس پر [illegible] مرحوم نے اپنے ظریفانہ انداز میں کہا ہے

دعا کرتے ہیں جو [illegible] مسجد کی دروں پر   مبارک ہو [illegible] نظر [illegible] کی پریوں پر

علامہ اقبال نے فرمایا۔ قطعہ

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا   خلافت کی کرنے چلا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے   مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

مرا از شکستن چناں عار ناید — کہ از دیگراں خواستن مومیائی

کہا جا سکتا ہے کہ اس وفد سے کچھ حاصل نہ ہوا لیکن جس دولت سے مسلمان گراں بار ہوئے تھے اس کا تقاضا تھا کہ انھیں ناامیدی کا ایک بڑا جھٹکا لگے تاکہ بعد میں "وفاداری" کا منحوس و ذلت خیز تخیل دماغ سے نکل جائے۔ اس سے کئی عظیم نقصانات البتہ ہوئے۔ اول یہ کہ ہندوستان ایک نازک وقت میں مولانا محمد علی جیسی عظیم شخصیت کی قیادت سے محروم رہا۔ دوسرے اس سے ایک خاص قسم کی بدنامی بھی ہوئی۔ وفد کے واپس ہوتے ہی انگریز نے جس کے جاسوس لگے ہوئے تھے اور یہ جان گئے تھے کہ پورا حساب رکھا نہیں گیا ہے، اپنے پٹھوں کو شسکار دیا اور انھوں نے مولانا محمد علی سے حساب مانگا۔ بھلا مولانا محمد علی جیسے ناپابند اوقات کے لیے باقاعدہ حساب رکھنا کہاں تک ممکن تھا۔ لارڈ حیات بھی علی گڑھ کے ایک کھنڈرے تھے۔ اصل میں یہ کام بحیثیت سکریٹری ان کا تھا۔ مولانا محمد علی بحیثیت رئیس وفد اس درجہ مشغول تھے کہ وہ حساب رکھنا بھی چاہتے تو رکھ نہ سکتے تھے اور نہ یہ ان کی ذمہ داری تھی۔ مگر ان ہی سے سوال ہوا۔ مولانا محمد علی نے جواب دیا "خدا کو روز قیامت حساب دوں گا نہ ان تبریوں کو"۔ کہا "اگر وہ نہ لے ورنہ بے حساب آپ کو بخش دے تو حساب ہمیں دیجیے"۔ اب غداران ملت و وفاداران سرکار کی بن آئی۔ طرح طرح کی افواہیں اڑائے۔ جس طرح یہ حساب مرتب ہوا وہ حقیقی صفائی علامہ سید سلیمان ندوی نے دی۔ محمد علی کی جانب سے دی وہ قوم کی بے اعتدالی اور ایک عظیم خادم قوم کی جو بے وقری ہے اس کو بیان کرنے کے لیے دفتر کا دفتر چاہیے۔ الغرض علامہ سید سلیمان ندوی کے ان بیانات کے بعد کہ کس طرح سے وہاں اخراجات ہوتے تھے، جلسوں کے لیے کرایہ پر ہال لیے جاتے تھے، زرمبادلہ بدستور بڑھتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ تفصیلی حساب مرتب ہونے کے بعد تبریوں کے منہ میں سیاہی لگی۔ اور معاملہ ختم ہو گیا مگر کتنے عظیم نقصان کے بعد یہ مرحلہ طے ہوا۔

جو الفاظ میں نے لکھے ہیں ان سے پوری قوم کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر میں اس کی وضاحت نہ کردوں۔ یہ حساب کتاب کی بات کرنے والے صرف چند تنگ نظر عناصر تھے جو حکومت کے پروردہ ہونے کی وجہ سے اس کے اشارے پر کام کر رہے تھے۔ مولانا محمد علی کے شخصی وقار اور عظمت کے تخیل پر ذرہ برابر حرف نہیں آیا۔ جو نقصان ہوا اور بعد کو جو کچھ اچھلا اس کے مولانا محمد علی خود ذمہ دار تھے۔ ان کے اندر دو بڑی کمزوریاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنی زبان پر قابو نہیں رکھتے تھے۔ جو دل میں آتا کہہ دیتے تھے جس سے لوگوں کے دلوں پر چوٹ لگتی تھی۔ مولانا محمد علی پر بہت لوگوں نے لکھا ہے اور وہ اسے ان کی خوبی تصور کرتے ہیں اور اس سے ان کی صاف دلی اور بے باکی کے نتائج نکالتے ہیں۔ مجھے اس سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔ مولانا محمد علی کا یہ کوئی وصف نہیں تھا کہ انھوں نے مولانا ظفر علی خاں جیسے تیز گو شاعر کو ... کہا۔ اور حسن نظامی جیسے سرکاری آدمی کو

"خفیہ خودکشی کی دھمکی دی۔ ذرا غور کی بات ہے ایسے نازک وقت جو باتیں کاغذ پر درج نہیں ہو سکتے جو لوگ وہ وہاں بیٹھے تھے۔ اس طرح انھوں نے اپنے خلاف ایک محاذ کھڑا کر لیا۔ ان لوگوں نے غلط باتوں کو دہرانا شروع کر دیا۔ دوسری کمزوری مولانا محمد علی میں یہ تھی کہ وہ دوسرے کام بہت جلد تھکتے تھے۔ جہاں ان کے خلاف کوئی بات آئی وہ مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ یہیں ان کا قدرتی طور اس کی شوخ نگاریاں۔ اس کے ساتھ ہی گاندھی جی کا طرز عمل بالکل متضاد تھا۔ وہ کبھی بھی مخالف نہیں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ شخص کو یہ سب درست ہے، اسے قائل کرنے کا حق ہے۔ میں کیوں اس کی رائے تبدیل کرنے کی کوشش کروں۔ یہی حال مولانا ابوالکلام آزاد کا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ عظیم شخصیتیں ان چھوٹی چھوٹی کمزوریوں کی وجہ سے تمام عمر بھی … در دفاع ذاتی و شخصی میں مبتلا رہا۔

مولانا شوکت علی بالکل دوسرے اجزاء سے مرکب تھے۔ ان کو عام طور پر لوگ کم علم سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ بڑے ہی ذی ہوش اور لائق آدمی تھے۔ تقریریں مختصر کرتے تھے جبکہ مولانا محمد علی نے اپنی طویل تقریروں سے سارے ہندوستان کو عاجز کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ گاندھی جی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ مولانا محمد علی پانچ منٹ کا وعدہ کر کے تقریر کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور ڈیڑھ دو گھنٹے بعد بیٹھتے ہیں۔ خیر، تو گاندھی جی نے کہا اور مولانا محمد علی نے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے اڑا دیا۔ کوئی دوسرا کہتا تو اس کی شامت ہی آ جاتی۔ مولانا شوکت علی عظیم کے ناظم تھے۔ جس طرح وہ کسی تحریک کو منظم کر سکتے تھے وہ صرف ان کا حصہ تھا۔ غالباً ہندوستان میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ چنانچہ آل انڈیا خلافت کانفرنس کا تیسرا جلسہ جو امرتسر کانگریس کے پنڈال میں 31 دسمبر 1919ء کو منعقد ہوا اس کی صدارت کے لیے مولانا شوکت علی کا نام مولانا عبدالباری نے پیش کیا اور تائید مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا فضل الرحمن صاحب پیرزادہ "الموقف" … سیٹھ احمد حاجی صدیق کھتری، سیٹھ موسیٰ … صاحب رنگون نے کی۔ مولانا شوکت علی بہت مختصر اور جامع تقریریں کرتے تھے جو بے حد مؤثر ہوتی تھیں۔ ادھر مولانا محمد علی کی طویل تقریر امرتسر کانگریس کے اجلاس میں ملاحظہ کیجیے، ادھر مولانا شوکت علی کی تقریر مسلم لیگ میں دیکھیے **وہ کہتے ہیں**۔

"میں نے ایک عہد کیا تھا کہ جس وقت کسی پر مصیبت آئے گی اس وقت اپنی جان تک قربان کر دوں گا۔ میں خطاوار ہو گیا اور جب کسی پر مصیبت آئی تو کچھ نہ کر سکا تھا۔ میں خطاوار ہوں۔ جو خطا میں نے کی ہے اس کی سزا مجھے مل رہی ہے اور ملے گی۔ ہم نے اپنے لیے جو کچھ کیا اپنے ہاتھوں کیا۔ کیونکہ ہم نے مصلحت وقت کو رسول کے احکام پر ترجیح دی۔ ہمیں جو کچھ سزا ملی اس کی بدولت تھی اور میں سچ کہتا ہوں کہ ہم اس سے بہتر زیادہ سزا کے

مستحق تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی سیاسی کا مستحق تھا اور مجھے درف خوشی ہے۔ میں ایک سوال پوچھتا ہوں کہ آپ نے تمام عمل سے کیا سبق حاصل کی کہ آپ زمینی اقتدار کے لیے خدا اور رسول کے احکام کو نظر انداز کرنے کے لئے تیار ہیں۔ وہ آپ کا ساتھ نہیں۔ اس وقت کہنا یہ ہے کہ تمام اہم متفق ہو کر اسلام پر غور کر کے فیصلہ کرے کہ آپ کا فرض کیا ہے۔ ریزولیوشن پاس کر دینا کچھ مشکل کام نہیں۔ میں نے ایک فقرہ اپنے بھائی مظہر علی کو بھی یہ کہتے سنا تھا ... کہ کوئی مسلمان ایسا ہوگا جو ترکوں کی فتح کا خواہشمند نہ ہو۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کا جواب دینے سے قبل میں ایک سوال کرتا ہوں کہ اگر ہمیں ... آزادی حاصل ہو تو مسلمان یہ کہنے کا اور اسے کہنے کا حق ہے۔ ہمیں ملک معظم اور وائسرائے کے پاس وفد روانہ کرنا ... کہہ دیا جائے کہ اگر صورت حال یہی ہے تو ہم ... دو صورتیں ہیں۔ ... ہمارا وفد خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں جا ... جس میں ... کی ... کہ ... وطن کو ہیں بہشت بنا دو۔

تقریر تالیوں کی گونج میں ختم ہوئی۔ کتنی مختصر جامع اور موثر ہے اور کیسے خشمت جملے اس اور آئندہ کے پروگرام کا پیش کیا ہے کہ آج بھی یہ تقریر پڑھ کر آنکھ نم ہو جاتی ہے۔

مولانا محمد علی نے اس وفد کو جس ہمت، بہادری، لیاقت اور محنت سے ادا کیا اس کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے رئیس وفد کی کارگزاریوں کا حق ادا کر دیا۔ یہ تحقیق کا حصہ تھا اور انھوں نے برطانوی وزراء، برطانوی پبلک، دول متحدہ کے مدبرین، فرانس کی حکومت کے ممبران، عراق و عرب کے لیڈران امیر فیصل وغیرہ سب کو ہلا ڈالا۔ مولانا محمد علی کے دل میں ایک آگ جل رہی تھی۔ وہ جب دلائل سے لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ اور دیگر ارکان حکومت کو قائل نہ کر سکے تو برطانیہ کی پبلک سے اپیل کی۔ انگریزوں کو جو حامی تھے ان سے امداد، جو مخالف تھے ان کا منہ بند، بحثیں کیں۔ اور چونکہ لائیڈ جارج کا کہنا تھا کہ عرب خود ترکی کے زیر نگیں رہنا نہیں چاہتے اس لیے ان کو حق خود ارادیت سے کیوں محروم کیا جائے۔ اس سبب مولانا محمد علی عرب کے لیڈروں سے ملے اور یہ کوشش کی کہ خود عرب کے لوگ اس پر راضی ہو جائیں کہ وہ حق خود ارادیت رکھتے ہوئے ترکی کے وفادار رہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی جیسے ماہر فن اور زبان عربی ان کے ساتھ تھے۔ جو روانی سے مادری زبان کی طرح عربی بولتے تھے اس لیے خود مولانا محمد علی کو بڑی سہولت حاصل تھی۔ مگر محض بحث و گفتگو کا نہ تھا۔ مطلب کوئی طاقت کا عرصہ تھا وہ ایک سوچی سمجھی اسکیم پر

عمل درآمد کر رہا تھا اور عرب رہنما پیرا در حکومت کی حرص میں مبتلا تھے۔ تحریک کو علاوہ اس کے کہ کثیر رقم ملی تھی یک صاحب دست کو عرب کی بادشاہت اور دوسرے کو ترکی کی بادشاہت کا وعدہ تھا۔ مولانا محمد علی اپنے بے پناہ جوش میں ان باتوں کا اندازہ نہ کر سکے اور محض نا سمجھی و جہد میں مشغول رہے۔ وہ دول متحدہ میں فرانس وغیرہ کے اعلیٰ مدبرین سے بھی ملے لیکن سب بے سود۔ اس کا نتیجہ ضرور ہوا کہ انھوں نے دول متحدہ اور اہل عرب کے ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور ہندوستان، مصر، افغانستان اور عالم اسلامیہ کے سامنے مسئلہ کی صحیح شکل پیش کی اور دول متحدہ کا ظلم کھل کر سامنے آگیا۔

چھٹا باب

مذہب کی راہ سے مسلمانوں کو سیاست میں لانے کے لیے مولانا آزاد کی کوشش

بیعت امامت

مولانا ابوالکلام آزاد یکم جنوری 1920ء کو بنگال کی صوبائی خلافت کانفرنس کلکتہ کے صدر منتخب ہوئے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی ذکر آزاد میں لکھتے ہیں کہ یہ پہلی خلافت کانفرنس تھی۔ صحیح یہ ہے کہ پہلی خلافت کانفرنس دلی میں زیر صدارت ہوئی۔ جبکہ صدارت کی تھی اور دوسری صوبائی کانفرنس 23 نومبر 1919ء کو بمقام دلی زیر صدارت مولوی فضل الحق ہوئی تھی۔ دوسری خلافت کانفرنس 28 فروری 1920ء میں ٹاؤن ہال کلکتہ میں ہوئی۔ یہاں مولانا ابوالکلام نے ایک مبسوط خطبۂ صدارت پڑھا جو کتابی شکل میں اسی وقت شائع ہوچکا تھا اور اب بھی جابجا ملتا ہے۔

وہیں کانفرنس کے دوسرے دن مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک اسکیم کی بنیاد ڈالی جس کے بارے میں ان کے معتقد عبدالرزاق ملیح آبادی ذکر آزاد میں تحریر فرماتے ہیں:-

"مولانا کی اسکیم کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان کو مذہب کی راہ سے منظم کیا جائے۔ مسلمانوں کا ایک امام ہو اور امام کی اطاعت کو وہ شرعی فرض سمجھیں۔ ہندوستان میں یہ اسلوب مقبول ہوسکتا ہے۔ اگر قرآن و حدیث سے مسلمان ثابت ہو جائے کہ امام کے خلاف کی زندگی غیر اسلامی اور اس کی موت جاہلیت پر ہوگی۔ جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد امام کو مان لے تو امام ہندوؤں سے معاہدہ کرے۔ انگریزوں پر جہاد کا اعلان کرے۔ اور ہندو مسلمانوں کی متحدہ قوت سے انگریز کو شکست دے دی جائے مگر امام کون ہو؟ اس منصب کے لیے زیادہ سے زیادہ معتبر آدمی کو چننا ہوگا ایسے آدمی کو جو کسی قیمت پر دشمن کے ہاتھ نہ بک سکے۔ ساتھ ہی امام کو موحد اور حالات

رازداری کا حلف وفا ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ مولانا اپنی ذات سے زیادہ کسے امامت کا
اہل سمجھ سکتے تھے۔

اس کے بعد طے پایا کہ امامت کا مسئلہ پبلک میں لانے سے پہلے اندر اندر مولانا کی امامت کے
لئے ملک بھر میں بیعت لینا شروع کر دیا جائے تاکہ جب یہ مسئلہ سامنے آئے تو امام کی بیعت وقوع
میں آ چکی ہو۔ اس سے لوگوں میں رسول اور صحابہ کا سا جذبہ پیدا ہو جائے گا اور مسلمان ایک امام پر
متفق ہو کر ہندوستان کو غلامی سے نجات دلا سکیں گے۔

مولانا نے تدریجاً دوسرے صوبوں میں بیعت کا کام جاری کر دیا ہے۔ یوپی کا صوبہ میرے
حوالے ہوا۔ میں راضی ہو گیا تو انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر ایک تحریر دی جس میں انہوں
نے مجھ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور لکھا کہ ان کے لیے بیعت لینے کا میں مختار ہوں۔ تحریر حسب ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اخویم مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ وہ بیعت لینے اور
تعلیم و ارشاد سلوک سنت میں فقیر کی جانب سے ماذون و مجاز ہیں۔ جو صاحب صادق ان کے
ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ انہوں نے خود فقیر سے بیعت کی۔ والعاقبۃ للمتقین۔

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ ۴ شعبان 1338ھ (مطابق 23.4.1920)

ملیح آبادی پھر لکھتے ہیں کہ "الفاظ بیعت کا مسودہ بھی لکھ دیا وہ نیچے نقل کرتا ہوں:۔

آمنت باللہ وبما جاء من عند اللہ وآمنت برسول اللہ وبما جاء من عند
رسول اللہ واسلمت واقول ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین
لاشریک لہ وبذلک امرت وانا اول المسلمین۔

بیعت کرتا ہوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطہ خلفاء و نائبین کے اس بات پر کہ:۔

(۱) اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعتقاد و عمل پر قائم
رہوں گا اگر استطاعت پائی۔

(۲) پانچ وقت کی نماز قائم رکھوں گا۔ رمضان کے روزے رکھوں گا۔ زکوٰۃ اور حج ادا کروں گا اگر
استطاعت پائی۔

(۳) ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں نیکی کا حکم دوں گا۔ برائی سے روکوں گا۔ صبر کی وصیت کروں گا۔

(۴) میری دوستی ہوگی تو اللہ کے دین میں اور دشمنی ہوگی تو اللہ کی راہ میں۔

(5) اور بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں اپنی جان سے اپنے مال سے اپنے اہل وعیال سے دنیا کی ہر نعمت اور ہر لذت سے زیادہ اللہ کو اس کے رسول کو اس کی شریعت کو اس کی امت کو محبوب رکھوں گا اور اس کی راہ میں جو حکم کتاب اللہ وسنت کے مطابق دیا جائے گا السمع والطاعۃ کے ساتھ اس کی تعمیل کروں گا۔

آگے چل کر ملیح آبادی لکھتے ہیں "مولانا" نے فرمایا کہ:۔

"ایک نیک دل مسلمان نے ایک بڑی رقم میرے ہاتھ میں اپنے کاموں کے لیے ڈال رکھی ہے اسی میں سے پچاس روپیہ ماہوار آپ کو بھی پہنچا کریں گے۔ فی الحال لکھنؤ اپنا مرکز بنائیے اور پورے صوبہ میں کام شروع کر دیجیے"۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جس رقم کا مولانا نے حوالہ دیا تھا مولانا عبدالقادر قصوری کے لڑکے محمد علی ایم اے نے ایک لاکھ روپیہ کی شکل میں دی تھی۔"

ملیح آبادی کے قول کے مطابق مولانا نے کام کا طریقہ یہ بھی بتلایا کہ دعوتیں دی جائیں۔ مولانا نے فرمایا کہ "دعوت پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے اس کا کئی گنا زیادہ دس ہزار آدمیوں کے جلسے پر خرچ ہو جاتا ہے مگر اس جلسے میں ایک آدمی بھی قابو میں نہیں آتا لیکن ایک دعوت کے مختصر خرچ سے دس کے دس آدمی تو اپنا خیال ضرور ہی کرنے لگتے ہیں۔"

ملیح آبادی کا قول ہے کہ انھوں نے اس نسخۂ کیمیا کو آزمایا اور مجرب پایا۔

8 جون 1920ء کو مولانا محمود حسن رہا ہو کر مالٹا سے بمبئی آ گئے تھے۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ:۔

"اسی زمانہ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مالٹا کی نظر بندی سے چھوٹ کر پہلی دفعہ لکھنؤ تشریف لائے اور فرنگی محل میں ٹھہرے۔ چنانچہ عبدالرزاق ملیح آبادی وہاں گئے اور بزعم خویش دونوں بزرگوں یعنی مولانا عبدالباری اور حضرت مولانا محمود حسن کو مولانا ابوالکلام آزاد کے امام الہند بننے پر راضی کرنا چاہا مگر دونوں بات ٹال گئے۔ مولانا عبدالباری کی ایک مبہم تحریر بھی نقل کی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"مولانا محمود حسن سے دریافت کیا تو وہ بھی اس بار کے متحمل نظر نہیں آتے۔ مولانا ابوالکلام صاحب اسبق وآمادہ ہیں۔ ان کی امامت سے مجھے استنکاف نہیں ہے بسروچشم قبول کرنے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ تفریق جماعت کا اندیشہ نہ ہو۔ مولانا تو اہل ہیں کسی نااہل کو اگر اہل اسلام قبول کریں گے تو وہ لوگ سب سے زیادہ اطاعت گزار و فرماں بردار مجھے پائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ تحریک دینا میں اپنی سمت سے جاری کرنا نہیں چاہتا کسی کو منتخب کر کے اس کے اعمال کا اپنے اوپر بار لینا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کی جماعت کا تابع ہوں اس سے زائد مجھے اس تحریک

سے تعرض نہیں ہے۔ والسلام۔ بندہ فقیر عبدالباری:

یہ خط مولانا ابوالکلام کو ملا تو انھوں نے ملیح آبادی کو لکھا۔ مولوی عبدالباری کا خط دیکھا" یارما ایں دارد واں نیز ہم" سردست اس قصہ کو تہہ کیجیے اور کام کیے جائیے پنجاب، سندھ، بنگال میں تنظیم مکمل ہے۔ مولانا آزاد کا یہ خط 20 ستمبر 1920ء کا ہے۔

صفحہ 39 پر ملیح آبادی مولانا آزاد کا ایک اور خط اپنے نام نقل کرتے ہیں جس کا کچھ حصہ حسب ذیل ہے:

"بہرحال ہمارا دائرۂ عمل مکمل ہو چکا ہے۔ پنجاب، سندھ و بنگال متحد و متفق ہے اور اب پوری تیزی سے کام جاری ہو گیا ہے۔ ان لوگوں (مولانا عبدالباری، مولانا محمود حسن اور مولانا حسرت موہانی) کے فیصلے کا انتظار بے سود تھا اور بے سود ہے۔ لیکن ستمبر 1920ء میں مولانا نے تحریک امامت کو ختم کر دیا اور امامت کے معاملے کی اہمیت دفعتاً مولانا کے ذہن میں کم ہو گئی اس کا سبب انھوں نے کبھی نہیں بتایا" البتہ عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنی حسب ذیل رائے درج کی ہے۔ ان کو مولانا آزاد سے جو تقرب حاصل تھا اس بنا پر یہ قابل غور ہے۔

"لیکن مولانا محمد علی نہایت مستعد لیڈر تھے اور طوفانی طبیعت رکھتے تھے۔ ان کا اثر بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا اور مولانا کی امامت ہی کے نہیں خود مولانا کی ذات کے سخت مخالف تھے۔ دونوں میں عمر بھر رقابت رہی۔ قدرتی طور پر مولانا نے جو از حد معاملہ فہم اور ٹھنڈی طبیعت کے آدمی تھے محسوس کر لیا کہ علی برادران سے تصادم مسلمانوں میں پھوٹ ڈال دے گا۔ مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی انہی برادران کے ساتھ تھا۔ پھر فرنگی محل بھی مخالف تھا، اور گو شیخ الہند کی طرف سے مخالفت نہ تھی مگر دیوبند کا طاقتور حلقہ بھی مولانا کا طرفدار نہ تھا۔ اس صورت میں مسئلہ امامت کا آخر تک پہنچانا دانشمندی کے خلاف تھا۔

یہ تھی دوسری سعی لاحاصل۔ وفد خلافت تو خیر ایک اہم سیاسی فائدہ تھا جو حاصل ہوا۔ اس کی بدولت مسلمان ایک زبردست غلط تخیل سے نکل کر آزاد ہوا۔ اور یہ ایک منزل تھی جسے دوسری منزل تک جانے کے لیے طے کرنا ضروری تھا۔ اس نے کروڑوں انسانوں کو ایک دور سے نکال کر دوسرے دور میں پہنچایا۔ خیالات اور عقائد باطلہ کو ملیامیٹ کر دیا۔ مسلمانوں کو آزادی کی فضا میں سانس لینے اور مکمل آزادی کے لیے اور کامل جدوجہد کے لیے آمادہ و مستعد کیا۔ امامت ہند کی تحریک تو بے سود ہی رہی اور پھر تمام عمر مولانا آزاد نے اس اہم فریضہ مذہبی کا کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرعی مسئلہ دریائے گنگ و جمن کی لہروں کی نذر ہو گیا اور مولانا کو دیگر مشاغل نے ادھر توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ دی کہ وہ تمام مسلمانان ہند کو "جاہلیت" اور "معصیت" کی زندگی گزارنے کے خلاف آمادہ کرنے کی جدوجہد کریں۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ تحریک خلافت نے وہ کام براہ راست کر دیا جو تحریک امامت سے بالواسطہ مولانا کرانا چاہتے تھے۔ اور اس لیے

مولانا نے خاموشی اختیار کر لی۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ یکم اپریل 1920ء کی اشاعت میں سرکار پرست ہفتہ وار اخبار مشرق نے "اعلیٰ حضرت محی الملت والدین حامی العلوم نواب میر عثمان علی خاں فرماں روائے مملکت آصفیہ" کے لیے ان کی جشن سالگرہ پر درازیٔ حیات کی دعا کرتے ہوئے، تجویز پیش کی کہ "اعلیٰ حضرت محی ملت والدین" کو "شیخ الاسلام" کا منصب دیا جائے اور ہر صوبہ میں شیخ الاسلام کے نائب اور ہر شہر میں اس کے نقیب ہوں، اس طرح ایک طرف تو عوام کے خیالات پر قابو حاصل ہو جائے گا، دوسرے ہماری آواز زیادہ ذمہ دارانہ اور موثر طریقے سے حکومت پر پہنچ سکے گی۔" اس مضحکہ خیز تجویز کا دندان شکن جواب وکیل امرتسر نے اپنی 24 اکتوبر 1920ء کی اشاعت میں دیا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ وفاداران ازل کس کس قسم کے ذہنی بگاڑ عوام میں پیدا کرنے کے لیے بے شرمی و بے حیائی کے ساتھ فکر کر رہے تھے لیکن ایک فرنچ جنرل کے قول کے مطابق عوام کا جوش دریاؤں کی طغیانی کی طرح اٹھتا ہے جسے بجز خدا کے کوئی اور نہیں کہہ سکتا کہ بس:

تحریک ہجرت

یہ بات طے ہو جانے کے بعد کہ وائسرائے کے پاس وفد خلافت لے جایا جائے۔ وفد گیا اور وائسرائے کے یہاں سے لوٹ کر آیا تو گاندھی جی نے یہ سوال اٹھایا کہ آئندہ قدم کیا ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے دلی میں ایک جلسہ بلایا گیا جس میں اور لوگوں کے علاوہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں اور مولانا عبدالباری بھی موجود تھے۔ گاندھی جی نے اس میں ترک موالات کا پروگرام پیش کیا۔ ترک موالات کی اسکیم یہ تھی کہ حکومت سے ہر طرح کا عدم تعاون کیا جائے، گورنمنٹ کے خطابات واپس کر دیے جائیں، عدالتوں، درس گاہوں کا مکمل بائیکاٹ ہو، ہندوستانی تمام نوکریوں سے استعفیٰ دے دیں اور 1919ء کے اصلاحات کے تحت جو قانون ساز ادارے بننے والے ہیں ان میں کوئی حصہ نہ لے۔ گاندھی جی نے کہا کہ یہی وہ طریقہ ہے جو حکومت کو مصالحت طے کرنے پر مجبور کرے گا۔ وفود اور میموریل کے زمانے گزر چکے۔

مولانا آزاد انڈیا ونس فریڈم میں لکھتے ہیں:-

"جیسے ہی گاندھی جی نے اپنی یہ تجویز پیش کی مجھے یاد آیا کہ یہی وہ اسکیم تھی جو کچھ عرصہ قبل ٹالسٹائی نے پیش کی تھی... مجھے یہ بھی یاد آیا کہ اسی قسم کا پروگرام میں نے الہلال کے کسی مضمون میں پیش کیا تھا:

لہ INDIA WINS FREEDOM P.9

الہلال کا وہ مضمون افسوس ہے کہ کہیں نہیں ملا اور نہ مولانا نے اس کے بعد کبھی اس کا تذکرہ کیا یا ازسرنو چھاپا لیکن ہجرت کا ایک فتویٰ مولانا نے اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ضرور نشر کر دیا جس میں مسلمانان ہند کو یہاں سے ہجرت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ادنیٰ تعمق سے معلوم ہوگا کہ ہجرت اور ترک موالات میں تطبیق کا فاصلہ ہے — ہجرت کا مطلب ہے اس ملک کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے جانا۔ اور ترک موالات تو وہ کرے گا جس کا عزم راسخ یہاں رہنے کا ہو۔ لیکن مولانا آزاد کا جو فتویٰ "اہل حدیث امرت سر" کی 20 جولائی 1920ء کی اشاعت میں درج ہوا ہے۔ اس میں مولانا نے ان دونوں میں تطبیق کی کوشش کی ہے۔[1]

اس کے پہلے یہ ذکر آچکا ہے کہ مولانا نے کلکتہ کانفرنس کے بعد فروری 1920ء میں اپنے کو امام الہند بنانے اور اس طرح مذہب کے راستہ مسلمانوں کو سیاست میں داخل کرنے کا پروگرام بنایا تھا جو انھوں نے کوشش بلیغ اور رقم کثیر صرف کرنے کے بعد ستمبر 1920ء میں ختم کر دیا۔ تو پھر اسی زمانہ میں تحریک ہجرت کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بہر حال اب مولانا کے فتوے اور ترک موالات سے اس کی تطبیق پر نظر ڈالی جائے۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

> "تمام دلائل شرعیہ حالات حاضرہ مصالح مہمہ امت اور مقتضیات و مصالح پر نظر ڈالنے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہو گیا ہوں کہ مسلمانان ہند کے لیے بجز ہجرت کوئی چارہ شرعی نہیں ہے۔ ان تمام مسلمانوں کے لیے جو اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا اسلامی عمل انجام دینا چاہیں ضروری ہے کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں۔"

وجوب کا فتویٰ دینے کے بعد مولانا نے ایک استثنیٰ کا ذکر کیا ہے:۔

> "البتہ جن لوگوں کی نسبت ظن غالب ہو کہ مقصد کی جدوجہد اور کلمۂ حق کے اعلان و تذکیر کے لیے ان کا قیام ہندستان میں بمقابلہ ہجرت زیادہ ضروری ہے یا جو لوگ دیگر عذرات مقبولۂ شرع کی بنا پر ہجرت نہ کر سکیں یا ایک اتنی بڑی وسیع آبادی کی نقل و حرکت میں قدرتی طور پر جو تاخیر ہونی چاہیے اس کی وجہ سے تاخر ہو تو بلا شبہ وہ لوگ ٹھہر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی تمام قوتیں اتباع شرع کے لیے وقف کر دینی چاہئیں۔"

---

[1] یہ فتویٰ غلام رسول مہر نے تبرکات آزاد کے صفحہ 203 پر اہلحدیث سے نقل کیا ہے۔ مگر فتویٰ کی تاریخ نہیں درج ہے۔ غلام رسول مہر تمہید میں صرف اس قدر لکھتا ہے کہ مولانا نے 1920ء میں فتویٰ دیا تھا بہر حال چونکہ مولانا جنوری 1920ء میں رہا ہوئے اور جولائی 1920ء میں یہ فتویٰ شائع ہو گیا۔ اس لیے وہ جنوری اور جولائی 1920ء کے مابین کا ہے۔

ترک موالات کے بارے میں اسی فتویٰ کے اندر مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

> "گزشتہ فروری کے جلسہ دہلی سے لے کر ۱۱ اپریل کے جلسہ خلافت کمیٹی بمبئی تک نان کوآپریشن کو منظور و مقبول کرانے کی جس قدر کوششیں کیں حق کردہ منظور کر لیا گیا۔ اس کی بہ یہی تھی:

یعنی نہ تو ہندوستان سے تمام لوگ بہ یک وقت ہجرت کر سکتے ہیں اور نہ شرعاً مطلوب ہے: ہجرت کا سلسلہ جاری رہے گا، ور ہندوستان میں اسلامی آبادی بھی باقی رہے گی پس جو لوگ ہندوستان میں ہیں شرعاً ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اسلام کے فریق محارب سے کسی طرح کا علاقہ محبت و الفت یا اعانت و خدمت کا رکھیں۔ جو شخص رکھے گا وہ حسب نص قرآنی اسلام کا دشمن منسوب ہوگا۔ ومن یتولهم منکم فانهٔ منهم"

یہ تھی تطبیق کی شکل۔ اب سوال یہ پیدا ہو کہ اس کا فیصلہ کیسے ہو کہ کون ہجرت کرے اور کون رہ جائے تو اس کے لیے مولانا نے حسب ذیل شکل پیش کی:۔

> "اس بات کا فیصلہ کرنا صاحب جماعت کا کام ہے کہ کس شخص کو فوراً ہجرت کرنا چاہیے اور کس شخص کی استعداد یہی ہے کہ اس کا قیام امدادی خدمات کے لیے مطلوب و مفید ہے نیز ہجرت کی جائے تو کس مقام پر اور کن حالات میں کہ موجب ثمرات و برکات ہو۔ ہر شخص بطور خود ان امور کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔
>
> "اعمال ہجرت کا جو نمونہ اسوۂ حسنہ نبوت نے ہمارے لیے چھوڑا ہے وہ یہ ہے کہ ہجرت سے مقدم ہجرت کی بیعت ہے۔ بغیر بیعت ہجرت نہیں کرنی چاہیے۔ جو لوگ ہجرت کریں پہلے ہجرت پر بیعت کریں۔"

یہاں وہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے جو پہلے سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ تحریک امامت اور تحریک ہجرت دونوں کا تضاد کیسے رفع ہو۔ مندرجہ بالا تحریر سے واضح ہوگا کہ تحریک ہجرت تحریک امامت کی کتاب کا ایک باب تھی۔ آخر میں مولانا ادعار و تحکم کی تمام الجھنیں سمیٹ کر فرماتے ہیں:۔

> "یہ میری رائے ہے، میری بصیرت ہے، میرا یقین ہے، میرا ایمان ہے۔ نہ کہ کوئی قیاس و رائے اور پولیٹیکل حکمت عملی۔ تمام یورپ اسلامی حکومت سے نکل چکا، بغداد و شام جا چکے، لیکن ایمان باقی ہے۔ ہم کو اب قسطنطنیہ کا بچاؤ نہیں کرنا ہے بلکہ اپنے ایمان کا بچاؤ درپیش ہے۔ اور مقصود بقائے ملک نہیں بلکہ صرف بقائے ایمان ہے۔۔۔ میں نے آخری فیصلہ کر لیا ہے جس طالب حق

کو مجھ پر اعتماد ہو اللہ کی راہ میں میرا ساتھ دے۔ . . بالفعل طریق عمل یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو اللہ توفیق عمل دے وہ فوراً مجھے اپنے عزم سے مطلع کریں یا حسب ذیل اصحاب سے مل کر تفصیلی ہدایات حاصل کریں۔

(1) مولوی عبدالقادر وکیل قصور (ضلع لاہور)

(2) مولوی محی الدین بی اے قصور (ضلع لاہور)

(3) مولانا محمد داؤد غزنوی

(4) مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی ایڈیٹر اسیاں لکھنؤ

اس طرح بیعت ہجرت بواسطہ بیعت امامت تھی اور دونوں تحریکیں مولانا ایک ساتھ چلا رہے تھے۔ مولانا کو اپنی ذات کی اہلیت پر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے اہل الرائے کے مشورے کی ضرورت نہیں سمجھی اور براہ راست قوم سے بیعت لینا چاہتے تھے بلکہ امامت کے لیے بیعت لینے کی تو مہم چلا رکھی تھی۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہجرت کا فتویٰ مولانا عبدالباری نے دیا تھا۔ اس فتویٰ کی تمام تر ذمہ داری مولانا ابوالکلام آزاد پر ہے۔ غلام رسول مہر نے مجھ سے کہا کہ پنجاب، سندھ اور سرحد پر مولانا کا اثر ان کی نظر بندی سے پہلے تمام تھا۔ جب وہ لاہور جاتے تھے تو ایک ایک لاکھ آدمی دور دراز سے جمع ہوتے تھے اور اتنی گرمجوشی سے نعرۂ تکبیر بلند کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا آسمان پھٹ پڑے گا۔ سندھ پر مولانا کا اثر ان کے خط مورخہ 5 ستمبر 1920ء سے بھی ظاہر ہے جو انھوں نے عبدالرزاق ملیح آبادی کو بسلسلۂ تحریک امامت لکھا تھا اور جو اس سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ سندھ کے لوگوں نے غالباً اسی اثر کے ماتحت ہجرت پر زور دیا اور چل پڑے۔ ہندوستان سے جو لوگ گئے ان میں بعض ایسے تھے جن کا ذکر ضروری ہے:۔

(1) مولانا محمد علی صاحب قصوری۔ آپ ایک متبحر عالم سادہ مزاج اور بزرگ انسان تھے۔ [illegible] مسجد میں قرآن پاک پڑھاتے تھے۔ تانگے والوں اور عوام کو ملازمہ قرآن سے ... کر لیا۔ ... تب بھی علماء کی اس صف میں میں جو ... داخل ہو گیا ... سبق پڑھ رہے تھے۔ شومئی قسمت میری بیوی سخت علیل ہو گئیں اور مجھے چند روز کے لیے گھر جانا پڑا اور بقیہ سبق رہ گیا۔ مجھے ان کی شاگردی کا بڑا فخر ہے۔ آپ مولانا سندھی کے حکم سے ہندوستان میں کام کرنے کے لیے واپس کر دیے گئے تھے۔

(2) خان عبدالغفار خان اتمان زئی (پشاور)

(3) سردار محمد اسلم خاں بلوچستان

(4) عزیز ہندی

(5) عثمان صاحب بھوپالی

اور بہت سے کالجوں کے گریجویٹ مثلاً اقبال شیدائی (لاہور)، اکبر خان اور احمد شاہ خان (بھوپال) ان کے علاوہ مہاجرین کا جم غفیر بے سروسامانی کی حالت میں افغانستان کی طرف روانہ ہوا۔

انگریز کو افغانستان کی جغرافیائی پوزیشن، اس کی مالی حالت، جنگ و رسوری کی قوت خوب معلوم تھی، جس طرح اس نے خلافت والوں میں حامی خلافت روپیہ خرچ کر کے پیدا کیے تھے جو خونریزیاں کراتے تھے جس سے تمام یورپ دہل گیا تھا اور خلافت کی رقم رک گئی تھی اسی طرح اپنی ایجنٹوں کو کام میں لا کر اپنے گرگے چھوڑ دیے جو لوگوں کو اپنی ہجرت کے فتوے دکھاتے اور شرعی حکم کے وجوب کی جانب متوجہ کر کے ہجرت کی تلقین کرتے تھے۔ یہ بھی سبز باغ دکھاتے تھے کہ وہاں پہنچتے ہی تم کو ہر طرح کی راحت ملے گی اور تم مالدار ہو جاؤ گے چین کی زندگی گزارو گے۔

ظفر حسن ایبک لکھتے ہیں :-

"قافلے پے در پے جلال آباد اور وہاں سے کابل پہنچنے لگے۔ شروع میں ان کو خیموں میں جبل حضوری میں جگہ دی گئی لیکن ان سب کے لیے قابل اطمینان انتظام ناممکن تھا۔ بے چاری پردہ پوش عورتیں بڑی سخت مشکلات میں مبتلا ہوئیں۔ بعض مہاجرین کابلیوں نے ان پر رحم کھا کر مدد بھی کی۔ بعض لوگوں نے تو روٹی اور کپڑا حاصل کرنے کے لیے اپنا اثاث البیت بھی فروخت کرنا شروع کیا جس کو کابلیوں نے آدھے دام میں بھی نہ لیا۔ ان لوگوں کا ادھر وہاں سے بے یار و مددگار ہونا اس کی بے مائیگی پر دلیل اور ان پر دوستوں کا تعدد، یہ سب ایسی مصیبتیں تھیں جن کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے ان کو خود دیکھا ہو اور ان کا سامنا کیا ہو۔ آخر جب مہاجرین کی تعداد زیادہ بڑھنے لگی تو ان کو افغانستان کے دوسرے صوبوں مثلاً پنجشیر قطغن بدخشاں اور ترکستان کو روانہ کیا گیا۔ صرف چند یک و جوان ترکستان پہنچے اور وہاں سے تاشقند چلے گئے۔ کچھ قطغن اور بدخشاں میں آباد ہوئے مگر وہ بھی مالی مشکلات کی وجہ سے کچھ عرصہ نہ ٹکے بقیہ پھر کابل واپس آ گئے۔"[1]

کابل میں افغانیوں کی طرف سے مہاجرین کی سخت مخالفت ہوئی۔ ملکی اور غیر ملکی کا بھی سوال پیدا ہوا۔ حکام

---

[1] آپ بیتی صفحہ 213

افغانستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ ایک دن سب کو حکم ہوا کہ کوتوالی پر سب لوگ معہ بستر حاضر ہوں اور جب سب لوگ حاضر ہوئے تو ایک افسر نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ کر کے کہا کہ پانچ منٹ کا وقت دیا جاتا ہے کہ یہ فیصلہ کر لو کہ کابل سے نکل کر فلاں مقام پر جانے کے لیے تیار ہو یا نہیں۔ وہ مقام دلدلی تھا۔ ایک کالج کا گریجویٹ بھی مہاجرین میں تھا وہ بھی اسی طرح گھڑی پر نگاہ جمائے رہا اور پانچ منٹ گزرتے ہی کہا کہ "پانچ منٹ گزر گئے ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ ہم اب وہاں نہیں جائیں گے!" افسر سے کچھ نہ بن پڑا اور اس وقت بات ٹل گئی۔ بعدہٗ انھیں بجز افغانستان خالی کرنے کو کہا گیا۔ مہاجرین نے تب ایران جانے کا فیصلہ کیا۔ ایران کی حکومت کو اطلاع ہوئی تو وہاں کے اخبارات نے ان مہاجرین کا زبردست خیر مقدم کیا۔ اس زمانہ میں اخبار زمیندار کے دفتر میں ایرانی اخبارات آتے تھے ان میں لکھا گیا کہ ہم وہ ہیں جنھوں نے ہمایوں کو پناہ دی تھی۔ ہماری مہمان نوازی شہرہ آفاق ہے۔ ہم مہاجرین کو اپنی پلکوں پر جگہ دیں گے۔ اخبار "زمیندار" نے ایک زوردار مقالہ مہاجرین کی حمایت میں لکھا جس پر محمود طرزی کا ایک خط اس کی تردید میں دفتر زمیندار میں غلام رسول مہر کے پاس آیا۔ اس وقت تک مہاجرین کا قافلہ ایران کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ جب یہ لوگ جا رہے تھے تو افغانی دور دور کھڑے پکار رہے تھے "بزن ایں ہندیاں را ایں دزد استند" (مارو ان ہندوستانیوں کو یہ چور ہیں)۔ لیکن قبل اس کے کہ قافلہ اور آگے بڑھے انور پاشا نے ایک خط امیر امان اللہ خاں کو لکھا اور ان کو مشورہ دیا کہ مہاجرین کو جانے نہ دیں ورنہ ان کی حکومت کل دنیائے اسلام میں بدنام ہو جائے گی۔ یہ وقت تھا جب محمود طرزی نے اپنا تردیدی بیان اخبار زمیندار کو بھیجا تھا۔ چنانچہ مہاجرین واپس بلائے گئے لیکن مشکلات وہی تھیں اور رفتہ رفتہ سب لوگ بہت کچھ کھو کر واپس آ گئے۔ کچھ حاصل نہ ہوا۔ صرف اس تحریک کی تباہیاں اور بربادیاں مسلمانان ہند کو ایک دائمی سبق دے گئیں کہ ان کے لیے اپنے وطن کے ماسوا گنجائش نہیں ہے۔

مولانا آزاد کا منشا صرف یہ تھا کہ دین کے راستہ سے مسلمانوں کو سیاست میں داخل کریں جو عرصہ سے اسے شجر ممنوعہ قرار دیے ہوئے تھے اور تحریک خلافت نے براہ راست وہ کام کر دیا تو پھر اس درمیانی تدبیر کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔

یہ بات کہ ہجرت کا فتوی مولانا عبدالباری نے دیا تھا اس درجہ عام ہو گئی ہے کہ ظفر حسن ایبک نے اپنی "آپ بیتی" میں بھی بار بار لکھا ہے کہ ہجرت مولانا عبدالباری کے فتوی کی وجہ سے ہوئی۔ اور گویا کہ وہی اس کے آرگنائزر تھے۔ لیکن یہ بے بنیاد بات ہے۔ غلط فہمی کی اصل وجہ شاید یہ ہے کہ مولانا عبدالباری اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے مسلمہ قائد تھے اور عوام ہوں یا خواص، انگریزی تعلیم یافتہ ہوں یا علما سب میں یکساں مولانا کا اپنا وقار تھا کہ کسی بڑے پیمانے کی تحریک کا سوائے ان کی جانب سے ہونے کے اور کوئی

خیال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

مولانا نے ہجرت کے فتوے کو بہت سے قیود میں ڈال دیا تھا جس کو پڑھنے کے بعد کوئی اور نتیجہ نکالا ہی نہیں جا سکتا کہ مولانا نے اس کی ابتدا نہیں کی تھی اور نہ اس کے سرگرم حامی تھے اور نہ اسے فرض یا واجب کا درجہ دیا تھا جیسا کہ مولانا آزاد کا فتوی تھا۔ بلکہ اسی لیے مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا عبد الباری سے بحث بھی ہوئی تھی وہ بحث خالص علمی ہے کیونکہ مولانا ثناء اللہ نے خود نہ ہجرت کا فتوی دیا نہ مخالفت کی اس لیے اس بحث کو ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ البتہ مولانا کا فتوی ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ حقیقت منکشف ہو جائے۔ سب سے پہلے یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہجرت کے بارے میں مولانا نے از خود کوئی فتوی نہیں دیا۔ جیسا کہ مولانا آزاد نے کیا، جنھوں نے ایک مکمل رسالہ ہجرت بھی لکھ ڈالا تھا جس کا حوالہ خود مولانا نے اپنے فتوے میں دیا ہے اور جواب ناپید ہے۔

ایک مہاجر غلام محمد عزیز امرتسری نے ایک نادر رسالے کو یہ مضمون دیا "چونکہ مذہب اسلام ہم کو اس ملک میں رہنے کی اجازت نہیں دیتا اس لیے ہم مہاجرین کا مقصد ہے کہ ہم نہایت امن کے ساتھ اس ملک کو چھوڑ دیں۔ کیا ہم امید کر سکتے ہیں کہ آپ ہمارے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالیں گے" اسی کے ساتھ ہی انھوں نے مولانا عبد الباری سے فتوی بھی طلب کیا۔ چنانچہ مولانا نے حسب ذیل جواب دیا۔

> "ہجرت کے متعلق میں علانیہ کہتا ہوں کہ وہ تمام مسلمان جو اپنے ضمیر و مذہب کو یہاں مطمئن نہیں کر سکتے وہ اب اسلام کے احکام کے مطابق عمل پیرا ہوں اور اس ملک سے ہجرت کر کے ایسے مقام پر چلے جائیں جہاں اسلام کی خدمت انجام دینا اور اسلامی قوانین (شرع شریف) کے مطابق عمل کرنا بہتر طریق ممکن ہو۔"

سیاق و سباق سے معلوم ہوگا کہ مولانا نے نہ ہجرت کی دعوت دی نہ اس کو فرض و واجب قرار دیا۔ بلکہ صرف ان لوگوں کے لیے جائز کر دیا جو جانا چاہتے تھے۔

یہ اسی قسم کی انفرادی ہجرت کا جواز تھا جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے جنگ آزادی 1857ء کی ناکامی کے بعد دیا تھا اور جس کی بنا پر وہ ہجرت کر گئے اور ان کے نام کا جزو بن گیا ہے۔ مولانا عبد الباری کا یہ فتوی شروع مئی 1920ء کے اخبارات میں شائع ہوا جس پر کچھ لوگوں نے غلط فہمی کی بنا پر کچھ سوالات کیے۔ مولانا نے اس کی وضاحت کی اور مندرجہ ذیل تحریر اخبار مشرق گورکھپور کو، وانہ کی جو سوالات میں آگے آگے تھا اور 6 مئی 1920ء کی اشاعت میں طبع ہوئی ——— اس سے حقیقت کا مکمل انکشاف ہوتا ہے۔

فرنگی محل 2 شعبان 1338ھ

مکرمی دام مجدہٗ ۔ السلام علیکم

بعض حضرات نے مسائل ہجرت بذریعہ تار دریافت کیے ہیں۔ اس کا جواب دے دیا گیا مگر مفصل نہیں ہے اس واسطے ان کی تفصیل عرض کرتا ہوں۔ امید ہے کہ شائع فرما دیجیے گا۔

ہجرت شرعاً دو طریقوں پر مستعمل ہے۔ ایک ہجرت اوصاف سے دوسری اوطان سے۔ ہجرت اوصاف سے یہ ہے کہ ممنوعات شرعیہ کو چھوڑ دے اور اوامر کا پابند ہو۔ یہ ہجرت ہمیشہ ہمیشہ تک مشروع ہے۔ دوسری ہجرت اوطان سے۔ یہ چند اقسام کی ہے:

1۔ ہجرت مکہ سے حبشہ کی جانب دو مرتبہ ہوئی اس وقت جبکہ کوئی دار اسلام نہ تھا تو دار شرک سے دار اہل کتاب کی جانب ہجرت ہوئی یا دار ظلم سے دار عدل کی جانب۔ اور اگر نجاشی کا اسلام مان لیا جائے اور اس جگہ کو دار بوجہ سلطان کے فرض کیا جائے تو وہ بھی ہجرت دار اسلام کی جانب ہوئی۔

2۔ ہجرت مکہ شریف سے جو اس وقت دار حرب تھا مدینہ طیبہ کی جانب جو دار الاسلام تھا۔ یہ ہجرت فرض تھی اور فتح مکہ کے بعد منسوخ ہو گئی۔ یعنی جو ایمان لائے وہ ہجرت کرے تب تو تمام احکام میں مسلمانوں کا شریک ہے ورنہ نہیں۔ یہاں تک کہ توارث وغیرہ میں بھی حق نہیں ہوتا۔ امام رازی کے بیان کے مطابق یہ ہجرت اس وقت پھر فرض ہو جائے گی جب کہ مسلمانوں کی وہی حالت لوٹ آئے اور سوائے ایک مامن کے کوئی نہ ہو۔

3۔ ہجرت بادیہ نشین کی مدینہ طیبہ کی جانب۔ یہ حقوق میں مساوات حاصل کرنے کے لیے ضروری تھی۔ یہ بھی منسوخ ہو گئی بلکہ حکم ہو گیا کہ جہاں کوئی شخص ہو اور اس مقام پر نماز وغیرہ ارکان اسلام ادا کر سکتا ہو تو اس کو ہجرت کی ضرورت نہیں۔

4۔ دار فسق و ظلم سے دار عدل و تقوی کی جانب ہجرت۔ بلکہ اس زمین سے جہاں گناہوں کی کثرت ہو وہ خود مرتکب ہو یا دوسرے۔ یہ ہجرت مستحب ہے۔

5۔ دار حرب سے دار اسلام کی جانب ہجرت مستحب ہے اور بعض صورتوں میں واجب ہو جاتی ہے بلکہ توطن دار حرب میں بلا ضرورت شرعیہ حرام ہے۔ ہم لوگ ہندوستان کو دار الاسلام سمجھتے ہیں اور امر دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی نیت سے قیام کیے ہوئے ہیں۔ اس واسطے ہجرت فرض نہیں جانتے۔ مگر جب یہ درجہ ہو بجز اس کے کہ یا ہجرت کرے یا مبتلائے معصیت

رہے یا اس فضا میں عصبیت کا رنگ ہو، یہ لوگ وہاں سے اس قدر خدمت کر سکیں جتنی کہ وہ نکل کر کر سکتے ہیں تو ان صورتوں میں ہجرت مشروع ہے۔ موجودہ حالت میں ہندوستان سے اگر قابل و ذی استعداد لوگ کابل ہجرت کریں یا محض وقتی طور پر ترک وطن کر کے وہاں جائیں تو امید ہے کہ اسلام کو فائدہ اور مدد حاصل ہوگا اور اپنے وطن اور بیرون کی بھی خدمت کریں گے۔ احادیث سے آخر زمانہ میں شام کی جانب ہجرت کرنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

ظفر حسن ایبک جو ایک ذہین اور پرجوش نوجوان تھے، عبید اللہ سندھی کے دست راست تھے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"مولانا عبد الباری نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دے کر، جو صریحاً غلط ہے، فتویٰ دیا کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ یہاں سے ہجرت کر جائیں۔ اس پر پنجاب اور صوبہ سرحد میں ہجرت کی تیاریاں ہونے لگیں۔[1]

اس کے آگے وہ لکھتے ہیں کہ "امیر امان اللہ خاں کو امید تھی کہ ہماری جماعت کی طرح لکھے پڑھے ہندوستانی اس تحریک کے ذریعہ افغانستان آئیں گے لیکن یہاں تو یہ ہوا کہ جتنے ان پڑھ کاشتکار تھے سب تحریک میں شریک ہو گئے" پھر ان کے عظیم مصائب کا تذکرہ کیا ہے۔

ایبک نے لکھا ہے کہ "افغانستان میں جتنی کوتاہ اندیشی ہوئی اتنی ہی بد انتظامی ہندوستان میں ظہور پذیر ہوئی۔ کسی کو اس کا خیال تک نہ آیا کہ امیر کابل کو خط لکھ کر یا آدمی بھیج کر معلوم کریں کہ ان مہاجروں کی پذیرائی اور ان کے بسنے کے لیے کیا انتظامات کیے گئے۔ نہ ہی کسی کے عقل میں یہ بات آئی کہ ان مہاجروں کو چھوٹے چھوٹے قافلے کی شکل میں اور چند چند روز کے فاصلے سے بھیجا جائے تاکہ ایک قافلے کے رہنے کا اچھی طرح انتظام ہو جائے پھر دوسرا قافلہ روانہ کیا جائے۔ ہجرت کے فتویٰ کے بعد ہزاروں مسلمانوں نے اپنے گھر اور کھیت آدھے داموں پر بیچ دیے اور نتیجہ و عاقبت کو سوچے بغیر افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے۔"

ایبک کی یہ بات صحیح ہے لیکن اس کا الزام مولانا عبد الباری پر نہیں ہے۔

ہندوستان میں جوش و خروش

لندن اور پیرس میں دول عظمیٰ کی صلح کانفرنس ہو رہی تھی، اور مولانا محمد علی وفد لے کر لندن

---

[1] آپ بیتی صفحہ 209

گئے تھے اور وہاں کام کر رہے تھے۔ ادھر مسلمانوں کا جوش و خروش ہندوستان میں حد سے تجاوز ہو چکا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک طرف اپنے امام الہند ہونے کی بیعت لے رہے تھے تاکہ کل ہندوستان کے مسلمانوں کو متحد کر کے اور ان پر شرعی پابندی عائد کر کے انھیں سیاست میں لاکر ہوا کا رخ موڑ دیں ـــــ ہجرت کا فتویٰ بھی دے دیا تھا ' لوگ چل بھی پڑے تھے۔ عوام اپنے جذبات سے بے قابو ہو رہے تھے۔ جلسوں اور کانفرنسوں کی بھرمار تھی۔ مگر صرف جذبات میں ابال لانے اور بے مقصد قربانی دینے سے تو کوئی کام بن نہ سکتا تھا۔ البتہ ان صحیح جذبات کو عمل کے میدان میں جھونک دینے کے لیے مہاتما گاندھی مکمل عدم تعاون کا طبل جنگ بجانے کی تیاری میں معروف تھے۔ صلح کانفرنس کی بس ضابطہ کی خانہ پری کے لیے انتظار تھا۔

میرٹھ خلافت کانفرنس

چنانچہ 23 مارچ 1920ء کو میرٹھ میں خلافت کانفرنس بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ مہاتما گاندھی زمین کے کڑبنے ہوئے تھے اور بڑی دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ ہر ضروری آدمی سے مل کر بات کرنا ہر جلسہ میں شریک ہونا گویا انھوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔ میرٹھ کانفرنس میں بھی وہ شریک تھے۔ انھوں نے وہاں دلّی کے لیڈروں کا فیصلہ سنایا کہ اگر ترکی کے خلاف فیصلہ ہوا تو ہم کو اتنا اور کرنا ہوگا۔ اس میں عدم تعاون کی پوری اسکیم تھی۔ مہاتما گاندھی نے یہ بھی کہا کہ اس اسکیم پر عمل درآمد کرنے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔ پوری اسکیم کو مہاتما گاندھی نے اس طرح بیان کیا:۔

(1) تمام سرکاری خطابات اور سول عہدوں سے علیحدگی۔

(2) فوج اور پولیس کی نوکری سے علیحدگی۔

(3) ٹیکس اور دوسرے سرکاری واجب الادا رقوم کی ادائیگی سے انکار۔

اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور ابھی بھرپور ترک تعاون شروع بھی نہیں ہوا تھا نہ کسی جماعت نے اسے پاس کیا تھا کہ حکیم اجمل خاں صاحب نے پہل کی اور انھوں نے ڈپٹی کمشنر کو حسب ذیل چٹھی لکھی:۔

جناب!

ہندوستان کے مسلمانوں نے ابتدائے جنگ سے وقفِ جنگ کے زمانہ تک جس صبر و سکون کا ثبوت دیا وہ کوئی پوشیدہ چیز نہیں۔ باوجود انتہائی دلی تکلیفوں کے جن کا سلسلہ سلطنت عثمانیہ کے واقعات (دوران وقفہ جنگ) سے شروع ہوتا ہے۔ آج تک انھوں نے کسی جگہ ایک ادنیٰ دست درازی کی مثال بھی ہندوستان کے کسی حصہ میں پیش نہیں کی بلکہ وہ جنگ

میں برٹش فوجوں کے ساتھ درۂ دانیال، شام، عراق عرب اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصّوں میں بھی شریک کار رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مقامات مقدسہ محفوظ رہیں گے جیسا کہ ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن ان میں سے صحیح معنوں میں ایک بھی ان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ مکہ شریف جو مقامات مقدسہ میں سب سے زیادہ مقدس مقام اور مدینہ پاک جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدفن ہے اس وقت واقعی طور پر شریف حسین کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بیت المقدس اسلامی ہاتھوں سے لے کر یہودیوں کو دیا جا رہا ہے۔ اور عراق عرب کے تمام مقدس مقامات اس وقت براہ راست ہماری گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس طرح جزیرۃ العرب کا باقی حصّہ بھی بڑی حد تک برٹش اقتدار میں ہے۔ قسطنطنیہ اور تھریس کے متعلق جو وعدے کیے گئے تھے ان کے ایفا کرنے کے عوض میں خود قسطنطنیہ میں فوج اتار دی گئی ہے اور یہ تجویز کر لی گئی ہے کہ خلافت ہمیشہ کے لیے درۂ دانیال کے امن بخش توپوں کی زد میں رہے۔

مسلمانوں نے اب تک وہ تمام جائز ذرائع برٹش گورنمنٹ کی توجہ کو اپنے مطالبات کی طرف مبذول کرنے کے لیے استعمال کیے جو ان کے خیال میں آسکتے تھے لیکن ان کے حقوق اور ان کی درخواستوں کے کسی کم سے کم حصّہ کی طرف بھی التفات نہیں کیا گیا۔ ایسی حالت میں بحیثیت ایک حصّہ مسلمان کے ان عزتوں سے اسلطنت عثمانیہ کے خلاف برٹش گورنمنٹ کے طریقۂ عمل کو قابل اعتراض سمجھتے ہوئے دست کش ہوتا ہوں جو مجھے گورنمنٹ کی طرف سے عطا کی گئی ہیں۔ میں قیصر ہند گولڈ میڈل اور دوانگلستان اور ہندوستان کی تاج پوشی کے درباروں کے تمغوں کے ساتھ جنھیں میں آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں آج کی تاریخ سے حاذق الملک کے خطاب سے بھی اپنے آپ کو سبکدوش سمجھتا ہوں اور اس کے ساتھ یہ بھی درخواست کرتا ہوں کہ میرا نام درباریوں کی فہرست سے خارج کر دیا جائے۔ امید ہے کہ آپ براہ مہربانی میری اس چٹھی کو لوکل گورنمنٹ کی خدمت میں ان تمغوں کے ساتھ بھیج کر مجھے شکرگزار فرمائیں۔ چونکہ یہ مسئلہ پبلک سے تعلق رکھتا ہے اس لیے میں اس چٹھی کی نقل پریس کو بھی بھیج رہا ہوں۔[1]

اجمل

اسی طرح کالجوں میں بھی طوفان اٹھ رہا تھا۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور ہندوستان میں مسلمانوں کی

---

[1] "مشرق" مورخہ 18 اپریل 1920ء صفحہ 15

سب سے بڑی انجمن تھی۔ اس کی سرگرمی میں نہ صرف ایک عالی شان عربی مدرسہ اور ایک بڑا یتیم خانہ تھا بلکہ ایک ہائی اسکول ایک انٹر کالج ایک ڈگری کالج بھی تھا اور ایک بڑا پریس تھا جہاں تصنیف و تالیف کا بھی کام اعلیٰ پیمانے پر ہوتا تھا۔ انجمن حمایت اسلام کی مفید کتابیں سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے سرکاری امدادی مکاتب میں بھی وہیں کا کورس منظور شدہ تھا۔ اس کے کالج کے لڑکوں نے یونیورسٹی کو اپنے استعفیٰ داخل کر دیے۔ ان سے کہا گیا کہ استعفیٰ واپس لے لو خواہ تو عدم تعاون کی تحریک نہ ہو۔ مگر انھوں نے استعفیٰ واپس نہیں لیے۔

دیوبند کا عظیم الشان جلسہ

۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو دیوبند میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس جلسہ کا اعلان اشاعت کے لیے مختلف اخبارات مثلاً آفتاب، ہمدم، پیسہ اخبار، الخلیل میں بھیجا گیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ شیعیں دیوبند جہاں کہیں بھی ہوں اس کام میں اخلاص تدین اور فہم کے ساتھ حصہ لیں۔ چنانچہ جلسہ میں شہر اور دیہات کے ہزاروں مسلمان شریک ہوئے اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم نے اپنی بیماری اور ضعف کے باوجود ایک نہایت پر درد تقریر کی جس میں فرمایا کہ اسلام اور خلافت توأم ہیں۔ اور مسلمانوں سے کہا کہ اپنی کم طاقتی کا احساس ترک کر دیں کیونکہ اصل طاقت خدا کے ہاتھ میں ہے جس نے فرعون جیسے جابر کے مقابلے میں کمزوروں اور مظلوموں کی امداد کی تھی۔ تقریر اتنی پر درد اور دل گداز تھی کہ سارے مجمع پر رقت طاری ہو گئی۔ حتیٰ کہ مولانا شبیر احمد عثمانی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور جب وہ مولانا کے بعد تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کی آواز رندھ گئی اور وہ کچھ بول نہ سکے۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ حسب ذیل تار ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کو روانہ کیا جائے۔

"دیوبند کی مذہبی جماعت بھی جمہور اہل اسلام کی طرح تجزیہ ترکی پر جس سے خلافت اسلامیہ پارہ پارہ ہوتی جاتی ہے۔ ہز مجسٹی کی خدمت میں اپنے سخت گہرے صدمے و اضطراب کا اظہار کرتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کے ذمہ دار رکن ایک ایسی متدبرانہ حکمت عملی پیدا کرنے والی پالیسی کو ضرور تبدیل کریں جس کے نتائج بہت ہی خوفناک صورت پیدا کر سکتے ہیں اور جس سے برٹش گورنمنٹ کے موجودہ وعدے بے اعتبار ثابت ہوتے ہیں۔ کوئی فرد مسلم اپنی آنکھوں سے تمدن کی تباہی کو نہیں دیکھ سکتا۔"[1]

---

[1] "مشرق" ۸ اپریل ۱۹۲۰ء صفحہ 16

پھر مجمع نے نہایت تضرع وزاری سے دعا کی اور اس کے بعد مطبوعہ دعائے قنوت تقسیم کر دی گئی۔
یہ دعائے قنوت فجر کی نماز میں آخری رکعت کے رکوع سے اٹھ کر اور سمع اللہ لمن حمدہ کہہ کر اور سجدہ میں جانے سے قبل حالت قیام میں امام جہر غیر مفرد اسے پڑھتا تھا اور تب تکبیر کہہ کر سجدہ میں جانا ہوتا تھا۔ بتلایا گیا تھا کہ یہ دعا سخت اضطراب کی حالت میں پڑھی جاتی ہے۔ یہ دعا برسوں تک پڑھی جاتی رہی تھی۔ میں خود بھی پڑھتا تھا اور زبانی یاد کر لی تھی۔

19 مارچ 1920ء — یوم خلافت

17 اکتوبر 1919ء کو خلافت کمیٹی بمبئی کی ہدایت پر تمام ہندوستان میں یوم دعا منایا گیا تھا۔
اب 19 مارچ 1920ء کو گاندھی جی کے مشورے سے خلافت کمیٹی نے تمام ہندوستان میں یوم خلافت منانے اور قوم کو ستیہ گرہ کے لیے تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ تمام بڑے بڑے شہروں، ضلع اور تحصیل کے صدر مقاموں، قصبوں اور دیہاتوں تک میں یہ جلسے بڑے جوش و خروش سے منائے گئے۔ مکمل ہڑتال کی گئی۔ یہ جلسے تمام ہندوستان میں گویا ستیہ گرہ کے ریہرسل تھے اور پورے امن و امان کے ساتھ ہر جگہ جلسے ہوئے۔ مشرق گورکھپور نے اپنی 25 مارچ 1920ء کی اشاعت میں ضمیمہ ب پر حسب ذیل رپورٹ درج کی ہے:

"دہلی، کلکتہ، لاہور، بمبئی، لکھنؤ، بجنور، امروہہ، مرزاپور، جونپور، بنارس، کانپور، رائے بریلی، آگرہ، سہارنپور غرضیکہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں ہی میں نہیں بلکہ قصبات اور دیہات تک میں 19 مارچ کو عام ہڑتال ہوئی اور جلسے سکون اور خاموشی سے ہوئے۔ مسٹر گاندھی نے بمبئی کے جلسہ میں فرمایا کہ ابھی ضرورت باقی ہے کہ اور ہڑتالیں ہوں اور ستیہ گرہ کی جائے۔"

اسی میں صفحہ 17 پر درج ہے کہ:

"بستی شہر اور بکہ بازار میں عام ہڑتال ہوئی اور کاروبار بند ہو گئے تھے۔ تمام دن مسلمانوں نے دعاؤں اور عبادت میں گزارا۔ جمعہ کی نماز عیدگاہ میں بڑی جمعیت کے ساتھ ہوئی۔ مولانا سید فاخر الہ آبادی نے نماز پڑھائی۔ اور پر درد دعا میں حاضرین کو زار و قطار رلایا۔ 4 بجے دن سے ہندو مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ بابو درشن رام صاحب وکیل نے پرجوش تقریر میں یہ ظاہر فرمایا کہ ہندو برادران دل سے مسلمانوں کے ساتھ ہر نازک وقت میں شریک حال رہیں گے تمام وکلاء دوکاندار غرض ہر طبقے کے لوگوں کا ایسا عظیم الشان اجتماع بستی میں اس سے پہلے کبھی نہ

ہوا تھا۔ مولانا سید محمد فاخر صاحب نے دو گھنٹہ تقریر کی۔ کلکتہ خلافت کانفرنس کے ریزولیوشن دہرائے گئے اور وائسرائے ہند کی معرفت ملک معظم کو آخری پیغام پہنچایا گیا۔ یہی حال مضافات کا تھا یعنی گنیش پور، پانسی وغیرہ۔"

اس کے بعد اور اس کے پہلے کانفرنسوں اور جلسوں کی بھرمار تھی۔ جلسوں میں جاکر اور تکبیر کے پرزور نعرے لگا کر مسلمان اپنے جوش کا اظہار کرکے اور حکومت برطانیہ سے اختلاف کرکے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتے تھے۔ اور کسی راہ عمل کے منتظر تھے۔ چنانچہ 22 اپریل 1920ء کو فیض آباد میں اودھ کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان ہوا اور مختلف جگہوں پر جلسے منعقد ہوئے لیکن رہنمایان قوم نے اب ٹھوس کام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اپریل 1920ء کے آخری ہفتے میں مولانا عبدالباری کا حسب ذیل خط ہمدم لکھنؤ میں شائع ہوا۔

"خلافت کانفرنسیں بقدر ضرورت ہوئیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ جہاں مسلمان ضرورت سمجھیں کریں لیکن محض دکھاوے کی ایسی کانفرنسوں کے انعقاد کی اب ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ میری رائے یہ ہے کہ مسلمان اس سلسلہ کو موقوف کریں۔ خصوصاً بغیر اجازت سنٹرل کمیٹی بمبئی کے انعقاد کسی کانفرنس کا خلافت کے متعلق ہرگز مناسب نہیں ہے۔ اور شرکت اس قسم کے جلسہ کی اصولاً روا نہیں ہے۔ وقت کام کرنے کا ہے۔ دوسروں پر بیجا بار نہ ڈالے۔ اگر ملک کے کسی حصہ میں ضرورت انعقاد کانفرنس کی ہو تو مقامی حضرات اس میں شرکت فرمائیں۔ ایک دو مقرر و علماء باہر سے بھی بلا لیے جائیں مگر تمام مشاہیر کی دعوت بلا ضرورت قابل ترک ہے۔ میں نے اپنے متعلق فیصلہ کر لیا ہے کہ سوائے اس صورت کے میری شرکت سے معتد بہ فائدہ مقصود ہو۔ محض نمائش کے لیے اور رعایت جلسوں کی شرکت سے انکار کر دوں گا... مجھ سے میرے احباب خواہش کرتے ہیں کہ میں سربرآوردہ حضرات کو ان کی مرضی کے موافق تکلیف دوں اب تک اس خدمت کو انجام دیا۔ اب اس قدر زائد یہ خدمت لی جانے لگی ہے کہ اس کے انجام دینے سے قاصر ہوں۔ میری حالت یہ ہے کہ؎

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

اسی طرح کا موقع دہلی میں جب 18 اپریل 1920ء کو 11 بجے دن کے وقت ورکرز کانفرنس رائل تھیٹر دہلی میں زیر صدارت مولانا حسرت موہانی منعقد ہوئی جس میں مولانا احمد سعید نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ خلافت کمیٹی نہ مسلمانوں سے ہجرت کو کہتی ہے نہ جہاد کو۔ وہ چاہتی ہے کہ گورنمنٹ کے ساتھ عدم اشتراک عمل کے اصول کام میں لائے جائیں اور سودیشی تحریک کی ترقی کی کوشش کی جائے۔

صدر صاحب نے فرمایا کہ اس کانفرنس کا مقصد کسی نئی پالیسی کا ایجاد کرنا نہیں ہے بلکہ جو تجاویز خلافت کانفرنس یا انجمن علماء ہند پاس کریں ان کو عمل میں لانا ہے۔ ہندوستان کے تمام لیڈر اور خلافت کانفرنس سودیشی عدم اشتراک عمل کی تجاویز پاس کر چکے ہیں۔ ان کو عملی جامہ پہنانا اس کانفرنس کا فرض اوّلین ہے۔

لاہور میں ڈاکٹر کچلو کی معرکتہ الآرا تقریر

لاہور میں ایک میلہ چراغاں ہوتا ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں نے ایک عظیم الشان جلسہ 28 مارچ 1920ء کو کیا جس کی صدارت ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے فرمائی۔ یہ جلسہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ڈاکٹر کچلو نے تحریک عدم تعاون کی پرزور تائید دلائل قطعی سے کی۔ آپ نے فرمایا:

"جہاد ہر وقت فرض ہے درنہ اس وقت جب اسلام پر کوئی طاقت حملہ آور ہو اور مذہبی جنگ ہو۔ اس وقت مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ جہاد کے لیے تیار رہیں لیکن جہاد کے مختلف طریقے ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ میں تلوار ہے تو یہ جہاد بالسیف ہے۔ اگر آپ کے پاس تلوار نہیں توپ بندوق جنگی جہاز اور پورا پورا ساماں نہیں ہے تو اس حالت میں ہمارا مذہبی فرض کیا ہے؟ ایسی حالت میں اگر اعلان کر دیا جائے کہ مسلمانو! اٹھو اور انگریزوں کو مار ڈالو۔ آپ نے اگر ایک دو درجن انگریز مار ڈالے تو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوا ایک ہوائی جہاز آپ کے لیے کافی ہے۔ جلیانوالہ باغ کا قتل عام آپ کو معلوم ہے۔ ایسی حالت میں مذہب آپ کو تلوار سے جہاد کرنے پر مجبور نہیں کرتا

ہجرت کا سوال

اپنے بال بچوں سمیت تن تنہا یا سامان سمیت کسی دوسرے ملک کو چلے جائیں۔ ہمارے پاس جہاز اور وسائل نہیں۔ سات آٹھ کروڑ کی آبادی کہاں جا سکتی ہے۔ یہ بھی ناممکن العمل ہے پھر باقی کیا رہ گیا۔ دونوں سے زبردست طاقت جس کے ذریعہ سے آپ ایک دو کے مدبر ملکوں جیسے جیت سکتے ہیں۔ (1) تمام خطابات گورنمنٹ کو واپس کر دیے جائیں (2) فوج اور پولیس کی ملازمت کو ترک کر دیں (3) ٹیکس، محصول وغیرہ کی ادائیگی سے انکار۔[1]

---

[1] مشرق 8 اپریل 1920ء صفحہ 17

علمائے صوبہ متحدہ کا عظیم الشان جلسہ

5 و 6 اپریل 1920ء کو علمائے صوبہ متحدہ کا ایک عظیم الشان جلسہ تمام علماء کو مسئلہ خلافت پر مجتمع کرنے کے لیے منعقد ہوا کثیر تعداد میں علماء و عوام شریک ہوئے۔ اس جلسہ میں جوش و خروش کی تقریروں کے ساتھ حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں:۔

(1) علماء فوراً مسئلہ خلافت میں رائے عامہ کی تیاری کا کام اپنے ذمہ لیں۔

(2) مخالف و منافق علماء کا مقاطعہ کیا جائے۔

(3) خلافت کانفرنس کلکتہ کے تمام ریزولیوشن اور مولانا عبدالباری کی اس تقریر کی جو ممدوح نے اس موقع پر کی تصدیق و تائید کی جائے۔

(4) مولانا عبدالباری کا فتویٰ شائع کر دیا جائے۔ خلافت کے فیصلہ پر اس پر عملدرآمد کیا جائے

(5) حکیم اجمل خاں کو سرکاری خطاب و اعزاز کی واپسی پر مبارکباد دی جائے اور انھیں لوی فتاً مسیح الملک و رئیس الملک کا خطاب لسان قدر دانی عطا کیا جائے۔

(6) یہ جلسہ تمام خطاب یافتگان علماء پر زور دیتا ہے کہ بہت خطابات واپس کر دے۔

(7) علماء جہاں وہاں تقریر و تحریر سے مسئلہ خلافت کی تائید کرنے کا حلف اپنے مریدوں اور تمام مسلمانوں سے لیں۔

(8) سپاہ کی بھرتی روکی جائے۔

(9) مسلمان تمام تبلیغی صداقت کے مانع ہونے والے حجاب سے اپنے کو الگ رکھیں۔

(10) مجلس کانفرنس کلکتہ مسئلہ خلافت میں احکام شرع اسلام کے مخالف فیصلہ ہونے کا دن انگریزی حکومت سے کامل آزادی کا بھی دن ہو۔

علماء کی ایک جمعیت کی ترتیب دی گئی جس میں 42 ارکان تھے اور مولانا عبدالماجد بدایونی اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ بدایوں صدر دفتر قرار دیا گیا۔ گورنمنٹ ان جلسوں، جلوسوں سے بہت پریشان تھی، ہر جلسہ کے وقت گورنمنٹ نے اپنی فوجیں مشین گن کے ساتھ مارچ کی تھیں مگر پبلک نے خائف ہونا تو کجا اس کا نوٹس بھی نہیں لیا۔ نظام حیدرآباد کے متعلق مشہور ہوا تھا کہ جب خلافت کے لیے بعد نماز جمعہ دعا ہو رہی تھی تو انھوں نے بڑے زور سے آمین کہا تھا اور خواجہ حسن نظامی نے بھی گورنمنٹ ہند کو نظام کی حمایت خلافت کی اطلاع دی تھی جس کا ذکر مولانا محمد علی نے بھی تعجب کے ساتھ کیا اس لیے ان کو مجبور کیا گیا اور 7 اپریل 1920ء کو اعلیٰ حضرت

بندگان عالی متعالی حضور نظام مدظلہ العالی نے اپنے دستخط سے ایک فرمان جاری کیا جس میں تمہیدی الفاظ کے بعد حسب ذیل حکم تھا۔

"میں اپنی عزیز رعایا کو محفوظ رکھنے کی غرض سے حکم دیتا ہوں کہ مسئلہ خلافت کے تعلق سے جو جلسے منعقد ہوں ان کے منتظمین پر شرائط ذیل کی پابندی عائد کی جائے۔

(1) ایسے جلسوں میں جو تحریکات پیش کرنی منظور ہوں قبل از قبل ان کے متعلق بغرض صدور حکم سرکار گزارے جائیں۔

(2) جلسے کے مقام اور تاریخ کی اطلاع کم از کم ایک ہفتہ قبل ناظم فوجداری ضلع یا ناظم فوجداری بلدہ کو (جیسی کہ صورت ہو) بذریعہ تحریر دی جائے۔

(3) ہر جلسے کی صحیح روئداد بلا توقف ناظم فوجداری ضلع یا ناظم فوجداری بلدہ کے پاس (جیسی کہ صورت ہو) بغرض اطلاع سرکار کو بھیج دی جائے۔

(4) ان ہدایات کی خلاف ورزی سخت باز پرس کے قابل ہوگی۔[1]

اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی کے حکم پر گردن جھکانے کے دن گزر چکے تھے۔ چنانچہ حکم عدولی ہوئی۔ گرفتاریاں اور نظر بندیاں ہوئیں لیکن قافلہ رواں دواں رہا۔

---

[1] "مشرق" 15 اپریل 1920ء صفحہ 20

ساتواں باب

اعلان وفاداری کا انجام

حالات یورپ و ترکی

اب آیئے ان حالات کو یہیں چھوڑ کر حالات ترکی پر نظر ڈالیں۔ مگر کچھ اور لکھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اناطولیہ، تھریس اور سمرنا کی جغرافیائی پوزیشن بتلا دی جائے کیونکہ اکثر لوگوں نے صرف ان باتوں سے محبت کرنا سیکھا ہے۔ یہ کہاں ہیں اور کیا ہیں کم لوگ جانتے ہیں۔

اناطولیہ

اناطولیہ ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی مشرق کے ہیں اور جغرافیہ میں اس کا اطلاق ایشیائے کوچک اور سلطنت عثمانیہ کے بعض دیگر ایشیائی حصوں پر ہوتا ہے۔ رومیوں کے زمانے میں اناطولیہ کو ایشیائے کوچک کہتے تھے۔ اناطولیہ کا رقبہ بارہ ہزار مربع میل ہے۔ یہ سات سو میل زیادہ سے زیادہ لمبا اور چار سو میل زیادہ سے زیادہ چوڑا ہے۔ اندرون ملک پہاڑوں کا سلسلہ ہے جن میں سب سے بڑا کوہ طورس ہے جو ساحل بحر سے دریائے فرات تک جاتا ہے۔ دریاؤں میں سب سے بڑا دریا ساقاریہ ہے۔ یہیں حکیم فیثاغورث اور مشہور ریاضت دان ہومر پیدا ہوئے۔

اناطولیہ کا مشہور شہر انگورہ قسطنطنیہ سے 215 میل کے فاصلہ پر مشرق و جنوب مشرق گوشے پر واقع ہے اور سمرنا سے 330 میل جنوب مشرق کی طرف ہے۔ دور سے یہ ایک بہترین کارآمد اور خوش نما شہر ہے۔ تیسرا شہر بروصہ ہے جہاں مسجد خضرا بہت مشہور ہے۔ سمرنا ایک عظیم الشان اور خوبصورت شہر خلیج ازمیر کی مشرقی سرے پر واقع ہے۔ سیمسون ایشیائے کوچک (اناطولیہ) کا مشہور بندرگاہ بحیرۂ اسود کے کنارے پر واقع ہے۔ سینوپ اناطولیہ کا ایک مشہور شہر اور بندرگاہ ہے مشہور فلسفی دیو جانس کلبی یہیں پیدا ہوا تھا۔ جانقیہ

یہ شہر انگورہ سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ایک پرفضا پہاڑی کا نام ہے۔ یہیں ایک گاؤں بھی آباد ہے جو انگورہ کا گویا ایک محلہ ہے۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا چانقیہ میں رہتے تھے۔ طرابزون قسطنطنیہ سے 900 کلومیٹر اور ارض روم سے 140 کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک مستحکم شہر ہے۔ عسکی شہر بروصہ کے ضلع میں ہے اور ریلوے اسٹیشن بھی ہیں۔

تھریس

ترکی کا ایک صوبہ تھریس ہے جس میں مسلمانوں کے مشہور شہر ایڈریانوپل (اڈرین) اور روڈسٹو واقع ہیں۔ ایڈریانوپل میں سلطان سلیم کا مقبرہ ہے اور بہت عالیشان مساجد ہیں۔ اس کا ایک علاقہ روڈسٹو گیلی پولی سے صرف 60 میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہیں پر اگست 1922ء میں یونانیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھا تھا جس کا پردہ غازی مصطفےٰ کمال نے اپنی شمشیر جاں شگاف کے نوک سے چاک کر دیا۔

یونان کا حملہ

عارضی صلحنامہ نے ترکان حرار و دنیائے اسلام کے دماغ میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ ابھی عارضی صلحنامہ کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ 5 مئی 1919ء کو جہاں صلح کانفرنس بیٹھی ہوئی تھی اور جہاں ہر سلطنت کو جیسے وہ اپنے مفاد قومی کے خلاف پاتا تھا ٹھکرا دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اخباروں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ابھی حریفی میں لڑائی کا دم خم باقی ہے۔ کلیمنشو وزیر اعظم فرانس اور لائیڈ جارج کی تائید سے یونانیوں کو اناطولیہ پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ یہ ایک انوکھی بات تھی۔ عارضی صلح کے بعد حالات بدستور قائم رکھے جاتے ہیں جب تک کہ مکمل صلح نہ ہو جائے۔ لیکن ترکی کے ساتھ سبھی واسطہ نئی جنگ کا منتہا تھا۔ تمام روایت شرافت، اصول انصاف سب کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ انگریز کا یہ دعویٰ تھا کہ اناطولیہ میں ترک اقلیت میں ہیں اور ترکوں کو وہی علاقے دئیے گا جہاں وہ کثریت میں ہیں اور اس کے لیے صرف پچاس ہزار کی آبادی کا ایک حلقہ تجویز کیا گیا تھا۔ گر ایسا ہو بھی جاتا حالانکہ یہ کذب صریح تھا تو اس کے لیے رائے شماری کی ضرورت تھی اس کا بھی انتظار نہیں کیا گیا اور ترکی کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لیے 13 مئی 1919ء کو اتحادی بیڑوں کی حمایت میں یونانی فوج سمرنا میں اتری جو کہ بندرگاہ بھی ہے۔ یونانیوں اور اتحادیوں کے لیے یہ ایک بہترین موقع اپنے آتش عناد کو بجھانے کا تھا۔

ادھر قسطنطنیہ کا یہ عالم تھا کہ جو لوگ ظل سلطانی سے وابستہ تھے سب ہمت ہار گئے اور گریہ مسکین بنے ہوئے تھے حتیٰ کہ ترکی پر حکم برداری قائم ہو جانے کو غنیمت سمجھتے تھے۔ مجلس ملی (ترکی پارلیمنٹ) نے کچھ دم خم دکھایا اور ایک تجویز احتجاج کی مرتب کی۔ لیکن سلطان نے مجلس ملی کو برخاست کر کے داماد فرید پاشا کو وزیر اعظم علی کمال کو وزیر داخلہ اور عادل بے اور محمود علی کو وزارت میں داخل کر کے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یا یوں کہیے کہ عنان داماد فرید پاشا کے سپرد کر دیا۔ ترکان احرار قتل کیے جا رہے تھے اتحادی اور یونانی جنگی جہاز قسطنطنیہ کے

سامنے لنگر ڈالے پڑے تھے۔ بیرون ملک کے اثر کل کلیدی جگہوں پر قابض تھے۔ عوام بے چین تھے۔ باصوفیہ میں یک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ ایک لاکھ کے قریب لوگ جمع تھے۔ اس کے اوپر انگریزی ہوائی جہاز پرواز کر رہا تھا۔ مفتی اعظم جو مولانا محمود حسن کے ذہنی ساتھی اور ان کے مشن کے حامی تھے انھوں نے خلیفۃ المسلمین کے کہنے سے مدافعت ترک کرنے کا فتویٰ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیے گئے اور دوسرے شیخ الاسلام لائے گئے جو لسان العصر اکبر مرحوم کی زبان میں "برگیڈ" کے مولوی تھے۔ بہ تعرف ؎

برگیڈ کے مولوی کو تم جانتے ہو کیا ہے ۔۔۔ برٹش کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے

یونان کے حملہ کے ساتھ ہی دنیائے اسلام میں ہر جگہ انگریز کے خلاف بغاوت پھیلی ہوئی تھی۔ افغانستان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ عراق میں مجاہدین کی ایک لاکھ فوج بغداد کی طرف کوچ کر رہی تھی۔ ایران میں انگریزی ریشہ دوانیوں کے خلاف بغاوت ابھر رہی تھی۔ بالشویک روس لینن کی سرکردگی میں دنیائے اسلام کو ہر جگہ انگریز سے نبرد آزما ہونے کے لیے ابھار رہا تھا اور ہر ممکن امداد دے رہا تھا۔ انور پاشا اور ان کے ساتھی انگریزوں کے مظالم کے ڈر سے وطن چھوڑ کر یورپ چلے گئے تھے۔ اور یہی حال جمال پاشا اور دیگر ترکان احرار کا تھا۔ وہاں انور پاشا فروری 1920ء میں روس آئے چنانچہ لینن نے اقوام مشرق کی ایک کانفرنس باکو میں منعقد کی۔ وہاں انور پاشا بھی شریک ہوئے۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ روس ایران کی انقلابی جماعتوں کو بھی بغاوت کے لیے اکسا رہا تھا۔

ادھر امیر فیصل اور فرانس کے معاملات طے نہیں ہو رہے تھے۔ فرانس شام پر حکم برداری قائم کرنے پر اصرار کر رہا تھا اور امیر فیصل اپنی غداری کا پورا صلہ مانگتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ مطلق العنان بادشاہ بنا دیا جائے۔ یہ بات فرانس کو کیسے منظور ہو سکتی تھی اور فرانس کا خیال تھا کہ انگریز فتح کے تجارے میں اس کو دھوکا دے رہا ہے۔ اور مدبرین برطانیہ فرانس کی دوستی کا جو راگ بار بار الاپتے تھے اس سے وہ متاثر نہیں ہوتا تھا۔ اٹلی کو بھی یہی شکایت تھی۔ انگریز چودھری بنا ہوا تھا۔ لیکن وہ سب کو مطمئن نہیں کر پا رہا تھا کیونکہ اس کی پالیسی فریب کاری پر مبنی تھی۔ مسٹر ولسن صدر امریکہ نے جو چودہ پوائنٹ دیے تھے ان کا ماننے والا کوئی نہ تھا۔ سمندروں کی آزادی انسانوں کی آزادی، حق خود ارادیت وغیرہ وغیرہ کے خوشنما الفاظ کو عمل کا جامہ پہنانا استعماریت سے دست برداری دینا تھا۔ مسٹر ولسن اس بات کا غم کرتے رہے کہ جس لیے انھوں نے معاملات یورپ میں مداخلت کی تھی وہ پورے ہوتے نظر نہیں آتے ہیں۔ صلح کانفرنس میں وہ کامیاب نہیں ہوئے اور آخر کار مایوس و نامراد امریکہ واپس آئے اور اپنی اس ناکامی سے اس درجہ بددل ہوئے کہ مارچ 1921ء میں وہ گوشہ نشین ہو گئے اور سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی۔

ان وجوہات سے صلح کانفرنس جو کبھی لندن اور کبھی پیرس میں ہوتی تھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ رہی تھی۔

ادھر انگریزوں نے 16 مارچ 1920ء کو استنبول پر قبضہ کر لیا اور جو بھی ترکان احرار میں سے ان کو ملا اس کو تہہ تیغ کر دیا۔ انگریز کا منشا ترکی کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا تھا۔

اخبار ہفتہ وار مشرق اپنی اشاعت مورخہ 18 مارچ 1920ء میں صفحہ 3 پر لکھتا ہے:۔

"قسطنطنیہ میں ایک عظیم الشان مظاہرہ مسئلہ خلافت کے متعلق ہوا ہے۔ مسجد ایا صوفیہ کے پاس ایک وسیع میدان میں یہ مظاہرہ ہوا تھا۔ اس کی غرض و غایت یہ تھی کہ موجودہ سیاسی حالت پر بحث کی جائے اور ایک یادداشت دول معظم کے پاس بھیجی جائے۔ بعد نماز جمعہ جلسہ کا آغاز ہوا۔ یہ میدان دس ہزار میٹر کی وسعت رکھتا ہے پورا میدان آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مسجد ایا صوفیہ اور مسجد سلطان احمد کے درمیان یہ میدان ہے اور ان دونوں مسجدوں کے تیس سو گنبدوں نے بعد نماز ظہر پہلے خدائے پاک سے دعا مانگی کہ اسلام کو نجات ہو۔ ایک فرانسیسی خاتون نے ایک پر جوش تقریر میں کہا کہ فرانسیسی قوم اس قرارداد کے خلاف رہے گی جو ترکوں کی مصالح کے خلاف ہو۔ رضا نور وغیرہ کی تقریریں ہوئیں اور ایک یادداشت سلطان المعظم اور صدر دین و وزرائے یورپ کے پاس بھیجی گئی جو حسب ذیل ہے:۔

آستانہ خلافت اسلامیہ کا مرکز ہے۔ سمرنا کو اس کے مالکوں کی طرف منتقل ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ وہ جنوبی مسلموں کی خدر گاہ ہے اور ایک ہزار سال سے برابر وہ ترکوں کے ہاتھ میں ہے۔ اڈریانوپل سلطنت عثمانیہ کے ساتھ رکھا جائے کیونکہ آستانہ علیہ کے دفاعی خطوط کا آخری خط ہے۔ اناطولیہ کے مشرقی و مغربی حصے ترکی میں شامل ہیں اور ان کے باشندے اکثر مسلمان ہیں۔"

مگر ان تمام کارروائیوں کا دول متحدہ اور صلح کانفرنس پر نہ تو اثر ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔

معاہدہ سیورے (ترکی کے ساتھ شرائط صلح)

آخر کار مستقل صلح مختم فیصل ترکی بن کر بھی آ گیا اور دول متحدہ نے مئی 1920ء میں ترکی کے ساتھ صلح کے شرائط مشتہر کر دیے جو معاہدہ سیورے کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ کی حسب ذیل شرطیں تھیں:۔

(1) درۂ دانیال اور دیگر درے بین الاقوامی کنٹرول کے حوالے کر دیے گئے۔

(2) سلطان بحیثیت سردار مسلمانان درۂ دانیال کے پھاٹک (GOLDENHORN) پر سمندر کے کنارے انگریزوں کی آنکھ کے نیچے رہے گا۔

(3) جنوبی اناطولیہ کلیسیا اور اس کا دارالسلطنت ادرنہ واپس کرے گا۔

(4) اٹلی کو ادلس کی ریاست دی گئی۔

(5) سمرنا یونان کے حوالے ہوا۔

(6) سمندر کے سب راستوں سے منقطع ہو کر ترکی کو وسطی اناطولیہ دیا گیا۔

(7) عرب صوبے انگلستان اور فرانس کی حکم برداری میں دے گئے۔

(8) آرمینیا کے لیے ایک جدید ریاست وجود میں لائی گئی جو مشرقی صوبوں پر بحر اسود کے کنارے واقع ہوگی۔

(9) 2 نومبر 1917ء کو یہودیوں کی انجمن سے فلسطین میں وطن دینے کا جو وعدہ انگریزوں نے کیا تھا اس کے مطابق طے ہوا کہ یہودیوں کو فلسطین میں وطن دیا جائے اور مسلمانوں سے جو وعدہ کیا گیا تھا اسے قطعی فراموش کر دیا گیا۔

(10) ترکی کی سرحد اس طرح رہے گی جس طرح کہ اس وقت حد بندی ہو چکی ہے۔ لیکن وہ کمیشن جو حد بندی کے لیے مقرر کیا جانے والا ہے وہ حسب ضرورت اس میں ترمیم کر سکتا ہے۔ اس کے مطابق ترکی میں تھریس کا علاقہ قسطنطنیہ کا علاقہ اور اناطولیہ کو چھوڑ کے وہ تمام علاقہ جات شامل ہوں گے جن میں ترکی کی آبادی کی اکثریت ہو۔

(11) قسطنطنیہ میں ترکی حقوق و اختیارات میں کچھ فرق نہیں پڑے گا لیکن اگر ترکوں نے اس عہد نامہ کے شرائط کو بہ وفاداری سے پورا نہ کیا تو اتحادیوں کو ان شرائط میں ترمیم کرنے کا اختیار رہے گا۔

(12) ذیل کے سمندری علاقے ”اسٹریٹ“ (آبنائے) کے کمیشن کے زیر اقتدار رہیں گے۔ یعنی وہ تمام سمندری علاقے جو بحیرۂ روم کے درہ دانیال کے دہانہ اور بحیرۂ اسود کے باسفورس سے جنوبی علاقہ کے درمیان ہے۔ ان حدود سے ترکی بے تعلق رہے گا۔

اس اعلان صلح سے دشمنانِ اسلام تک ملی مجاہد جو ان دنوں تک کوشش میں تھے آرمسٹرانگ اپنی کتاب اتاترک میں لکھتا ہے کہ اس کو دیکھ کر سلطان وحید الدین خان کے چہرے کا رنگ بھی زرد پڑ گیا۔

آٹھواں باب

مہاتما گاندھی کا اعلان جنگ

مہاتما گاندھی کی قیادت

مہاتما گاندھی نے اب یہ پوری سکیم ستیہ گرہ، عدم تعاون یا اہنسا کو آہستہ آہستہ پیش کر دی تھی۔ وہ کہتے تھے سچ بولو، ہر کام کی بنیاد سچائی پر ہو، جو سوچو وہ کہو، جو کہو وہ کرو، زندگی میں کوئی دھوکہ نہ ہو، انگریز سے نفرت نہ کرو، انگریز بھی ہمارے بھائی ہیں، اس طرز حکومت سے نفرت کرو جو قائم ہے۔ اہنسا پر عمل ہو، تشدد کسی حال میں نہ آنے پائے۔ عورتیں چرخہ کاتیں۔ مرد کھدر پہنیں۔ اس طرح کئی کروڑ روپیہ جو ہندوستان سے باہر کپڑے کے لیے جاتا ہے ہندوستان میں بچ جائے گا۔ گورنمنٹ سے کسی قسم کا تعاون نہ ہو۔ طلبا اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکل آئیں۔ وکلا وکالت چھوڑ دیں۔ پولیس اور فوج کے ملازمین، دیگر ملازمین سرکار کی طرح استعفیٰ دے دیں۔ گاندھی جی نے کہا کہ ہماری اسکیم پر لوگ عمل درآمد کریں تو ایک سال میں سوراج حاصل ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی بڑے دانا تھے۔ وہ ملک کے عوام کا مزاج بدلنا چاہتے تھے۔ ان کے دل سے احساس کمتری اور غلام ہونے کا خیال مٹانے کے خواستگار تھے۔ صرف اسی نفسیاتی انقلاب سے ہندوستان آزادی کی منزل کی طرف بڑھ سکتا تھا۔ آزادیٔ ملک سے پہلے وہ ضمیر کی آزادی ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک باطن کا تزکیہ اور قلب کی صفائی لازمی تھی۔ جب انسان کھدر پہنے، چرخہ کاتے، کوٹ پتلون، ٹائی سے بے نیاز ہو تو اس کا ردعمل ایک انقلابی شکل میں نمایاں ہوگا۔ ان انوکھی باتوں سے ہندوستان کو جھنجھوڑ دیا۔ اور ہندو ان کو ایک اوتار سمجھنے لگے اور ان کے درشن کی طلب شروع ہو گئی۔ گاندھی جی نے گھڑی کی سوئی کو گھما دیا۔

گاندھی جی زمین کا گز بنے ہوئے چاروں طرف دوڑ رہے تھے۔ خلافت اسلامیہ سے جو ہمدردی انھوں نے ظاہر کی اور جس خلوص سے وہ مسلمانوں کے ساتھ میدان میں آ گئے اس کا اثر ہر کہ و مہ پر تھا اور بہت

جلد وہ مسلمانانِ ہند کے مسلّمہ لیڈر بن گئے۔

حکومت نے لڑائی جیتنے کے بعد جابجا جشن منانے کا فیصلہ کیا تھا اور آستاں بوسانِ سرکارِ عالیہ برطانیہ قع مرتب کرنے میں مشغول تھے۔ 17 اکتوبر 1919ء کو جو یومِ دعا و جلسہ تجویز کیا گیا تھا اسی میں یہ طے کر دیا گیا تھا کہ مسلمان جشنِ فتح یا صلح، جو بھی کہیے، اس میں شریک نہیں ہوں گے اور اس کا بائیکاٹ کریں گے۔ اس فیصلے کو خلافت کانفرنسوں اور جلسوں میں دہرایا گیا۔ مولانا حسرت موہانی جیسا عظیم انسان بے لوث جذبے سے بار بار اس پر زور دیتا تھا۔ مہاتما گاندھی نے بھی اس کی تائید کی۔ ہر وہ موقع جہاں قوم کو ابھار کر حکومت کے خلاف دلیری سے کھڑا کرنے کا آیا اسے گاندھی جی نے استعمال کیا۔ اس طرح اوہامِ غلامی سے گھرے ہوئے دماغ کو وہ آزادی کی فضا میں لانے اور دل کی اجڑی ویران بستیوں کو حبِ وطن سے معمور کرنے کا نہایت مدبرانہ و مخلصانہ عمل کر رہے تھے۔ اس طرح قوم اپنے کو پہچاننے لگی تھی۔ اس کے اندر خودشناسی کا شعور پیدا ہو رہا تھا اور جتنا قوم اپنے کو پہچانتی جا رہی تھی وہ اپنے قائد کو بھی پہچان رہی تھی۔ اب اس کا وہ حال نہ تھا:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

دوسری خلافت کانفرنس دہلی زیرِ صدارت مولوی فضل الحق کے سلسلہ میں 24 نومبر 1919ء کے منعقدہ اجلاس کا حال اخبارات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ خلافت کانفرنس کا یہ اجلاس اپنی نوعیت کے لحاظ سے اہم ترین تھا۔ کیونکہ اس میں خلافت کانفرنس صرف خلافت کے مسائل پر غور کرنے کے لیے مادرِ وطن کی دونوں قوموں کے قائم مقام جمع تھے۔ گاندھی جی، سوامی شردھانند، پنڈت کرشن کانت مالویہ، ڈاکٹر ساورکر، مسٹر شنکر لال، مسٹر موہن جی وغیرہ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

وقتِ مقررہ پر گاندھی جی ہال میں داخل ہوئے۔ سب لوگوں نے جے کارے لگائے اور سروقد کھڑے ہو گئے۔ گاندھی جی کا استقبال کیا گیا۔ خواجہ حسن نظامی، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، ڈاکٹر انصاری، سیٹھ عبداللہ ہارون، جان محمد چھوٹانی، ڈاکٹر ساورکر، خان بہادر شاہ ولایت حسین اور مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی نے استقبال کیا۔ اس کے گاندھی جی کرسیِ صدارت پر تشریف لائے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ گاندھی جی پر اس قدر پھول پھینکے گئے کہ ان کے گرد پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ جناب دانا اور خلیق کی نظمیں پڑھی گئیں۔ اس کے بعد گاندھی جی نے تقریر فرمائی جس میں آپ نے خلافت کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور کہا کہ اگر مسلمانوں کے دل رنجیدہ ہیں تو ہندو ان کے ساتھ شریک ہیں۔ اس کے بعد حکیم اجمل خاں نے ایک تجویز پیش کی کہ جب تک خلافت کا مسئلہ حل نہ ہو مسلمانوں کے لیے جشنِ صلح میں شریک ہونا ناممکن ہے۔ سوامی شردھانند نے نہایت پرزور تقریر میں اس کی تائید کی۔ سید حسین، کرشن کانت مالوی اور مسٹر موہن جی وغیرہ نے

بھی پرجوش تائیدی تقریریں کیں اور تجویز پاس ہوئی۔ اس کے بعد گاندھی جی نے مختصر تقریر کی جس میں آپ نے کہا کہ کسی آدمی کو کسی طرح ضلع کی جوشی میں شریک ہونا چاہیے۔ خاکساری دکھانی چاہیے۔ ضلع کے جوش میں شریک ہوتے ہوئے باز رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد گاندھی جی نے خلافت کمیٹی کے لیے چندہ کی اپیل کی اور ہدایت خود ایک پیسہ کا عنایت کیا۔ بس کیا تھا پیسہ نیلام ہوا اور اسے 501 روپیہ میں سیٹھ چھوٹانی نے خرید لیا۔ ایک ہزار نقد چندہ وصول ہوا اور ڈیڑھ ہزار کا وعدہ ہوا۔

اس کے بعد ایک دوسرے جلسے میں عورتوں کا مطالبہ درشن کا تھا۔ گاندھی جی نے کہا میں بت نہیں ہوں کہ میرا درشن کیا جائے۔ یہ کام کا وقت ہے۔ عورتوں سے کہا کہ تم چرخہ چلاؤ تو میں خود آکر تم سے درشن کروں گا اور تمھارے پاؤں چھوؤں گا۔

دورِ خود شناسی

30 مئی 1920ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ بنارس میں ہوا۔ مولانا محمد علی اسی دن بنارس سے گزرے لیکن کسی وجہ سے انھوں نے جلسہ میں شرکت نہیں کی۔ اس جلسے میں طے ہوا کہ اصلاحات کے مسودے میں ترمیم کا مطالبہ کیا جائے۔ اسی دن خلافت کمیٹی کا بھی جلسہ ہوا۔ خلافت کمیٹی نے ایک سب کمیٹی اس امر پر غور کرنے کے لیے بنائی کہ ترک موالات کیا قدم اٹھایا جائے۔ اس کمیٹی کے ممبران مہاتما گاندھی، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ اس کمیٹی نے اتفاق رائے سے طے کیا کہ کوئی بڑا قدم اٹھانے سے پہلے صلح کانفرنس کے فیصلے کا انتظار کرلیا جائے۔

مہاتما گاندھی نے اس دوران ایک ہندو مسلم کانفرنس یکم جون 1920ء کو بلائی۔ یہ جلسہ بڑی شان و شوکت سے منعقد ہوا۔ تقریباً تین سو ڈیلی گیٹ ہندوستان کے گوشے گوشے سے آئے اور مجمع قریب بیس ہزار تھا۔ اس جلسے میں مسز بسنٹ، پنڈت مدن موہن مالویہ، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر چنتامنی ایڈیٹر لیڈر وغیرہ بھی تھے۔ سر تیج نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ تحریک ترک موالات یا مشتبہ گروہ میں حصہ نہ لیں۔ مگر رائے عامہ بالکل اس کے خلاف تھی۔ چونکہ معتدلین بھی اس جلسے میں موجود تھے کسی انتہا پسندانہ تحریک کا پاس ہونا تو مشکل تھا البتہ ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت و اہمیت پر زوردار تقریریں ہوئیں۔

گورنمنٹ کو الٹی میٹم

9 جون 1920ء کو الہ آباد میں خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوا کہ وائسرائے کو ایک ماہ کی نوٹس دی جائے

کروہ خلافت کے مسئلہ کو جو یک مذہبی مسئلہ ہے طے کر دیں ورنہ ترک موالات پر ہم لوگ مجبور ہوں گے۔ یہ انتباہ دستہ گروہ کے اصول کے بالکل مطابق تھا۔ بلکہ کھلا کر کر۔ سچائی پر اڑنا مخالف کو موقع دینا اور اطلاع دے کر سول نافرمانی کرنا اس کے بنیادی اصول تھے۔ ممکن ہے کہ لوگ اس وقت نہ سمجھے ہوں لیکن گاندھی جی عزم راسخ کر چکے تھے۔ اس کے بعد ہی خلافت کمیٹی کا ایک وفد مرتب کیا گیا جو حسب ذیل اشخاص پر مشتمل تھا۔

(1) مظہر الحق

(2) یعقوب حسن

(3) مولانا شوکت علی

(4) مولانا ابوالکلام آزاد

اس وفد نے وائسرائے ہند سے آخر جون 1920ء میں ملاقات کی اور وائسرائے سے کہا کہ خلافت کا مسئلہ ہم مسلمانوں کے لیے یک مذہبی مسئلہ ہے۔ اس لیے آپ حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈالیں کہ وہ معاہدہ صلح ترکی میں مناسب ترمیمات ہمارے مطالبات کے مطابق کرے ورنہ ہم مجبور ہوں گے کہ یکم اگست 1920ء سے ترک موالات کی تحریک جاری کر دیں۔

یہ پہلا اتنی میٹم جو حکومت عالیہ برطانیہ کی وفادار رعایا نے اول بار اپنے آقاؤں کو دیا۔ گویا طوق غلامی اتار پھینکا اور آزاد انسانوں کی حیثیت سے بالمقابل کھڑے ہو کر چیلنج دے دیا۔ اب صرف طبل جنگ بجنے کی دیر تھی۔ اس سے پہلے 22 جون 1920ء کو مہاتما گاندھی نے بھی وائسرائے ہند سے اپیل کی جس میں لکھا کہ میں نے سدا ہی انگریزی راج کی بہبود کو ملحوظ رکھا ہے۔ محنت و جانفشانی سے بھرتی کرائی اور ہمیشہ برطانیہ کا وفادار رہا۔ میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ مسئلہ خلافت کو مسلمانوں کی مرضی کے مطابق کرا دیجئے۔ اب بھی وقت باقی ہے۔ ورنہ مجبوراً میں پہلا شخص ہوں گا جو علم بغاوت بلند کرے گا۔ میری رائے میں مسلمانوں کے لیے موجودہ حالات میں صرف تین راستے باقی ہیں:۔

(1) جہاد بالسیف

(2) ہجرت

(3) عدم تعاون

مسلمانوں کو میں نے عدم تعاون کا مشورہ دیا ہے۔

پنڈت مدن موہن مالویہ نے ذمہ لیا کہ وہ راجاؤں کو چرخہ چلانے کی ترغیب دیں گے۔ سرلا دیوی چودھرانی جو خود رجواڑے کے خاندان سے تھیں چرخہ چلانا سیکھ لیا تھا۔ بہادر رتنا دیوی جو جلیانوالہ باغ کے

قتل عام کے موقع پر کرفیو کے باوجود سینکڑوں زخمیوں کے بیچ تمام رات جھٹی رہی تھیں چرخہ چلا رہی تھیں۔ سر تیج بہادر سپرو نے جو مشورہ مسلمانوں کو دیا تھا کہ وہ ترک تعاون نہ کریں اس کے خلاف گاندھی جی نے ینگ انڈیا میں ایک گرم مضمون لکھا۔

جہاں تک جلیانوالہ باغ کے قتل عام اور پنجاب کے مظالم کا معاملہ تھا ہندوستان کے ہندوؤں کا متفقہ مطالبہ تھا کہ جو افسران ذمہ دار پائے گئے ہیں فوراً معطل کر دیے جائیں۔ لیکن وائسرائے نے اسے ماننے سے انکار کر دیا اور مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے وائسرائے کی تائید کی جس سے عام غم و غصہ میں شدید اضافہ ہو گیا۔

ادھر مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ ان میں ہیجان کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ انھوں نے کھدر پہننا اور گاندھی ٹوپی حتیٰ کہ رامائن سے شروع کر دیا تھا۔ لمبے کرتے اور گھٹنے پاجاموں کا رواج کانگریس کے عام جلسوں میں بھی دیکھا جا رہا تھا اور ایک مذہبی جوش میں جولائی اور اگست میں تقریباً 18 ہزار آدمی ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔ ہجرت کا فتویٰ صحیح تھا یا غلط اسے علما جانیں۔ لیکن اس سے مسلمانوں کے گہرے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اپنے وطن اور مال و املاک کو چھوڑ کر جلاوطن ہو جانا کچھ آسان کام نہیں ہے۔

دھماکے کا وقت قریب آ رہا ہے

یکم اگست کا دن قریب آ رہا ہے۔ خلافت کمیٹی نے تمام ہندوستان کے لوگوں سے زوردار اور پُرزور اپیل کی ہے کہ یکم اگست کے دن کو کامیاب بنایا جائے۔ 28 جولائی 1920ء کو گاندھی جی نے تمام اپنے ملک کو آواز دی اور یکم اگست 1920ء سے ترک موالات شروع کرنے کے لیے پکارا۔ گاندھی جی نے کہا کہ جب تک رولٹ ایکٹ منسوخ اور معاہدہ سیورے میں ترمیم نہ ہو ہماری مہم جاری رہے گی۔

یکم اگست 1920ء "زیرو آور"

زیرو آور آ رہا ہے۔ تمام ملک میں زبردست تناؤ تھا۔ یکم اگست 1920ء سے تمام ہندوستان میں عدم تعاون کے آغاز جنگ ہونے والا تھا۔ سر دھڑ کی بازی لگنے والی تھی اور گاندھی پکارنے والا تھا:

ما چو بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

وفاداری کا اظہار، برطانوی رعایا ہونے کا تخیل، عرضداشتوں وفود اور کاسۂ گدائی کا زمانہ "نقش و نگار طاق نسیان" اور ہندوستان معرکہ کارزار بننے والا تھا۔ مسلمان ادنیٰ اور اعلیٰ حکومت برطانیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے لیے صف اول کے سپاہی بننے والے تھے۔ یہ وہی مسلمان تھے جو کل تک عالی جاہ حکومت میں شمار ہوتے تھے

یکم اگست 1920ء کا دن آیا اور بڑے دھوم سے اس کا استقبال ہوا۔ تمام ہندوستان جاگ گیا۔ حلف لیے گئے۔ بے شمار جلسے ہوئے۔ مادرِ ہند پر جان تک کی قربانی دینے کا عہد کیا گیا۔ خلافت عثمانی پر فدا ہو جانے کا جذبہ عروج پر تھا۔

اس دن کا آغاز خود مہاتما گاندھی نے اپنے امتیازی خصوصی تمغہ جات اور خطابات کی واپسی سے کیا۔ انھوں نے وائسرائے کو لکھا کہ "میں قیصر ہند گولڈ میڈل جو مجھے افریقہ میں خدمت انسانیت کے اعزاز میں عطا کیا گیا تھا اور زولو وار میڈل جو 1906ء میں بحیثیت افسر انچارج انڈین ایمبولینس کور مجھے عطا ہوا تھا اور بوئر وار میڈل جو مجھے بحیثیت سپرنٹنڈنٹ انڈین اسٹریچر بیئرر کور 1899ء تا 1900ء میں ملا تھا وہ سب واپس کر رہا ہوں۔ ان تمغات کو میں کیسے استعمال کر سکتا ہوں جب ہمارے ہندوستانی مسلمان بھائی اس ظلم کے نیچے کراہ رہے ہیں جو ان کے مذہبی جذبات کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ پنجاب میں جبر و استبداد کا جو خونی ڈرامہ کھیلا گیا وہ ایک مزید وجہ میرے اس طریقۂ عمل کی ہے۔ گاندھی جی نے اس خط میں بھی حکومت برطانیہ سے اپنی سابقہ وفادارانہ خدمات کا تفصیل سے تذکرہ کرنے کے بعد لکھا کہ اب میں وفادار نہیں رہ سکتا۔

10 اگست 1920ء کا دن آیا اور صلح نامہ کے مسودہ پر بلا ترمیم دستخط کا مطالبہ ہوا اور ترکوں کی جانب سے توفیق پاشا نے کس طرح لرزتے ہاتھوں سے دستخط کر دیے جس طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انھوں نے پہلے صلح کا مسودہ لیا تھا۔ بس ڈرامہ مکمل ہو گیا اور معاہدہ سیورے میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ دانشوران فرنگ کے مضامین خصوصی، ہندوستان کا احتجاج مصر اور افغانستان کی مخالفت اور تمام دنیائے اسلام کی آہ سب بے اثر ثابت ہوئی۔ کیا خوب فرمایا شاعرِ مشرق نے:

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

انگریز اس زعم میں تھا کہ ہم ان نہتے ہندوستانیوں کو پیر کے نیچے کچل کر ختم کر دیں گے۔ اب مولانا محمد علی کی شعلہ بار تقریریں گاندھی جی کی معیت میں طوفانی لہروں کی طرح تیز دوروں کے درمیان شروع ہو رہی تھیں۔ مولانا محمد علی لندن اور پیرس میں ناکام ہونے کے بعد خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں اپنی عقیدت و وفاداری کے اظہار کا تار بھیج کر آئے تھے۔ اور اب جبکہ میدان کارزار آراستہ ہو گیا تھا، وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ انگریز کی استعمار پسندانہ پالیسی ہی ہمارے زوال کا باعث ہے۔ ہندوستان انگریز کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ہندوستان سے انگریزوں کو اتار پھینکو تو دنیائے اسلام کے سینہ سے ایک بھاری سل ہٹ جائے گی۔ یہی ایک راستہ انگریز سے مقابلہ کرنے اور خلافت اسلامیہ کو پھر زندہ کرنے کا ہے۔ مولانا محمد علی کی علمیت و فضیلت، ان کا انداز خطابت، ان کے الفاظ کی شوکت اور سب سے زیادہ ان کے دل کا سوز و گداز ان سب نے

مل کر عوام و خواص کے دلوں میں ایک انتقامی جذبہ بھر دیا اور انھوں نے سمجھا کہ ایک گرتی ہوئی دیوار آزادی ہندستان سے پھر سنبھل سکتی ہے۔ مولانا محمد علی کہتے تھے کہ چرخہ ایک توپ ہے جس کے گولے براہ راست انگریز کے قلب پر گرتے ہیں۔ جذباتی تقریروں کے امام وہ تھے اور گاندھی جی جو عزم راسخ کر چکے تھے اس کی تکمیل کے لیے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ پنجاب، سندھ، مدراس وغیرہ کے اسٹیشنوں پر ان کا زبردست استقبال ہوا۔ رفتہ رفتہ اسکولوں اور کالجوں سے لڑکے نکلنے لگے۔ کچہریوں سے وکلائے ہند نے علیحدگی اختیار کرنا شروع کر دیا، خطابات واپس ہونے لگے اور لوگ نوکریوں سے استعفیٰ دینے لگے۔ وائسرائے ہند نے ان تمام باتوں کا مذاق اڑایا۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ مضحکہ اور طنز کے تیروں سے اس تحریک کو اکھاڑ دیں گے۔ لارڈ چیمسفورڈ نے ایک بیان میں ان کارروائیوں کو تمام احمقانہ اسکیموں میں سب سے زیادہ احمقانہ قرار دیا اور کہا کہ یہ فضول غلط تصور پر مبنی حقیقتاً مجنونانہ ناقابل عمل اور خواب و خیال ہے۔ وقت نے ثابت کیا کہ لارڈ چیمسفورڈ کتنی ہولناک غلطی میں مبتلا تھے۔ انھوں نے سمندر کو ساکت سمجھا تھا حالانکہ اس میں بلا کا طوفان تھا۔

پانچ سو علما کی جانب سے ترک موالات کا فتویٰ

اس دور ابتلا میں ہر طبقۂ خیال کے علماء کرام یک جہت و ہم زبان ہو گئے تھے۔ مثلاً دیوبندی فکر کے مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، اہل حدیث طبقہ کے مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالحکیم گیاوی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی، بریلوی جماعت کے مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل، مولانا عبدالماجد بدایونی، معتدل طبقہ کے اور شمالی ہند کے قدیم مرکز اسلام سے تعلق رکھنے والے مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا سلامت اللہ صاحب فرنگی محلی، مولانا آزاد سبحانی ناظم مدرسہ الٰہیات کانپور، علامہ سید سلیمان ندوی ناظم ندوۃ العلماء اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد حیدر بہاری۔ غرض ہندستان کے اکابر علماء سالہا سال کے اختلافات اور گروہ بندیوں کو نظر انداز کر کے تحریک خلافت میں شانہ بشانہ کام کر رہے تھے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب اور مولانا سید فاخر صاحب مرحوم ہر کانفرنس میں نمایاں نظر آتے تھے۔

مولانا حفیظ الرحمن صاحب واصف "تاریخ جمیعۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" میں صفحہ ۶۶ پر تحریر فرماتے ہیں:-

> "نومبر ۱۹۱۹ء میں خلافت کانفرنس کی تقریب سے تمام اطراف ہند کے علماء کی ایک مقتدر جماعت جمع ہو گئی۔ خلافت کانفرنس کے اجلاسوں سے فراغت کے بعد تمام علماء موجودین نے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں صرف حضرات علماء ہی شریک تھے۔ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب کی تحریک

اور مولانا منیر الزماں صاحب اور دیگر حاضرین کی تائید میں جناب فاضل علامہ حضرت مولانا عبد الباری صاحب اس جلسے کے صدر قرار پائے اور کارروائی شروع ہوئی۔ تمام حاضرین جلسے نے بالاتفاق طے کر لیا کہ علماء کی ایک جمعیۃ قائم کی جائے اور اس کا نام جمعیۃ علمائے ہند رکھا جائے اور اس کے حلقے کو تمام ہندوستان کے لیے وسیع کر دیا جائے۔ چنانچہ تمام حاضرین نے اسی وقت جمعیۃ کی رکنیت منظور کر لی اور جمعیۃ علمائے ہند قائم ہو گئی۔"

مولانا ثناء اللہ صاحب کی تحریک اور دیگر حضرات کی تائید سے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اس جمعیۃ کے عارضی صدر منتخب ہوئے۔ اس سے صاف طور پر نمایاں ہے کہ تمام علمائے اسلام متحد و متفق ہو کر خلافت کانفرنسوں میں شریک ہوتے تھے اور ہر طرح کی امداد فرماتے تھے۔

اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم بنائے گئے۔ حسب ذیل حضرات جو موجود تھے رکن قرار دیے گئے:۔

1 ۔ حضرت مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی
2 ۔ مولانا سلامت اللہ صاحب فرنگی محلی
3 ۔ مناظر اسلام مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری
4 ۔ حضرت پیر محمد امام صاحب
5 ۔ مولانا اسد اللہ صاحب سندھی
6 ۔ مولانا سید محمد فاخر صاحب سجادہ نشین
7 ۔ دائرۂ شاہ اجمل الٰہ آباد
8 ۔ مولانا مولوی محمد انیس صاحب
9 ۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی
10 ۔ مولانا سید کمال الدین صاحب
11 ۔ مولانا قدیر بخش صاحب
12 ۔ مولانا تاج محمد صاحب سندھی
13 ۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب دربھنگہ
14 ۔ مولانا خدا بخش صاحب مظفر پوری
15 ۔ مولانا مولا بخش صاحب امرتسری
16 ۔ مولانا عبد الحکیم صاحب گیاوی
17 ۔ مولانا محمد اکرم صاحب
18 ۔ مولانا منیر الزماں صاحب
19 ۔ مولانا محمد صادق صاحب
20 ۔ مولانا سید داؤد غزنوی صاحب
21 ۔ مولانا سید اسماعیل صاحب
22 ۔ مولانا محمد عبید اللہ صاحب
23 ۔ مولانا آزاد سبحانی صاحب

یہ کل علماء کے نام نہیں ہیں صرف ان حضرات کے نام ہیں جو خلافت کانفرنس میں شریک ہونے آئے تھے اور وہیں جمعیۃ علمائے ہند کی بنیاد رکھ دی۔ اس میں نامورانِ ہند ہیں جن میں سے ایک ایک کے لاکھوں پیرو تھے۔ مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے امرتسر میں پہلے جلسہ کی دعوت دی۔

6 ستمبر 1920ء کو جمعیۃ علماء کا ایک جلسہ کلکتہ میں زیر صدارت مولانا تاج محمد صاحب سندھی منعقد ہوا اور 8 ستمبر 1920ء کو پانچ سو علماء کے دستخط سے ترک موالات کا فتویٰ شائع ہوا۔ یہ فتویٰ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار نے تحریر فرمایا تھا۔

جمعیۃ علماء کی پہلی مجلس عاملہ پہلی مرتبہ ۹، ۱۰ فروری 1922ء بمقام دہلی بنائی گئی اس کے ارکان حسب ذیل تھے:۔

1۔ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب
2۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی صاحب
3۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں
4۔ مولانا شبیر احمد عثمانی
5۔ مولانا عبدالماجد بدایونی
6۔ مولانا مظہر الدین از الامان
7۔ مولانا عبدالقادر قصوری
8۔ مولانا حسرت موہانی
9۔ مولانا احمد اللہ پانی پتی
10۔ مولانا آزاد سبحانی
11۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی
12۔ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی

لوکمانیہ تلک

ہندوستان کے آسمان سیاست پر گاندھی کے نمودار ہونے سے قبل لوکمانیہ تلک ہندوستان کے مسلّم لیڈر تھے۔ انہی کے شاگرد مولانا حسرت موہانی تھے۔ گاندھی جی برابر اعلان کرتے تھے کہ وہ سیاسی آدمی نہیں بلکہ ایک مذہبی آدمی ہیں۔ گاندھی جی نے جب آل انڈیا ہوم رول لیگ کی صدارت مسز بسنٹ کے الگ ہونے کے بعد منظور کی تو کہا کہ آج اوّل بار میں سیاست میں داخل ہو رہا ہوں۔ اس کے برخلاف تلک اپنے کو سیاسی آدمی کہتے تھے۔ ان کا اصول یہ تھا کہ ممکن ذریعہ سے ہندوستان کی آزادی حاصل کی جائے۔ اس لیے ان کا خیال تھا کہ پنجاب کے خونیں واقعات اور خلافت سے جو عظیم جذبات ابھرے ہیں ان کا استعمال مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم میں کیا جائے۔ 23 جولائی 1920ء کو تلک کی سالگرہ تھی۔ یکم اگست کو رات کے بارہ بج کر 40 منٹ پر اچانک وہ اس دنیا سے گزر گئے۔ جو عظیم ماتم ہندوستان میں تلک کی موت پر ہوا وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ جب ان کی راکھ دریائے گنگا میں ڈالنے کے لیے لائی گئی تو اس وقت میں یونیورسٹی اسکول آف الہ آباد کا طالب علم تھا۔ ہم سب لڑکے ہندو اور مسلمان ننگے سر اور ننگے پیر دریائے گنگا کے کنارے تک گئے تھے۔ ان کے مرنے پر گاندھی جی نے ان کی لاش اٹھانی چاہی تو کچھ لوگوں نے اعتراض کیا۔ گاندھی جی نے کہا "ایک محب وطن کی کوئی ذات نہیں ہوتی ہے۔" اور گاندھی جی، مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر کچلو نے ان کے جنازہ کو کندھا دیا۔ حسرت نے دریائے گنگا کے کنارے ایک

نظم پڑھی جس کا مطلع یہ ہے:۔

ماتم ہو نہ کیوں بھارت میں دنیا سے سدھارے آج تلک

بلونت تلک مہراج تلک ، آزادی کے سرتاج تلک

اس وقت تمام ہندوستان کے سامنے یہ سوال تھا کہ اب ہندوستان کی قیادت کون کرے گا اس سوال کا حل جو ب قوم کو صدا ایسا ہے وہ ایسا تھا کہ قلب سے وہی ایک صدا نکلی۔

کلکتہ میں کانگریس کا اسپیشل اجلاس

4 سے 9 ستمبر 1920ء تک کلکتہ میں کانگریس کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ لالہ لاجپت رائے جو ابھی امریکہ سے آئے تھے اس اجلاس کے صدر مقرر ہوئے۔ یہ جلسہ خصوصیت سے اس لیے منعقد ہوا تھا کہ مسئلہ خلافت پر بحث و گفتگو کی جائے اور کانگریس اپنے روایتی راہ عمل کو ترک کر کے اب راست اقدام اور ترک موالات کے میدان میں قدم رکھے۔ اس اجلاس کے پہلے گاندھی جی، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے ہندوستان میں کافی دورے کر کے ملک اور ترک موالات کے لیے تیار کر دیا تھا۔ اس اجلاس کے لیے عوام میں بڑا جوش و خروش تھا اور اس میں شرکت کے لیے تمام قطاع ہند سے پانچ ہزار ڈیلی گیٹ آئے تھے۔ اور تقریباً ایک لاکھ سے زیادہ آدمیوں کا مجمع تھا۔ مولانا شوکت علی نے راستہ میں ٹرین کے اندر ہی گاندھی جی سے ترک موالات کی تجویز کا مسودہ تیار کرا لیا تھا۔ اس تجویز کا منشا یہ تھا کہ حکومت برطانیہ سے ہر قسم کا عدم تعاون کیا جائے۔ بالخصوص

(1) گورنمنٹ کے دربار وں اور کل سرکاری جلسوں کا مکمل مقاطعہ کیا جائے۔

(2) بچوں کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں سے اور ان اسکولوں اور کالجوں سے جو سرکاری امداد پاتے ہیں باہر نکال لیا جائے اور ان کے لیے آزاد خود کفیل ادارے قائم کیے جائیں۔

(3) فوج، کلریکل اسٹاف اور مزدور جماعت کے لوگ میسوپوٹامیہ میں جا کر کام کرنے سے قطعی انکار کر دیں۔

(4) تمام ممبران کونسلوں سے استعفیٰ دے دیں۔

(5) بدیشی کپڑوں کا مکمل مقاطعہ کیا جائے۔

اس وقت دستور کو مسلم لیگ کا بھی جلسہ ہوا۔ مسلم لیگ نے بھی ترک تعاون کے تجویز کی تائید کی مجلس خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علمائے ہند کے میدان میں آجانے کے بعد مسلم لیگ بائیں بازو میں پہنچ گئی تھی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس زمانہ کی مسلم لیگ کانگریس کی مخالف نہ تھی۔ خلافت کانگریس کا بھی اجلاس زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد

انھیں دنوں میں منعقد ہو۔ مولانا آزاد نے اپنے اسی خطبۂ صدارت کو خلافت کے مسئلہ پر عوام و خواص کی آگاہی کے لیے ایک مبسوط کتاب کی شکل دے دی۔

کانگریس اور خلافت کانفرنس کے اجلاس میں ترک موالات کی تجویز جوش و خروش کے ساتھ منظور ہوئی۔ اس کانگریس کے اجلاس میں مسٹر محمد علی جناح نے تنہا اس کی مخالفت میں آواز بلند کی۔ بہرکیف کانگریس کے اسپیشل سیشن نے خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے لیے اب ہری جھنڈی دکھلا دی۔ جب تک گاندھی جی اپنے عظیم انفرادی اثرات اور خلافت کمیٹی کی پشت پر ہی سے چلاتے رہے تھے۔ اب مہاتما گاندھی نے اپنا پورا پروگرام قوم کے اندر پھونک دیا۔

حکومت عوام و خواص کے جوش و خروش اور ان بے شمار جلسوں، جلوسوں اور گاندھی جی کی مسلمہ قیادت سے گھبرا گئی اور اس نے امتناعی حکم جاری کیا اور کہا کہ لوگ اس میں حصہ لینے سے گریز کریں ورنہ طاقت کا استعمال کیا جائے گا۔ حکومت نے یہ بھی اعلان کیا کہ گاندھی جی کے ساتھ جو رعایت رولٹ بل کے خلاف احتجاج کے سلسلہ میں روا رکھی گئی تھی وہ اب روا نہ رکھی جائے گی۔ اس کا جواب گاندھی جی نے یہ دیا کہ اپنے پورے پروگرام کی مختلف طریقوں سے اشاعت کرتے ہوئے خود کو بڑے چیلنج کی دعوت دی۔

آخر اگست میں گاندھی جی کی رہنمائی میں گجرات پولیٹیکل کانفرنس صرف مسئلہ خلافت پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوئی اس میں عدم تعاون کی مخالفت ہوئی لیکن عدم تعاون کی قرارداد 1855 آرا کی موافقت اور 823 کی مخالفت سے پاس ہوگیا۔ تمام مسلمانوں نے بالاتفاق موافقت میں ووٹ دیے بجز محمد علی جناح کے جنھوں نے مخالفت کی اور ووٹ بھی خلاف دیا۔

ان دنوں گاندھی جی اپنے نظریات کو سمجھانے کے لیے لمبے لمبے مضامین لکھ رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی کلچر کو ترک کرکے ہندوستانی کلچر اختیار کرنا چاہیے اور اس کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ تعلیم آزاد ہو چنانچہ انھوں نے نومبر 1920ء میں آزاد گجرات یونیورسٹی گجرات ودیاپیٹھ کی بنیاد رکھی۔

مہاتما گاندھی نے 27 اکتوبر 1920ء کو ایک کھلا خط ہندوستان میں مقیم تمام انگریزوں کے نام شائع کیا جس میں انھوں نے اپنی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ نظام کو ناحق و بے صداقت کہا اور انگریزوں سے اپیل کی کہ وہ حالات کو سمجھیں اور گورنمنٹ کو صحیح مشورہ دیں۔

ناگپور کانگریس

آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس 26 دسمبر 1920ء کو ناگپور میں منعقد ہوا اس کے صدر راگھواچاریہ تھے۔ حکومت برطانیہ نے اسی زمانہ میں پرنس ڈیوک آف کناٹ کے ہندوستان کے دورہ کرنے کا

پروگرام تیار کیا۔ وہ لیجسلیٹو کونسل کا افتتاح کرنے اور ہندوستان کو یہ فریب دینے آرہے تھے کہ برطانیہ نے ہندوستان سے جو وعدہ کیا تھا وہ ایفا کر دیا اور اسے نیابتی حکومت کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ گاندھی جی نے تجویز کی کہ ڈیوک کا بائیکاٹ کیا جائے اور تجویز پاس ہونے کے بعد ڈیوک آف کناٹ کو ایک خط بھی لکھا جس میں بدلائل ثابت کیا کہ وہ کیوں بائیکاٹ پر مجبور ہوئے ہیں۔ اس میں یہ ظاہر کر دیا تھا کہ ڈیوک موصوف کی کوئی اہانت منظور نہیں ہے بلکہ اس نظام حکومت سے احتراز منظور ہے جس کا بدلنا حق و انصاف کے لیے ضروری ہے اور جو ڈیوک صاحب موصوف کے اختیار سے باہر ہے۔
گاندھی جی ہمیشہ یہ کہتے تھے اور یہی سبق دیتے تھے کہ ہماری لڑائی انگریز سے نہیں ہے بلکہ اس طریقۂ حکومت سے ہے اور اس نظام حکومت سے جو عدل و انصاف پر مبنی نہیں ہے۔

ناگپور کانگریس کے اجلاس کے لیے گاندھی جی نے ترک تعاون کی تجویز انگریزی میں لکھی تھی۔ اس کے ابتدائی الفاظ کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"چونکہ کانگریس کی رائے میں حکومت ہند ملک کے اعتماد سے کلیتاً محروم ہو گئی ہے اس لیے باشندگانِ ہند نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان میں سوراج قائم کیا جائے۔"

کانگریس کے اس اجلاس میں اس تجویز کا ترجمہ مولانا محمد علی نے پڑھ کر سنایا۔ یہاں بھی مسٹر جناح ترک تعاون کی تجویز کی مخالفت میں سرگرم رہے۔ لیکن دیہاتی مثل ہے کہ آندھی میں ہاتھ کے پنکھے کی کیا قیمت ہوتی ہے۔ مسٹر جناح کو کوئی تائید کرنے والا بھی نہ ملا اور تجویز منظور ہو گئی۔

پے در پے کانگریس کے سپیشل سیشن اور عام سالانہ سیشن سے عدم تعاون کی تحریک منظور ہونے کے بعد اب گاندھی جی اس عدم تشدد کے ہتھیار کے کمانڈر انچیف تھے اور ان کی پشت پر پوری ہندوستانی قوم کی اور تمام سیاسی اداروں کانگریس، مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علمائے ہند کی طاقت تھی۔ ہندوستان یک زبان ہو کر آزادی ہند اور بحالی خلافت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ناگپور کانگریس کے فیصلے پر مسٹر سری نواس شاستری جو ہندوستان کے بہترین مقرر ہوتے تھے کانگریس سے الگ ہو گئے۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ عدم تعاون کی تجویز منظور ہونے کے بعد اب میرے لیے کانگریس کے جلسوں میں شریک ہونا ممکن نہیں ہے اور یہی حال دوسرے معتدلین کا بھی ہوا۔ کانگریس میں اب معتدلین کی گنجائش بھی نہیں رہ گئی تھی۔ ہندوستان اب میدان جنگ بن چکا تھا، اور اس خاک و خون کے معرکہ میں صلح پسندی، خوشامد اور دریوزہ گری کی کہاں گنجائش تھی۔

گاندھی جی، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ جہاں گئے لوگوں نے آنکھیں بچھائیں، پبلک ٹوٹ پڑی، عظیم الشان جلسے ہوئے۔ گاندھی جی نو یا پانچ سات منٹ سے زیادہ تقریر نہ کرتے تھے۔

مگر مولانا محمد علی دو دو ڈھائی گھنٹے تک وقت لیتے تھے۔ روتے اور رلاتے تھے۔ موقع بموقع قرآن کی آیتیں پڑھ کر ایسی شرح کرتے تھے کہ ان پر مولانا کا خطاب پوری طرح صادق آتا تھا۔ انجام یہ ہوا کہ انگریزی حکومت سے قید و بند جرمانہ بلکہ گولی سے مرنے تک کا ڈر دل سے کافور ہو گیا۔ حتیٰ کہ وہ دیہاتی جو کانسٹیبل کی صورت سے ڈر جاتے تھے اب میدان میں سینہ کھول کر نکل آتے تھے۔ پولیس اور فوج کے سامنے نعرۂ تکبیر، ہندو مسلمان کی جے، مہاتما گاندھی کی جے، مولانا محمد علی کی جے، مولانا شوکت علی کی جے کے فلک شگاف نعرے لگاتے تھے۔ جب کوئی جیل جاتا تھا تو اس کے گھر والوں کو مبارکباد دی جاتی تھی اور گھر والے شان سے گردن اونچی کرتے تھے گویا ان کے خاندان نے کوئی قابل فخر کارنامہ انجام پایا ہے۔ لکھنؤ، اجمیر، علی گڑھ، الہ آباد، مدراس، بنگال، دہلی، آسام، پنجاب، غرض سارے ہندوستان کا دورہ ہوا اور ملک میں ایک طرف تکبیر اور بھارت ماتا کی جے کے نعرے تھے جو ہندو مسلمان دونوں لگا رہے تھے اور دوسری طرف گورنمنٹ کی جانب سے دار و گیر کا ایک ناتمام سلسلہ تھا۔ اسکولوں اور کالجوں سے تمام تعلیم اور کھیل کے ممتاز لڑکے نکل گئے اور میدان میں آ کر اپنے کو گرفتاری کے لیے پیش کیا اور خوشی خوشی جیل گئے

امن سبھا

گورنمنٹ نے ایک طرف گرفتاریوں کا سلسلہ وسیع کر دیا۔ دوسری جانب راجاؤں اور زمینداروں کو ملا کر ترک تعاون کے خلاف ایک اسکیم تیار کی جو یہ تھی کہ صوبہ کی سطح سے لے کر ضلع کی سطح تک امن سبھائیں قائم کی جائیں۔ ان میں زمینداروں اور جاگیرداروں نے اپنے سپاہی بطور رضاکار بھرتی کرنے کے لیے دے دیے۔ اس سبھا کو ایک پبلک ادارہ ثابت کرنے کے لیے اس کے کل عہدیداران غیر سرکاری لوگ رکھے گئے جو ذی زمیندار و تعلقدار تھے۔ امن سبھا کا کہنا یہ تھا کہ گاندھی جی نے جو اسکیم چلائی ہے اس سے تشدد کا پیدا ہونا لازمی ہے جس سے ابنائے ملک کی تباہی و بربادی ہوگی اس لیے امن قائم کرنے کے لیے یہ خیر خواہان سرکار پبلک کے سامنے آئے ہیں اور ان کا مشورہ یہ تھا کہ لوگ گاندھی جی کی ترک موالات کی تحریک سے علیحدہ رہیں۔ اس کا ایک ابتدائی نظارہ دیکھنے کا مجھے بھی اتفاق ہوا تھا۔ لیکن اس کے بیان کرنے سے پہلے ایک اور واقعہ کا ذکر کر دینا مناسب ہے۔

مہاتما گاندھی نے اس تحریک کو چلانے کے لیے مسلمانوں کو اپنے موافق کر ہی لیا تھا۔ اب سارے ہندوستان کو ہلا دینے کے لیے انھوں نے تین آدمیوں کو موافقت میں لانا ضروری خیال کیا۔ یعنی پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر حسن امام بیرسٹر پٹنہ جن کی وطن دوستی بہت مشہور تھی اور مسٹر سی آر داس بیرسٹر کلکتہ۔ چنانچہ پنڈت موتی لال نہرو تو آسانی سے آگئے۔ ان کے بیٹے جواہر لال نہرو ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے اور موتی لال کے اکیلے صاحبزادے تھے۔ وہ دل و جان سے ملک کو آزادی کی طرف لے جانے کے مشتاق تھے اور ان کا اثر پورے خاندان

نے قبول کیا۔

سید حسن امام کی پریکٹس اس وقت پچاس ساٹھ ہزار روپیہ ماہوار تھی۔ انھوں نے گاندھی جی سے کہا ان کو تحریک سے اتفاق ہے لیکن وہ وکالت نہیں چھوڑ سکتے۔ البتہ ایک سادہ چیک دستخط کر کے دے دیا اور اپنی لڑکی کو کہا کہ کام کرے گی۔ سی آر داس پر مولانا محمد علی نے بڑی محنت کی۔ وہ اپنے وقت کے نامور وکیل تھے ان کی بھی آمدنی اگرچہ پچاس ساٹھ ہزار روپیہ ماہوار تھی لیکن وہ پانچ چھ لاکھ روپے کے مقروض تھے۔ بڑی بحثوں کے بعد مولانا محمد علی نے ان کو وکالت ترک کر کے تحریک میں شامل ہونے پر رضامند کر لیا لیکن شرط یہ تھی کہ قرض ادا ہو جائے جلد ہی قرض ادا ہو گیا۔ کیونکہ فوراً مسٹر سی آر داس نے اپنی کوٹھی بیچ دی۔ دوسری مرتبہ گاندھی جی بھی اسی کوٹھی میں ٹھہرے اور اب بھی سی آر داس اسی کوٹھی میں رہتے تھے۔ لیکن بحیثیت کرایہ دار۔ یہ تھیں وہ عظیم قربانیاں جو قوم نے دیں۔

علامہ اقبال نے لاہور میں مجھ سے کہا کہ گاندھی جی کی یہ بڑی کامیابی ہے کہ وہ سی آر داس کو اپنی موافقت میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ سی آر داس روحانی حیثیت سے بہت بلند حیثیت رکھتے ہیں۔

ضلع کانگریس کانفرنس الہ آباد

الہ آباد ضلع کانگریس نے زیر صدارت مولانا محمد علی ایک کانفرنس منعقد کی۔ اس جلسہ میں مجھ کو بھی ایک سپاہی کے آدمی کی حیثیت سے شریک ہونے کا موقع ملا۔ کانفرنس کے چاروں طرف گورا فوج لگی ہوئی تھی۔ لیکن وہ ازراہِ مذاق تھا کہ ماس والمفیلڈ۔ کسی نے فوج کا نوٹس بھی نہیں لیا۔ مولانا محمد علی عبا پہنے ہوئے آئے تھے۔ ان کی تحریک صدارت میں لوگوں نے خوب خوب مدح سرائیاں کیں۔ لالہ لاجپت رائے بھی تھے اور انھوں نے بڑی پر اثر تقریر کی۔ مہاتما گاندھی بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ اس وقت وہ سفید کھدر کی دھوتی اور لمبا کرتا اور آج کل جسے گاندھی ٹوپی کہتے ہیں ویسی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ انھوں نے صاف کہا کہ میں بھی کہتا ہوں کہ فوج کی ملازمت حرام ہے۔ اور کل مجمع سے کہلوایا کہ فوج کی ملازمت حرام ہے۔ مولانا محمد علی نے اپنی ابتدائی تقریر میں کہا تھا کہ لوگوں نے میری بڑی تعریف کی ہے۔ میں کوئی حاکم یا آدمی نہیں ہوں وہ سب تعریفیں بیکار ہیں۔ ایک اور تعریف سننا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ میں ہندوؤں کا سب سے زیادہ دوست ہوں۔ پنڈت موتی لال نہرو جب کھڑے ہوئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا اس کو وہ پڑھ پڑھ کر ایسے دل کش انداز میں تقریر کر رہے تھے۔ پنڈت موتی لال بڑے فصیح اللسان، خوش گفتار اور فارسی داں تھے۔ کہہ رہے تھے کہ آپ سے قبل کلکٹر صاحب کسی کو طلب کرتے تھے تو لکھا جاتا تھا "حکم بنام فلاں" "اور یہ کہ" "ابھی حاضر" کی خدمت میں حاضر ہو۔ اب ان رقعوں کو دیکھیے کہ اس میں لکھا ہے "جناب من" سلطنتی

نے "جناب" اور "مسٹر" پر بڑا زور دیا اور آخر میں سے "نیا ہندوستان" لکھا۔ ہم لوگ اس سے بہت محظوظ ہوئے۔ پنڈت جواہر لال کو ہم لوگ دیکھ نہ سکے کیونکہ وہ بیٹھے ہی رہے۔ البتہ مولانا محمد علی کا یہ فقرہ یاد ہے کہ بھائی جواہر لال نے بدیشی سگریٹ چھوڑ دیا ہے تو ڈبی جیب میں رکھ لی ہے، پنڈت موتی لال نے اس سبھا کا نام "غلام سبھا" رکھا۔ مگر ان اس سبھاؤں نے آگے چل کر بڑا فلسفہ دیا۔

مولانا محمود حسن کی مراجعت اور جمعیۃ علمائے ہند کی کارگزاریاں

مولانا محمود حسن 12 مارچ 1920ء کو مالٹا سے روانہ ہوئے تو بھی وہ حراست ہی میں تھے۔ "سیدی بشر" میں 18 دن اور "دلیر" میں پورے دو ماہ سرکاری حفاظت میں قیام کرنے کے بعد آخر جون 1920ء میں بمبئی وارد ہو کر یہاں رہا کر دیے گئے۔ ان کے ساتھ حکومت کے سی آئی ڈی کے لوگ مسلسل لگے رہے۔ ماتحت افسر "احسان مشتعق" جبہ و دستار و تسبیح و سجادہ کے ساتھ صوفی فرد ہوتے رہتے تھے۔ بمبئی میں بھی ایک مولانا صاحب تشریف لائے اور مولانا کو بقیہ زندگی یاد الٰہی میں صرف کرنے کا مشورہ بڑی خیر خواہی سے دیا اور یہ بھی کہا کہ مولانا خلافت کمیٹی کے دفتر تشریف نہ لے جائیں اور براہ راست دیوبند روانہ ہو جائیں۔ سفر کا براہ راست اہتمام بھی موجود تھا۔

آپ نے جہاز سے باہر قدم رکھا تو تمام ہندوستان کے قائدین استقبال کے لیے موجود تھے۔ اللہ اکبر کے نعروں سے فضائے آسمانی گونج رہی تھی۔ بڑے تزک و احتشام سے جلوس نکلا اور آپ براہ راست خلافت کمیٹی کے دفتر تشریف لے گئے جہاں آپ کا عظیم الشان استقبال کیا گیا اور یہیں آپ کو علمائے ہند نے "شیخ الہند" کا خطاب دیا جو آپ کے نام کا ایک جزو بن گیا ہے۔

آپ کو خلافت کمیٹی بمبئی نے سپاسنامہ بھی پیش کیا۔ دو دن بمبئی قیام کرنے کے بعد مولانا دلی تشریف لے گئے اور ڈاکٹر انصاری کے مکان پر قیام فرمایا۔ وہاں سے دوسرے دن دیوبند کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں اہل میرٹھ نے ایک ایڈریس پیش کیا۔ مولانا سید محمد میاں علمائے حق حصہ اول کے صفحہ 210 پر تحریر فرماتے ہیں:-

> "راستہ کے سٹیشنوں پر زائرین کا ہجوم تھا۔ دیوبند کے اسٹیشن پر پہنچے تو کوئی شمار نہ تھا۔ دور دراز کے شہروں اور دیہات کے لوگ زیارت کو آئے تھے۔"

آگے چل کر صفحہ 211 پر لکھتے ہیں:-

> "مسلمانوں کے قلوب کسی محسن کے طالب تھے۔ حضرت شیخ کی تشریف آوری نے یہ طلب پوری کر دی۔ اب مسلمانوں کا قدم سب سے آگے تھا۔ ہر شخص تحریک کا متوالا، جان و مال قربان کرنے پر آمادہ ...... " ایک تھوڑی تعداد جو مخالف تھی اس کی حالت یہ تھی کہ دلی میں جب اس گروہ کے

کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوا تو باوجودیکہ وہ جیسے علماء و نیز عام مسلمانوں میں بہت زیادہ رسوخ و مقبولیت رکھتا تھا لیکن اس وقت حالت یہ تھی کہ تجہیز و تکفین کے لیے مسلمان تیار نہ تھے، گھر کے مخصوص آدمیوں کے سوا کوئی نزدیک جنازہ نہیں ہوا۔ مجبوراً جنازہ کو موٹر میں قبرستان پہنچایا گیا (معاذاللہ)۔"

یہ تھی اس وقت مسلمانوں کے جوش و خروش کی حالت۔ یہی اسباب تھے کہ جامع مسجد کے پیش امام کو شمس العلما کا خطاب واپس کرنا پڑا تھا۔

حضرت مولانا کے آجانے سے ساری باہمی رقابتیں جو دلوں میں چھپی رہی ہوں گی کافور ہو گئیں، ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک قائد مل گیا۔ ایک مستند قائد جس کے آگے سب کی گردنیں جھکتی تھیں اور جس کا حکم سب کے لیے واجب التعمیل تھا۔

شیخ الہند مالٹا ہی سے وجع المفاصل کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ حالات اسیری کی تکلیف دہ حالات ایک ایسے صاحب عزیمت کے قلب و دماغ کو متاثر کرنے سے معذور عاجز تھے لیکن جسم پر تو اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہے۔ جب آپ دیوبند پہنچے ہیں تو چلنا پھرنا تو درکنار اٹھنا بیٹھنا بھی ممکن نہ تھا لیکن اسی حالت میں تحریک کی قیادت کرتے، سفر کی صعوبتیں اٹھاتے اور اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔

حضرت شیخ نہ صرف فہم و بصیرت اور علم و فضل کے امام تھے بلکہ زہد و ورع و تقویٰ و طہارت و عبادت و ریاضت میں بھی ممتاز تھے۔ یہ خرقہ و سجادہ و شمشیر و سناں کا امتزاج قرنِ اولیٰ کی یاد تازہ کرتا تھا۔

جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس

جمعیۃ علماء ہند کا پہلا اجلاس زیر صدارت مولانا عبدالباری صاحب ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں منعقد ہوا تھا جس میں کانگریس کا اجلاس زیر صدارت پنڈت موتی لال نہرو، خلافت کانفرنس کا اجلاس زیر صدارت مولانا شوکت علی اور مسلم لیگ کا اجلاس زیر صدارت حکیم اجمل خاں صاحب ہوا تھا اور ہر جگہ خلافت کے مطالبات ہو رہے تھے۔ جمعیۃ علماء کا دوسرا اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو بمقام دہلی ہوا۔ اس کی صدارت شیخ الہند نے تمام علمائے امت کی خواہش کے احترام میں نیز اپنا پیام سارے ملک کے لوگوں تک پہنچانے کے لیے قبول فرمائی، اگرچہ آپ کی صحت اس وقت بہت کمزور تھی۔ ان کا خطبۂ صدارت ایک مجموعہ حقائق تھا جس کی بنیادی باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترک موالات فرض ہے۔

(۲) تحفظ ملت اور حفظ حدود خالص اسلامی مطالبے ہیں اگر برادرانِ وطن ہمدردی اور اعانت

کریں تو جائز اور مستحق شکریہ ہیں۔

(3) اگر موجودہ زمانہ میں توپ بندوق ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت عدا کے لیے جائز ہو سکتا ہے اور باوجودیکہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں تامل نہ ہوگا کیونکہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے لیے جن کے ہاتھ میں توپ بندوق ہوائی جہاز نہیں ہے یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔

ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں آپ کی تقریر کے زریں الفاظ حسب ذیل تھے۔

"کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم ہندو کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں موید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتحاد و اتفاق کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے دونوں کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر صورت حال اس کے خلاف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنادے گی۔ دوسری طرف دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے تو وہ ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔"[1]

آپ نے اس کے بعد علمائے ملت کو وصیت فرمائی کہ جو راہ مستقیم آپ نے معلوم کر لی ہے قرآن و سنت کی روشنی میں اس پر سیدھے چلے جائیں۔ جو لوگ آپ سے علیحدہ ہیں ان کو بھی حکمت اور مواعظ حسنہ سے اپنی جماعت کے اندر جذب کیجیے اور اگر اس میں مجادلہ کی نوبت آئے تو بالتی ھی احسن ہونی چاہیے۔

جامعہ ملّیہ اسلامیہ کا قیام

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے ہمیشہ لیڈران قوم کی نگاہ رہی ہے اور ہر موقع پر لوگوں نے یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت علی گڑھ مسلمانان ہند کا تہذیبی و ثقافتی مرکز تھا، اس کی حمایت کی بڑی قیمت تھی۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ بلاد اسلامیہ، خلافت اسلامیہ اور اماکن مقدسہ سخت خطرے میں گھرے ہوئے تھے۔ اس سے زیادہ خاص بات یہ تھی کہ تحریک کا ایک جزو کالجوں، اسکولوں اور

---

[1] علمائے حق جلد دوم

یونیورسٹیوں کا بائیکاٹ تھا اس لیے اس پر کوشش شروع ہوئی کہ علی گڑھ کے لڑکے تعلیم ترک کر کے عدم تعاون کی تحریک میں شریک ہو جائیں۔ خود طلبہ میں بھی یہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس اہم معاملہ پر غور کریں اور عمل کے میدان میں اتریں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو وہاں کے کچھ قائدین طلبا نے مدعو کیا۔ مولانا آزاد نے علی گڑھ یونین میں تقریر کی۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم یہ سمجھ کر یہاں آئے ہیں کہ تم لوگوں نے شریعت حقہ کے آگے اپنی گردن جھکا دی ہے اور تم کو یہ جاننا مطلوب ہے کہ حالات حاضرہ میں اللہ اور رسول کے احکام کیا ہیں۔ چونکہ حالت ایسی ہے اس لیے میں تم لوگوں سے کہتا ہوں کہ پہلے اس بات کو طے کر لو کہ ہندوستان کا وہ کون سا عالم ہے جو تمھاری نگاہ میں اس امر کا مجاز ہے کہ احکام شرعیہ کو حوادث حاضرہ پر کتاب و سنت کی روشنی میں منطبق کر کے تم کو مطلع کرے اور دعوت عمل دے۔ اس لیے آج میں کچھ نہیں کہوں گا۔ جاؤ اور سوچ کر کل مجھ کو جواب دو۔ رات کا گہرا سناٹا ہو گا، خدا ہو گا اور تم ہو گے۔ اس وقت اپنے ضمیر کو ٹٹولو، اپنے باطن کا جائزہ لو اور سوچ سمجھ کر ایک رائے قائم کرو۔ یہ کہہ کر جلسہ برخاست ہو گیا۔ دوسرے دن پھر اجتماع ہوا تو لڑکوں نے کہا کہ ہم آپ ہی کو ہندوستان کا سب سے بڑا مجتہد اور عالم سمجھتے ہیں۔ تب مولانا نے کہا کہ جب مجھ کو تم لوگ مجاز سمجھتے ہو اور مجھ سے سوال کرتے ہو تو میں کہتا ہوں کہ حکومت سے عدم تعاون اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز روزہ اور دوسرے ارکان اسلام فرض ہیں۔ اور میں تم کو پکارتا ہوں کہ کالج کی چہار دیواری سے باہر نکلو اور کالج کی تعلیم کا بائیکاٹ کرو۔

تعجب ہے کہ جو زمین اس کوشش و کاوش سے تیار کی گئی تھی اس نے برگ و بار نہیں دیے اور خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اس وقت یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر اور معنی میں یونیورسٹی کے حل و عقد کے ذمہ دار تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے اپنا ایک بیان اخبارات میں خلافت عثمانیہ اور اماکن مقدسہ کی حفاظت کی تائید میں شائع کر دیا تھا۔ مگر وہ تحریک عدم تعاون کی کس طرح تائید کر سکتے تھے۔ انھوں نے پوری ہوشیاری اور چالاکی سے اپنا پروپیگنڈا تیز کر دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد امام الہند تو تسلیم کر لیے گئے لیکن ان کا فرمان خلیفۃ المسلمین ترکی کے فرمان کی طرح بے اثر رہا۔

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی علی گڑھ کے دل و جگر تھے۔ ان کا علی گڑھ کے طلبا پر بڑا اثر تھا۔ وہ علی گڑھ میں تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے محمد علی کی اس معاملہ میں بڑی مدح کی ہے کہ انھوں نے ایک بڑے افسر کی موجودگی میں ایک معمولی چپراسی یا خانساماں کی جانب التفات کیا اور اسے محمد علی کی اسلامی اسپرٹ سے منسوب کیا ہے۔ جبکہ دراصل اسلامی اسپرٹ علی گڑھ والوں کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ محمد علی اور شوکت علی برابر علی گڑھ جایا کرتے تھے اور وہاں کا یہ معمولی واقعہ تھا۔

ایک طرف سے مسٹر ٹول پرنسپل آ رہے ہیں دوسری طرف سے ان کا خدمتگار آ رہا ہے تو پہلے لپک کر

خدمتگار کو السلام علیکم کہہ کر اس سے معانقہ کریں گے اس کے بعد گھوم کر کہیں گے "گدھا"۔ مگر مسٹر ڈون … ہوسٹل
دارالعلوم کی تعلیم و تربیت کا اثر ادا کرتے ہیں۔ مولانا شوکت علی نمونے کے کلکٹر تھے۔ وہ چھٹیوں میں علی گڑھ
آجاتے تھے تو طلبا ان کا سامان جیتے وقت دیکھتے … اٹھائے جاتے تھے۔ گویا ایک منظر سا رہتا تھا۔
کوئی کمبل لے کر بولی … وغیرہ وغیرہ۔ … کل ختم ہو جاتے تھے۔ در آخر کار مولانا شوکت علی یہ کہتے
ہوئے … نے مجھ کو لوٹ لیا … چند لڑکوں کی معیت میں … آ جاتے … جمع کر کے
فراہم کرنے لگے۔ ایک کمبل … مولانا شوکت علی کے … تھا۔ … میں دونوں
بھائیوں کی شرکت ضروری تھی۔ … محمد علی … کے … مشہور ہی تھے۔ … میں … اور جب
… کرتے تھے … ایک طرح کی خوش مذاقی کی محفل منعقد ہوتی تھی جس
میں ذہانت کے ساتھ شوخی و شرارت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس طرح دونوں بھائی علی گڑھ میں بے انتہا ممدوح اور
ہر دلعزیز تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا جو جھگڑا ہوا اس میں مولانا محمد علی نے سخت مقابلہ
ہوا تھا اس میں پورا علی گڑھ مولانا محمد علی کے ساتھ تھا۔

اس کا تذکرہ … مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی اس غرض سے بنی تھی کہ حکومت سے مسلمانوں
کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی حاصل کرے جو مسلمانوں کی ضروریات کی کفیل ہو مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ یونیورسٹی
سارے ہندوستان کے لیے ہو … اس میں … اسکولوں اور کالجوں کا الحاق ہو سکے۔ گورنمنٹ اس پر
راضی نہ تھی۔ ہندو یونیورسٹی … میں مقامی طرز کی ہو چکی تھی اور مسلمان اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔
چنانچہ ایک وفد … کے صدر مولانا محمد علی تھے اور انھوں نے … جلسہ کر کے یہ منظور کرانا
چاہا کہ وفد کو شرائط طے کر لینے کا کامل اختیار دے دیا جائے۔ … مولانا محمد علی حکومت کے طرفدار سمجھے جاتے
تھے اور اعلیٰ انگریز افسران سے ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ … مسلمانوں کو مشکوک کرنے کے لیے کافی
تھا چنانچہ ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ وفد جو کچھ طے کرے وہ فاؤنڈیشن کمیٹی سے منظور کرائے۔ مولانا محمد علی کا
کہنا تھا کہ کیا میرے اوپر آپ لوگوں کو اعتماد نہیں ہے۔ جواب یہ دیا جاتا تھا کہ اصولاً یہ ضروری ہے کہ فیصلہ آخری
فاؤنڈیشن کمیٹی کرے۔ چنانچہ جب … کا جلسہ ہوا تو مولانا … آزاد، مولانا حسرت موہانی، آنریبل
سر امیر علی، خواجہ غلام الثقلین اور نواب وقار الملک کی مخالفت … ہو گئی۔ جب … جلسہ ہوا تو علی گڑھ
کے طلبا مولانا محمد علی کی حمایت میں شور و غوغا کے لیے موجود تھے۔ … غلام الثقلین نے ایک دن بڑی گرم
تقریر کی تھی۔ دوسرے دن وہ … ہو گئے۔ … آنریبل سر امیر علی کو … کونسل کی … خطرے میں
… جو عنقریب ان کو … مولانا حسرت موہانی کوئی بہت مقرر … تھے۔ نواب وقار الملک کی

بڑی عزت تھی۔ وہ بوڑھے آدمی تھے اور بہرے تھے۔ بڑے معزز، متدین، مخلص اور عاقل سمجھے جاتے تھے۔ محمد علی نے ان کو ایک تجویز دکھلائی جس پر وہ راضی ہو کر خاموش ہو گئے۔ اب رہ گئے مولانا آزاد۔ وہ جب تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو طرح طرح کی بولیاں اور سیٹیاں انتشار پیدا کرنے کے لیے شروع ہو گئیں۔ مگر آدھ گھنٹے اور مولانا آزاد نے ایک ایسا چسپاں شعر پڑھا کہ آواز نکالنے والا حواس باختہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد سناٹا ہو گیا اور مولانا آزاد نے پورے زورِ خطابت کے ساتھ تجویز کی مخالفت کی۔ دو ووٹ سے مولانا محمد علی جیت گئے۔ اور اسی وقت فجر کی اذان ہوئی۔ نماز کے بعد مولانا آزاد کی رہائش گاہ پر انسانوں کا ہجوم لگ گیا۔ اب لوگ پچھتا رہے تھے۔ محمد علی نے نواب وقار الملک کا ہاتھ تجویز پاس ہوتے ہی چوم لیا تھا۔ اب سب کو بھی اصل واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ مولانا آزاد نے اپنے اخبار "الہلال" میں "صحبت نیم شبی" کے عنوان سے نمک طنز سے بھرا ہوا مضمون محمد علی کے خلاف لکھا۔ مظہر الحق پر حسرت نے ایک نظم لکھی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا۔ ع

مظہر الحق نام ہے پیرو مگر باطل کے ہیں

علامہ شبلی نے خواجہ غلام الثقلین کے خلاف نظم لکھی جس کا یک مصرعہ گل کی جان ہے ـــ

"تو ہم ممبر وفد ہستی و ایں گونہ خموش"

اب استعفے شروع ہوئے۔ سب سے پہلے مظہر الحق صاحب نے وفد سے استعفیٰ دیا۔ جس پر "الہلال" میں "باطلِ حق" کے عنوان سے زوردار مدحیہ مضمون شائع ہوا۔ پھر غلام الثقلین نے استعفیٰ دیا۔ آخر میں نواب وقار الملک کی نوبت آئی۔ انھوں نے ایک طویل مضمون میں جو "الہلال" کے ... چھپا تھا یہ لکھا کہ محمد علی نے ان کو تجویز کا جو مسودہ دکھایا تھا وہ دوسرا تھا۔ اس کو دیکھ کر انھوں نے سوچا کہ ہم لوگ ترکوں میں باہمی نااتفاقی کی شکایت کرتے ہیں۔ وہ مسودہ گرچہ بہت اچھا نہیں تھا مگر بہ حال ایسا تھا جس سے رواداری برتی جا سکتی تھی۔ اس لیے وہ خاموش رہے۔ آخر میں انھوں نے لکھا تھا کہ میں قوم سے معافی مانگتا ہوں۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اور اس واقعے نے ثابت کر دیا کہ مجھے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اب میں قومی خدمت سے ریٹائر ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرتا ہوں۔

اس مضمون نے سارے ہندوستان میں ہلچل مچا دی۔ مولانا آزاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔ تجویز منظور ہوتے ہی مسٹر محمد علی نے نواب صاحب کا ہاتھ چوم لیا تھا۔ دراصل نواب صاحب کی بزرگی کے لحاظ سے اگر محمد علی ان کا ہاتھ چوم لیتے تو کوئی بیجا نہ تھا۔ مگر اب پتہ چلا کہ کیا معاملہ تھا۔

وفد ختم ہو گیا۔ محمد علی کی ساکھ کو گہری ٹھیس لگی اور مولانا آزاد مسلمانوں کے ہیرو بن گئے۔ محمد علی نے اپنی

کھوئی ہوئی ساکھ کو بحال کیا۔ اور حکومت کی وفاداری کے داغ کو اپنی بے مثال قربانی اور بے نظیر جرأت مردانگی اور اسلامی جذبے کے مظاہرے سے دھو ڈالا۔ لیکن ان دو لیڈروں کے درمیان اختلاف کی جو خلیج پیدا ہو گئی تھی وہ کبھی بھی پر نہ ہو سکی۔ اور یہ ایک بڑا ملی خسارہ تھا۔

نواں باب

تحریک عروج پر

نیا ہندوستان

جنوری 1921ء ایک آزادی کے نشے سے سرشار، اور گاندھی جی کی قیادت میں آزادی کامل کی منزل کی جانب [illegible] کی دعوت [illegible] کے سبب [illegible] ہندوستان [illegible] طلوع ہوا [illegible] کی اپیل پر [illegible] کا [illegible] طلبہ نے کالج چھوڑ دیا۔ 4 فروری 1921ء کو کلکتہ میں مسلم [illegible] بہار میں [illegible] بمبئی، بنارس اور دلی میں نیشنل کالج کھل گئے۔ [illegible]

نومبر 1920ء میں ندوۃ العلماء [illegible] سرکاری امداد بند کر دی۔ اس وقت اگرچہ [illegible] ندوۃ العلماء [illegible] انتظامیہ کے بیشتر اہم رکن تحریک ترک موالات کے سخت مخالف تھے۔ اس وقت ندوۃ العلماء کا خرچ ایک [illegible] روپیہ ماہوار تھا جس میں سے صرف 450 روپیہ ماہوار حکومت [illegible] کا ہو جاتا تھا۔ ان حالات میں بھی امداد بند کرنے کی تجویز کا پاس ہو جانا اس بات کی علامت تھی کہ جو لوگ بھی اب تحریک ترک موالات کے ہمنوا تھے وہ اپنی چیزیں بڑی بہادری سے کھو چکے تھے۔

نومبر 1920ء میں 1919ء کے اصلاحات کے تحت انتخابات منعقد ہوئے۔ کانگریس نے ان کا مکمل بائیکاٹ کیا اور [illegible] کے [illegible] تو امیدواری کے [illegible] لیکن عوام میں سے بہت کم نے ووٹ دیا [illegible] 4 فیصدی سے زیادہ نے ووٹ نہیں دیا۔ کالجوں اور اسکولوں کے بائیکاٹ اور قومی درس گاہوں کے قیام کی مہم جاری رہی [illegible] ملک کا [illegible] قومی [illegible] کالج میں چلے آئے۔ [illegible]

اسی طرح پٹنہ انجینئرنگ اسکول کے 250 لڑکوں نے اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا اور وہ مسٹر مظہر الحق بیرسٹر کے پاس گئے اور کہا کہ ہم کو کچھ جگہ رہنے کی دیجیے۔ مظہر الحق پٹنہ کے بڑے بیرسٹر تھے۔ نہایت آرام و عیش کی زندگی گزارتے تھے۔ ان کے رہنے کا مکان بہت شاندار تھا اور اسی کے ساتھ وہ دوسری عالیشان کوٹھی بنا رہے تھے۔ مگر اب تو سب کا حال یہ تھا کہ

زیبا آستینہ حسن خود را مگر   در این جگر کہ شعلہ در گیرد از دوست

جب موتی لال نہرو، سی آر داس، راج گوپال آچاریہ، وٹھل بھائی پٹیل، محمد علی، شوکت علی جیسے آرام کے بستروں کو چھوڑ کر اور سب کچھ قربان کر کے میدانِ عمل میں آ چکے تھے تو مظہر الحق کیسے پیچھے رہتے۔ وہ فوراً اپنے عیش و آرام کو بھی اور سامانِ آرائش چھوڑ کر ان لڑکوں کو دے کر دیا اور خود ایک خیمہ میں چلے گئے۔ وہاں ان کے ایک دوست کا چھوٹا سا مکان تھا اسی میں رہنے لگے۔ آہستہ آہستہ وہاں اور جھونپڑیوں کے کچھ جھونپڑے بھی بن گئے۔ لڑکوں میں بے پناہ جذبہ تھا۔ ہر طرح کی تکلیف خوشی سے سہنے لگے۔ وہاں جھونپڑیوں کا ایک کارخانہ بھی کھول دیا گیا۔ گائیں پالی گئیں۔ مظہر الحق بھی لڑکوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کو پڑھاتے بھی تھے۔ موٹا کھانا جو لڑکے کھاتے تھے وہ بھی وہی کھاتے تھے۔ کبھی دال چنے چبا کر گزارا ہوتا تھا۔ لڑکے زیادہ تر ہندو تھے مگر اب ہندو مسلمان کا امتیاز کافور ہو چکا تھا۔ لڑکے بھی ان کو باپ کی طرح مانتے تھے۔ اس جگہ کا نام صداقت آشرم رکھا گیا جس نے تمام ہندوستان میں بڑی شہرت حاصل کی اور لوگ آج بھی اس کی زیارت کے لیے جایا کرتے ہیں۔ ماشاءاللہ کیسا حسین منظر ہے جو موجودہ [illegible] صداقت آشرم [illegible] کلکتہ۔ [illegible] کوں میں مولانا محمد علی، ڈاکٹر راجندر پرشاد، مسٹر مظہر الحق، [illegible]

اسی کے ساتھ مذہب کی روح کا مظاہرہ ہونے لگ گئے۔ اب لوگ مذہب کا شبہ لیے ہوئے گھبراتے ہیں۔ شرماتے بھی ہیں۔ مدرسوں کا [illegible] ہندو مسلم [illegible] پیدا ہو گیا۔ چرخہ چلنے لگا۔ سادگی، ایثارِ نفسی، باہمی محبت، یکجہتی، بھائی چارہ اور آزادیِ وطن کا عزم [illegible] یہ سب گاندھی کی تحریریں تھیں۔

یونہی گزرتے گزرتے پنڈت موتی لال نہرو، راجندر پرشاد، وٹھل بھائی پٹیل اور راج گوپال آچاریہ نے وکالت کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ یہ لوگ اپنے پیشہ میں ہندوستان بھر میں شہرت رکھتے تھے اور ہر ایک کی [illegible] روپیہ ماہوار تک ان کی آمدنی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کا عجیب دل خوش کن نظارہ تھا۔ تمام ہندو اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے تھے۔ علمائے اسلام سرفروشی کی تمنا دلوں میں لیے لبوں سے آگ اگلتے انگریز کے خلاف ترکِ موالات کو حق قرار دے رہے تھے۔

اور نہ صرف فتوے دیتے تھے بلکہ خود اپنے لیے دار و رسن کو بھی دعوت دے رہے تھے۔

علی گڑھ پر دھاوا

بڑے طمطراق اور عزم سے علی برادران نے علی گڑھ پر اکتوبر 1920ء میں دھاوا بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم گئے اور سارے طلبہ ہمارے پیچھے ہو لیں گے مگر انھوں نے انگریزی سیاست اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی ریشہ دوانیوں کا غلط اندازہ کیا تھا۔ جب محمد علی کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی جس کی کہانی یہ ہے کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد نے اپنے ایجنٹوں کو لگا دیا اور انھوں نے محمد علی پر یونین ہال میں ہوٹنگ کی۔ علی گڑھ کا قاعدہ ہے کہ بیس آدمیوں پر ہوٹنگ ہو سکتی ہے، بارہ ہی آدمی آ دے تو بس نہ رہے گا لیکن یہاں معاملہ تفریحی تقریر کا نہ تھا بلکہ ایک فیصلہ کا تھا۔ مولانا محمد علی دلگیر ہو کر چلے گئے۔ لیکن طلبہ کی ایک بڑی جماعت تحریک کی حامی تھی۔ خود سب عمل کرنے کے لیے تیار نہ رہے ہوں اس لیے بعدہٗ خود طلبا میں تحریک پیدا ہوئی اور دوبارہ جلسہ ہوا اور مولانا محمد علی کو مدعو کیا گیا۔ مولانا محمد علی آئے لیکن وہ رنجیدہ تھے اور صرف پانچ منٹ تقریر کی۔ انھوں نے کہا میں علی گڑھ کو اپنا سمجھ کر آیا تھا اب یہاں سے نکالا جا رہا ہوں۔ اس کا مجمع پر بڑا اثر پڑا اور طلبہ نے خود عزم و ہمت دکھا کر عدم تعاون کی پیش کش کی جن میں ایک ذاکر حسین صاحب بھی تھے (بعدہٗ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ) جو اسسٹنٹ ٹیچر ابھی حال ہی میں مقرر ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور ایک فضا بن گئی جو پہلے سے موجود تھی لیکن نمایاں نہ ہو سکی تھی۔ اور مولانا محمد علی جو طلبا ان کے ساتھ آ سکتے تھے ان کو لے دوڑے اور اپنے ساتھ لے کر اولڈ بوائز لاج میں جا کر مقیم ہوئے۔ اولڈ بوائز لاج کالج کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اولڈ بوائز کی ملکیت ہے لیکن ان کو وہاں سے بھی نکلنے کا حکم دے دیا گیا۔ ڈیڑھ سو طلبا اپنے سامانوں کو اپنے سروں پر اٹھائے محمد علی کی قیادت میں اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ درس گاہ سے باہر نکل گئے اور ایک نیشنل مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے نام سے علی گڑھ میں قائم کر دی گئی۔ وہ دن میں مولانا محمد علی نے اقامت اختیار کی۔ پہلے مولانا محمد علی خود پرنسپل تھے اور حسب عادت صبح سے شام تک تقریریں کیا کرتے تھے۔ بعدہٗ خواجہ عبدالحمید صاحب شیخ الجامعہ قرار دیے گئے۔ اس طرح محمد علی کی ہمت سے ایک آزاد یونیورسٹی وجود میں آئی جو اس وقت مفید کام انجام دے رہی ہے۔ علی گڑھ میں اس انقلاب کے ساتھ ساتھ اور اس کے بعد ہر جگہ نیشنل کالج اور اسکول کھلنے لگے۔ شاید ہی کوئی ضلع ایسا ہو گا جہاں کوئی نہ کوئی اسکول نہ کھل گیا ہو۔ ترک موالات یا ترک تعاون کا منشا ہی یہی تھا۔ چنانچہ جو ادارے سرکاری مدد لیتے تھے ان کا بائیکاٹ کیا گیا۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ پر مولانا آزاد کا دھاوا

یہ تحریک جس طرح انگریزی تعلیم کے اسکولوں اور کالجوں کے بارے میں ہوئی اسی طرح ان مدارس کے بارے میں بھی ہوئی جو سرکاری امداد پر چلتے تھے۔ ان میں ایک نہایت عالیشان اور مشہور خاص و عام مدرسہ، مدرسہ عالیہ کلکتہ تھا جو سرکاری امداد سے چلتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد جب رانچی میں نظربند تھے تو انھوں نے وہاں ایک قومی درس گاہ قائم کی تھی۔ اب انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کو جس کا بنگال اور کل ہندوستان کے مسلمانوں پر بڑا اثر تھا توڑ کر اس کی جگہ ایک قومی مدرسہ قائم کیا جائے۔ مولانا کی شخصیت کے اثر سے ڈھائی سو طلبا تیار ہوگئے اور روپیہ کا بھی انتظام ہوگیا۔ اب مولانا کو اچھے اساتذہ کی فکر ہوئی اور آخرکار حضرت مولانا حسین احمد مدنی چارج لینے پر تیار ہو گئے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس قومی مدرسے کی رفعت و شان کیا تھی۔ مولانا آزاد جو بھی کام کرتے تھے اس میں اسی طرح کی عظمت ہوتی تھی۔ مولانا آزاد کی ایک شعلہ بار تقریر سے جو ڈھائی سو لڑکے مدرسہ عالیہ سے نکل آئے تھے، عارضی طور پر ان کے لیے کلکتہ کی مشہور عظیم الشان جامع مسجد (مسجد ناخدا) میں مدرسہ کھول دیا گیا

۱۳ دسمبر 1920ء کو مہاتما گاندھی نے اس قومی عربی مدرسے کا افتتاح کیا۔ مولانا آزاد نے اس موقع پر جو تقریر کی وہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ تقریر ایک عربی دینی مدرسے کے افتتاح کے لیے کی گئی تھی۔ اول تو اس کی تاسیس گاندھی جی کے ہاتھ سے کرانا۔ دوسرے یہ تقریر اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ اس وقت کی فضا کیا تھی اور مسلمانوں میں گاندھی جی کی محبوبیت و مقبولیت کا کیا عالم تھا۔ اس تقریر کے چند فقرے حسب ذیل ہیں:۔

"مہاتما جی! اس وقت طلبہ کی جو جماعت آپ کے سامنے ہے اور جس کی آنکھیں آپ پر گڑی ہیں یہ وہ جماعت ہے جس نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کی شاندار عمارت اور عالی شان ہوسٹل کو (جس میں بہترین سامان راحت و زیبائش مہیا تھا) محض احکام الٰہی کی پابندی اور سچے ہندوستانی کی حیثیت سے چھوڑ دیا ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جس نے ترک موالات کی راہ میں ہر طرح کی تکلیف برداشت کی ہیں۔ بھوک اور پیاس کی سختی جھیلی ہیں۔" اس کے بعد مولانا نے اس کا ذکر کیا جہاں ایک طبقہ سرکاری تعلیم کے ذریعہ رزق تلاش کر رہا ہے عربی مدارس کا ایک سلسلہ ہے جو صرف سچی علم پرستی کا چراغ روشن کیے ہوئے ہے۔ اور آخر میں کہا کہ "میں نے اس چیز کی جانب آپ کو اس لیے توجہ دلائی ہے کہ جوہر شناس صرف جوہری ہی ہو سکتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ اخلاص اور ایثار کے جوہر شناس ہیں۔" (خطبات آزاد، مطبوعہ ساہتیہ اکیڈمی، صفحہ 376)

اس کے جواب میں گاندھی جی نے جو تقریر کی وہ انتہائی اہم ہے۔ اس سے گاندھی جی کے اخلاص کا

اندازہ ہوگا جو انھیں خلافت الٰہیہ سے تھا۔ گاندھی جی نے طالب علموں کو مخاطب کرکے فرمایا:۔

(۱) میں آپ لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ آپ اپنے ارادوں میں مستقل رہیے۔ جو پاؤں آگے اٹھ چکا ہے پیچھے نہ ہٹائیے۔ اس وقت اسلام خطرے میں ہے۔ خلافت تباہ کر دی گئی ہے۔ مقامات مقدسہ پر قبضہ کر لیا گیا ہے۔ ہندوستان کی خودداری کو پنجاب میں شکست دے دی گئی ہے۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ ان کاموں پر کمربستہ ہوں اور جو فرائض آپ کے ذمہ اسلام اور ہندوستان کے ہیں انھیں ادا کریں۔

اساتذہ سے گاندھی جی نے کہا کہ وہ دینی تعلیم دیں جو طلبا کو سچا مسلمان اور سچا ہندوستانی بنا دے۔ قومی مدرسوں کے جاری کرنے کا یہی مقصد ہے کہ ان میں ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو غلامی سے گریز کریں اور آزادی پر جان دیں۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام بنی نوع انسان سے محبت کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ پس اس مدرسے کے اساتذہ و طلبا میں ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ پیدا کریں کہ جس میں مسئلہ خلافت اور سوراج کا دارومدار ہے۔ میں ایک کٹر ہندو ہونے کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ اسلام کی سلامتی بھی میرے پیش نظر اتنی ہی ہے جتنی ہندوازم کی ہے۔

گاندھی جی کی اس مختصر تقریر سے حسب ذیل باتیں ظاہر ہوتی ہیں:۔

(۱) گاندھی جی بھی خلافت کے مسئلہ کو اہمیت دیتے تھے۔ یہ چیز ان کے ہر بیان اور ہر تقریر میں نمایاں ہے۔

(۲) خلافت اور سوراج قوم کے دو مقصد قرار پا چکے تھے اور دونوں کو ایک سلسلہ میں جوڑ دیا گیا تھا یعنی ممالک اسلامیہ اور مقامات مقدسہ کا تحفظ اسی وقت ممکن ہے جب انگریز کی نوآبادی کی طاقت اور غلامی ہند کی زنجیروں کو توڑا جائے۔

(3) ہندوستان آزادی کامل کی جانب آہستہ لیکن مضبوط قدم اٹھا رہا ہے۔

(۴) ہندو مسلم اتحاد کو ضروری قرار دے کر اس کے حصول کی عملی اور پر جوش جدوجہد شروع کر دی گئی اس اتحاد کا اصول یہ تھا کہ مذہبی امور میں دونوں الگ الگ اپنے اصول پر قائم رہتے ہوئے ملکی معاملات میں مل جل کر کام کریں۔ ضلع میں جس طرح ترک موالات کی تحریک پھیل گئی تھی اس کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔ جناب شاہ معین الدین احمد ندوی نے "حیات سلیمان" کے صفحہ 221 پر جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کو وضاحت کے لیے پیش کرنا چاہیے۔

"مائیور کانگریس کے بعد پورا ہندوستان ترک موالات کی تحریک سے گونج اٹھا اور یوپی میں اعظم گڑھ اس کا مرکز بن گیا۔ پورے ضلع میں خلافت کمیٹی کی شاخیں اور پنچایتیں قائم ہوگئیں۔ عدالتوں سے مقدمات قریب قریب ختم ہوگئے۔ شراب گانجے اور چرس کی دوکانیں بالکل بند ہوگئیں۔ اس کا ٹھیکہ لینے والا کوئی نہ تھا۔ ایک نیشنل اسکول بھی قائم ہوگیا تھا اس میں دو سو طلبا رہتے تھے۔ دارالمصنفین ہندوستان کے

تمام بڑے بڑے لیڈروں کا مرجع بن گیا تھا۔ اعظم گڑھ کی تنظیم کا سب۔ مولانا مسعود علی اور سید صاحب کے سر تھا۔ سید صاحب (یعنی سید سلیمان ندوی) زیادہ تر صوبہ اور آل انڈیا کاموں میں حصہ لیتے تھے اور خلافت، اور کانگریس کے اہم اجلاسوں میں عموماً شرکت فرماتے تھے۔ اس زمانہ میں جتنے بڑے بڑے لیڈر آتے تھے سب دار المصنفین میں ٹھہرتے تھے۔ مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، سب کی میزبانی کا شرف دار المصنفین کو حاصل ہو چکا ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو کا تو دار المصنفین مستقل مہمان خانہ تھا جب یہ دونوں کانگریس کے کاموں کے سلسلہ میں یو پی کے مشرقی اضلاع کا دورہ کرتے تھے تو دار المصنفین ہی کو مرکز بناتے تھے۔ اور کئی کئی دن یہاں ٹھہرتے تھے۔

ایک کروڑ روپے کی فراہمی کی کہانی

31 مارچ 1921ء کی بزواڑہ ورکنگ کمیٹی میں گاندھی جی نے ایک وقت مقررہ کے اندر ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کی اپیل کی۔ گاندھی جی جیسا نبض شناس قوم اس ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ اول یہ کہ کانگریس کے بڑھتے ہوئے کام کے لیے ایک معقول رقم یکجا ہو جائے۔ اور دوسرے یہ کہ حکومت پر نفسیاتی اثر پڑے کہ گاندھی جی کا کتنا بڑا اثر قوم پر ہے اور کس طرح وہ کل ابنائے ملک کا اعتماد حاصل کر چکے ہیں۔ چنانچہ اس میں اور زور پیدا کرنے کے لیے گاندھی جی نے پبلک کے بے انتہا جوش کے پیش نظر ایک کروڑ روپیہ کی فراہمی کے لیے 31 دسمبر 1921ء کا وقت بھی مقرر کر دیا تھا۔ لیکن گاندھی جی کی پکار کے بعد اس میں کیا دقت ہو سکتی تھی۔ خصوصاً جب کہ بڑے بڑے مہاجن گاندھی جی کو "بلینک چیک" دستخط کر کے دے رہے تھے۔ اور 31 دسمبر 1921ء تک پورا ایک کروڑ روپیہ جمع ہو گیا۔

اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ انگریز نے اس کا سخت مقابلہ کیا اور پوری کوشش کی کہ ایک کروڑ روپیہ جمع نہ ہو سکے۔ گاندھی جی کے اندر جو عظیم خود اعتمادی تھی اس کی بنا پر وہ ذرا بھی پریشان نہ ہوتے لیکن بعض محبان آزادی کے حلقوں میں اضطراب نمایاں ہو گیا۔ اس سلسلہ میں ظفر حسن ایبک (مقیم کابل) کی آپ بیتی جلد اول کے صفحہ 234 کا حسب ذیل اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہو گا:-

> "اخبارات سے جو خبریں ہمیں ملتی تھیں ان سے معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی کا اس میں کامیاب ہونا محال ہے۔ کانگریس کے دسمبر 1921ء کے سالانہ جلسہ میں کوئی ہفتہ باقی تھا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ ایک کروڑ روپیہ ہونے کے لیے ابھی چند ایک لاکھ کی اور ضرورت ہے بظاہر یہ معلوم

ہو رہا تھا کہ مقررہ تاریخ تک ایک کروڑ روپیہ جمع نہ ہو سکے گا۔ اس لیے قبلہ مولانا صاحب (مولانا عبید اللہ سندھی) نے فیصلہ کیا کہ روسیوں سے مالی امداد مانگی جائے۔ ... مولانا نے روسی سفیر سے کانگریس کمیٹی کابل کے نام پر درخواست کی کہ وہ اپنی گورنمنٹ سے مالی مدد لیکر دسمبر 1921ء کے آخری ہفتہ سے پہلے جواب دے۔ روس نے باقی ماندہ چندہ ایک لاکھ روپیہ کانگریس کمیٹی کابل کے ذریعہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کو دینا منظور کر لیا جس کی مولانا نے کانگریس کو خبر دی مگر مقررہ تاریخ سے دو دن پہلے ایک کروڑ روپیہ پورا ہونے کی خبر پہنچ گئی۔ مولانا نے روسی سفیر کو خبر بھیج دی۔ اب روپے کی ضرورت نہیں رہی اور کانگریس کمیٹی کابل اس مدد کا شکریہ ادا کرتی ہے۔"

یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مولانا عبید اللہ سندھی نے کابل میں ہندوستان کی ایک عارضی حکومت اور انڈین نیشنل کانگریس کی ایک شاخ بھی بنائی تھی اور اس عارضی حکومت کی طرف سے ہندوستان کی تمام انقلابی جماعتوں کو خبر دے دی تھی کہ جب ہندوستان پر حملہ ہو تو اہالیٔ ہند اس کا مقابلہ نہ کریں۔ انگریزوں کو ہر طرح سے تنگ کریں۔ انھیں آدمی اور روپیہ سے مدد نہ دیں۔ ریل تار خراب کرتے رہیں۔ ہندوستان کی خبریں مشتہر کرنے کے لیے جمال پاشا نے وہاں کے اخبار کا روسی ترجمہ کرا کے اشاعت کا انتظام کیا تھا۔

کھدر کی اسکیم اور پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ

18 جولائی 1921ء کی ورکنگ کمیٹی میں گاندھی جی نے کھدر کی اسکیم پیش کی جو اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ صرف مولانا حسرت موہانی مخالف تھے۔ انھوں نے کھدر کی بجائے سودیشی کی تحریک جاری کی.... انھوں نے کانپور میں اپنی سودیشی کپڑوں کی دوکان بھی کھولی تھی۔ اور وہاں شب و روز ہر آیندہ و روندہ سے کھدر کی مخالفت اور سودیشی کی تائید میں اعداد و شمار کے حوالے سے تقریر فرماتے تھے۔ حسرت موہانی کانگریس اور عوام و خواص میں ان کی بوریہ نشینی بے مثال جرأت حق گوئی، نشہ آزادی وطن، صاف دلی اور دیگر اخلاقی و روحانی خصائل کی وجہ سے بڑی عزت تھی۔ لوگ سنتے تھے اور خاموش رہتے تھے۔ مگر یہ سب سعی لاحاصل نکلا۔

31 جولائی 1921ء کو ڈل بار عمر سوبانی کے میدان واقع محلہ پریل بمبئی میں بدیسی کپڑوں کی ہولی منائی گئی۔ لوگ ذوق شوق سے بدیسی کپڑے لاتے اور آگ میں ڈالتے تھے۔ شعلے بلند ہو کر اپنی زبان سے پکار رہے تھے کہ غلامی کے تمام لوازمات نذر آتش کیے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد بدیسی کپڑوں کی ہولی منانا ایک عام طریقہ ہو گیا۔ کوئی شہر اور کوئی قریہ ایسا نہیں تھا جہاں یہ کام نہ کیا گیا ہو۔

مہاتما گاندھی کا ملک گیر دورہ

مولانا محمد علی مولانا شوکت علی مہاتما گاندھی کے ساتھ مسلسل دورے کر رہے تھے اور ہر جگہ عظیم الشان جلسے ہوتے تھے۔ آدمیوں کی کثرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مولانا محمد علی کی تقریروں سے بڑا جوش و خروش پیدا ہوتا تھا۔ گاندھی جی کی عظمت آسمان کو چھو رہی تھی۔ شہروں میں تقریباً روزمرہ جلسے ہوتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہوتے تھے جن میں مقامی لیڈر تقریریں کرتے تھے۔ اور عوام و خواص ملک کی آزادی کے لیے تیار تھے۔ پورا ملک بغاوت پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس منظر کو جس نے دیکھا وہی اس کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔ اب خلافت اور سوراجیہ کی تحریک ایک ہی خلط ملط ہو گئی تھی۔ خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علمائے ہند کے بھی جلسے ہوتے تھے اور سب میں تو گرمی ہی گرمی تھی۔ لیکن اب خلافت کے حصول کا ذریعہ بھی سوراجیہ قرار دیا گیا تھا اور کل ملک کی نگاہ ملک کو غلامی سے آزاد کرانے پر لگی ہوئی تھی۔ کانگریس کی اہمیت روز بروز ترقی کرتی جا رہی تھی۔ دوسری جماعتیں بھی گرچہ بہت پرجوش تھیں اور انہیں کی بدولت یہ فضا پیدا ہوئی تھی۔ تاہم وہ معین و مددگار کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں سرسید احمد خاں نے اس لحاظ سے کہ مسلمانوں کا مفاد انگریزی حکومت کے مراحم خسروانہ سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ ۱۸۶۸ء میں دو قومی نظریہ پیش کیا اور یہ اسکیم تیار کی کہ جہاں تک ہو سکے انگریز کو ہندوستان کا حکمراں رکھا جائے۔ ورنہ اگر انگریز چلا گیا تو ہندو اکثریت مسلم اقلیت پر غالب آکر مسلمانوں کا مستقبل تباہ و برباد کر دیں گے۔ اسی کا نام علی گڑھ تحریک تھا۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ تحریک خلافت ایک بجلی تھی جو علی گڑھ کے خرمن پر گری۔ مولانا محمد علی کی مذہبیت، دینداری، علم و فضل، انگریزی اور اردو کی بے مثال انشاپردازی، فن شعر گوئی کی مہارت، خطابت کے زور، اپنے خلوص اور دیانتداری اور ایثار و قربانی جیسے محاسن اعلیٰ سے مزین تھے۔ اور وہ نظر بندی سے نکلنے کے بعد ہی ہندوستان کے مسلم لیڈر بن گئے تھے۔ جب وہ مہاتما گاندھی کے ساتھ ہندوستان کا طوفانی دورہ کرتے تھے تو ہر جگہ مہاتما گاندھی کی جے کے ساتھ مولانا محمد علی زندہ باد کے بھی نعرے لگتے تھے۔ اور اللہ اکبر ہندو مسلمان دونوں پکارتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد "انڈیا ونس فریڈم" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> "اس کے بعد ہندوستان کے طویل دورے کا زمانہ آیا تاکہ ملک کو تحریک ترک موالات کے لیے تیار کیا جائے۔ گاندھی جی نے کئی ایک دورے کیے۔ میں بیشتر دوروں میں ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ محمد علی شوکت علی بھی ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔"

اس تحریک کا منشا اگر بظاہر کرنا ہو کر درحقیقت مولانا آزاد بھی گاندھی جی کے ساتھ دورے کر رہے تھے اور مولانا

محمد علی و شوکت علی کی پوزیشن کہیں کہیں ان کے ہمراہیوں کی سی تھیں تو یہ بات تاریخ و مشاہدہ دونوں کے خلاف ہے

؎ اس زمانے کے دیکھنے والے زندہ ہیں میں خود ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی اسکول آف لا الٰہ آباد سے کالج چھوڑ کر اس تحریک میں شریک ہو گیا تھا اور مسلسل حصہ لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ گاندھی جی کے دوروں میں خصوصیت سے بالالتزام علی برادران ہی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ مولانا آزاد بھی دورہ کرتے تھے اور بڑے بڑے مجمعوں کو خطاب کرتے تھے ان کا اور گاندھی جی کا بھی کبھی آگے پیچھے اور کبھی ہمراہی میں ساتھ ہو جایا کرتا تھا۔ مولانا کی عظمت آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔

دسواں باب

حکومت کا ردِّ عمل

کراچی کا مقدمہ

۱۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو کراچی میں خلافت کانفرنس کا جلسہ زیر صدارت مولانا محمد علی منعقد ہوا۔ کانفرنس میں حسب معمول کافی جوش و خروش تھا۔ کانگریس اور خلافت کے بڑے بڑے لیڈر اور علماء بھی کانفرنس میں شریک تھے۔ اس کانفرنس میں یہ تجویز کی گئی کہ اسلام کی رو سے انگریز کی فوج کی ملازمت حرام ہے کیونکہ اس سے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر گولی چلانی پڑتی ہے جس کی سزا ازروئے قرآن جہنم ہے اور مسلمان فوجیوں کو اس پر بھی مجبور ہونا پڑا کہ وہ مقامات مقدسہ کو عیاروں کے ہاتھ میں چلے جانے میں شریک جنگ ہوں۔ اس تجویز کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تجویز منجانب صدر پیش ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صدر جلسہ مولانا محمد علی اس پر تقریر کرنے کے لیے بیتاب رہے ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے پورے زور خطابت کو کام میں لاتے ہوئے اور آیات و احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے انتہائی گرم اور طویل تقریر کی۔ اور صرف فوج کی ملازمت ہی کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ تمام سامعین کو زبردست ترغیب دی کہ وہ فوجیوں کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے سلسلے میں پوری کوشش کریں۔ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ تجویز صدارت غیر متنازعہ مسئلہ پر ہوتی ہے اور اس کی تائید نہیں کی جاتی بس ووٹ لیا جاتا ہے۔ اس پر مباحثہ نہیں ہوتا۔ لیکن مولانا محمد علی کے بعد مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا نثار احمد، پیر غلام مجدد اور جگت گرو سوامی شنکر آچاریہ نے بھی پرزور تقریروں سے تجویز کی تائید کی۔ اور تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔

پتہ نہیں کہ اس تجویز کے لیے مہاتما گاندھی سے مشورہ کیا گیا تھا یا نہیں۔ جو لوگ فوج میں بغاوت

پھیلانے کا کام کرتے ہیں۔ ان کے انداز و اطوار بالکل جداگانہ ہوتے ہیں اور اس کے ذریعہ انقلاب پیدا کرتے ہیں۔ اور تشدد ان کا بنیادی اصول ہوتا ہے۔ یہ سب کارروائی سر کو ہتھیلی پر رکھ کر خفیہ کی جاتی ہے۔ گزشتہ بعد از جنگ کی یاسیت کارفرما تھی۔ گویا کہ خود اپنے دانتوں سے لوگ اپنی بوٹیاں نوچ رہے تھے۔ اس سلسلہ کا ایک دلچسپ واقعہ مولانا حسرت موہانی صاحب نے مجھے سنایا۔ اس زمانہ میں شہر بہ شہر قریہ بہ قریہ تقریباً روزانہ جلسے ہوتے رہتے تھے۔ اسی قسم کا ایک جلسہ ان فوجیوں نے کیا جو گورنمنٹ کی طرف سے حجاز اور بیت المقدس لڑ کر آئے تھے اور حکومت کی طرف سے انعامات و اکرامات اور بعض صورتوں میں زمین کے رقبوں سے نوازے گئے تھے۔ ان لوگوں نے جلسہ کی شوکت اور نمائش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا اور سب آگے بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا حسرت فرماتے تھے کہ فرحت اللہ بیگ بھی اس جلسہ میں شریک تھے۔ وہ جب تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو اس کا آغاز اپنے ایک شعر سے کیا۔ اس شعر کو بڑی دلیری سے اور لفظ 'اب' اور 'حامی' پر زور دے کر ان لوگوں کی جانب ایک سرے سے دوسرے سرے تک اشارہ کرتے ہوئے پڑھا۔

بن کے اب ترکِ موالات کے حامی آئے
کر کے برباد حرم کو یہ حرامی آئے

بہرکیف اس تجویز سے انگریز حکومت کی چولیں ہل گئیں۔ رعایا بننے اور بندگی بجا لانے کا جذبہ تو گویا یہ ظاہر ہو گیا کہ خواص و عوام سر ہتھیلی پر رکھ کر بغاوت کے میدان میں اتر آئے ہیں۔ کاسہ لیسانِ حکومت ان جذبات کے لہروں میں بہہ گئے۔ اور ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ گھروں میں منہ چھپائے بیٹھے تھے۔ میدان میں آنے یا ایک لفظ پبلک میں کہنے کی ہمت نہ تھی۔ خلافت کانفرنس کراچی انگریزی حکومت کے تابوت آخری کیل تھی۔ اس تجویز نے جانبازانہ و بہادرانہ عزم حصول آزادی کو انتہائی تقویت دی اور انگریز کو پتہ چل گیا کہ اب اس کو بوریا بستر باندھ لینا چاہیے علماء کا آیات و احادیث سے اور جگت گرو کا ہندو مذہب سے فوج کی ملازمت کو حرام و ناجائز قرار دینا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس کے بعد ہر شہر اور ہر قریہ میں صدا لگنے لگی۔

باندھ لو بستہ فرنگی راج اب جانے کو ہے

ہمارے ضلع بستی کے شعلہ بار مقرر بابو رام دون سنگھ جو اس وقت کانگریس ضلع بستی کے صدر تھے اس نعرے کو دیتے اور ہر تقریر کرنے کے لیے آہنگ مشہور ہیں "مرد میدان گاندھی درویش خو" میدان جنگ میں پیچھے رہنے والا نہ تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ " میں بھی کہتا ہوں کہ فوج کی ملازمت حرام ہے" سارا ہندوستان اس سرفروشی نعرہ سے گونج اٹھا۔

کراچی کے جلسہ کے بعد حسب معمول مولانا محمد علی نے مہاتما گاندھی کے ساتھ ہندوستان

دورہ شروع کر دیا۔ دوسرے لیڈر کے مقام پر وہ گرفتار کر لیے گئے اور ان پر فوج میں بغاوت پھیلانے اور عوام کو تشدد کی ترغیب دینے کے جرم میں مقدمہ قائم ہو گیا۔

حکومت نے ان تمام لوگوں کو بھی گرفتار کیا جنھوں نے خلافت کانفرنس کراچی میں تقریریں کی تھیں یعنی مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، جگت گرو شنکر آچاریہ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا نثار احمد، پیر غلام مجدد۔ مولانا محمد علی پر عیدگاہ کراچی میں ایک باغیانہ تقریر کرنے اور گورنمنٹ کے خلاف نفرت پھیلانے کا بھی الزام تھا۔

مجاہدین کا کارواں اس طرح کمرۂ عدالت میں داخل ہوا تھا کہ :-

"سب سے پہلے مولانا محمد علی ایک ہاتھ میں قرآن شریف اور دوسرے ہاتھ میں روشنائی کی بوتل لیے داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے مولانا شوکت علی ہنستے ہوئے اور ہاتھ سے مخلص نثار ے مخلص و مشتاق نگاہوں اور پرجوش سلاموں کے جواب دیتے ہوئے داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے مولانا حسین احمد مدنی کمال وقار و متانت کے ساتھ تشریف لائے۔ جگت گرو نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ عصا ہاتھ میں لیے ہوئے تشریف لائے۔ ان کے بعد ڈاکٹر کچلو اور مولوی نثار احمد باتیں کرتے مسکراتے اور اشاروں سے سلام کا جواب دیتے ہوئے داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیر غلام مجدد صاحب مسکراتے ہوئے اور قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہوئے تشریف لائے۔ جب تک تمام لیڈر اپنی اپنی جگہ بیٹھ نہ گئے سب لوگ کھڑے رہے۔"[1]

یہ ابتدائی عدالت تھی۔ مقدمہ کی سماعت سیشن میں تھی۔ حکومت کی مرعوبیت کا نظارہ بھی مندرجہ بالا حوالہ سے درج کیا جاتا ہے جو انتہائی دلچسپ ہے :-

"ہال کے احاطے کے اردگرد خاردار تار لگا دیے گئے تھے اور چاروں طرف مسلح پولیس اور فوج ایستادہ تھی اور احاطے کے اندر ڈیڑھ سو ہندوستانی اور ڈیڑھ سو انگریزی فوج تھی۔ ایک مشین گن بھی ہال کے شمالی جانب لا کر نصب کر دی گئی تھی۔ جو لوگ ہال کے اندر تماشہ دیکھنے گئے ان میں اکثر وکلاء اور بیرسٹر صاحبان اور طلباء اور دیگر حضرات تھے"

اب نہ مسلمان اور نہ ہندو ان گیدڑ بھبکیوں سے دبنے والا تھا۔ ملزمان نے عدالت کی کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور گواہان پر کوئی جرح نہیں کی۔ گواہان سی۔ آئی۔ ڈی افسر تھے جنھوں نے تقریروں کی

---

[1] سیرت محمد علی، از رئیس احمد جعفری، بحوالہ مقدمہ کراچی، از عبدالہادی بیگ ایم اے ایل ایل بی، مشہور قومی کارکن ناجر

عبارتیں پیش کیں اور آخر کار عدالت نے مقدمہ سشن کے سپرد کر دیا۔

عدالت سشن کی کارروائی

سشن کا مقدمہ شروع ہوا تو بقیہ لوگوں نے خاموشی اختیار کی مگر مولانا محمد علی جج سے الجھ گئے اور زور دے کر کہنا شروع کیا کہ اگر خدا کا قانون برطانوی حکومت کے قانون سے متصادم ہوگا تو میں خدا کا فرماں بردار ہوں گا۔ برطانوی قانون کو نظر انداز کر دوں گا۔ جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے اس کو قرآن کے حکم کا پابند ہونا چاہیے۔ اگر وہ قرآن کے کسی آیت کی بھی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یک پورا وعظ دے ڈالا جو قطعی بے موقع اور غیر متعلق بات تھی۔ جب یک مرتبہ مولانا محمد علی نے بطور ملزم یہ تسلیم کر لیا کہ انہوں نے مسلمانوں کو برطانوی فوج کی ملازمت سے باز رکھنے کی کوشش کی تو اقبال جرم مکمل ہوگیا۔ اب جج کے سامنے یہ طول طویل بحث کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ اسلام کی تعلیم اس کے بارے میں کیا ہے اور پیغمبر آخر الزماں صلعم نے کیا تعلیم دی تھی۔

الغرض اس طرح دیر تک لفظی مقابلہ جاری رہا۔ جج مولانا محمد علی کو روکتا رہا اور وہ اس پر تلے رہے۔ کہ وہ ثابت کر کے رہیں گے کہ قرآن اور حدیث کی رو سے ایک مسلمان کے لیے فوج کی ملازمت حرام ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جج کہتا رہا کہ یہ متعلق بات نہیں ہے اور مولانا محمد علی اڑے رہے اور پورا وعظ کہہ ڈالا اور جج عاجز آ کر خاموش ہوگیا۔

جگت گرو سوامی شنکر آچاریہ کو ایک سال اور بقیہ لوگوں کو دو دو سال قید کا حکم عدالت نے سنایا۔ اس فیصلہ نے حکومت کے خلاف دہکتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا اور تمام ہندوستان شعلہ جوالہ بن گیا۔ بجائے اس کے کہ اس سے کسی خوف و ہراس کا اثر ہوتا لوگوں کی ہمتیں اور بلند ہو گئیں۔ خوف و ہراس کا کیا ذکر ہے۔ اس وقت عالم یہ تھا کہ لوگ موقع تلاش کرتے تھے کہ کہیں گولی چلے اور ہم گولی کھائیں۔ یہی حال ان ہزاروں ہم طالبعلموں کا تھا جو کالج چھوڑ کر میدان میں نکلے تھے۔

افغانی ہوّا

اس سے پہلے مولانا محمد علی ایک "افغانی ہوّے" کے طوفان میں مبتلا ہو گئے تھے۔ واقعہ یہ تھا جسے تمام اخباروں نے اس زمانے میں "ہوّے" کے نام سے یاد کیا اور جس کا کچھ ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ ہوّا نہ تھا بلکہ مولانا محمود حسن کی ایک اسکیم تھی۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ افغانستانی اور قبائلی ہندوستان پر حملہ آور ہو جائیں

اور اندرون ملک بہت سی خفیہ جماعت کے مراکز قائم تھے۔ وہ مراکز جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اور ملک آزاد کر لیا جائے اور اس کے بعد ایک آزاد جمہوری متحدہ قومی حکومت قائم کی جائے۔ جو شواہد تاریخی کے اشارے ملتے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ الہند کی تحریک میں ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر اور ایوان حکومت کے معززین شامل تھے۔ ان میں مولانا محمد علی بھی تھے۔ وائسرائے کو سب کچھ معلوم تھا۔ وائسرائے کے پاس ان کارروائیوں، کارگزاریوں اور خطوط کی نقلیں بھی تھیں جو اس سلسلہ میں تعلق رکھتی تھیں اور غداران اسلام حکومت کو بھیج کر جلب منفعت کرتے تھے۔ ادریس احمد، انیس احمد، اللہ نواز، مولوی رحیم بخش وغیرہ کی کمی تو تھی نہیں۔ وائسرائے نے تیج بہادر سپرو اور پنڈت مالوی کو یہ سب کاغذات دکھائے تھے۔ تیج بہادر سپرو اور مالوی جی نے کی حب الوطنی، اخلاص، بے لوث خدمات کا پورے ملک کو اعتراف تھا۔ لیکن حکومت کے خلاف راست قدم کو تیج بہادر سپرو ملک کے لیے غیر مفید سمجھتے تھے۔ وہ جلیانوالہ باغ کے واقعہ کو ایک فرد کی غلط کارروائی تصور کرتے تھے حکومت کو ذمہ دار قرار نہیں دیتے تھے۔ مالوی جی نے جلیانوالہ باغ کے معاملہ میں بڑا گرم اور جوشیلا کام کیا تھا۔ لیکن وہ چاہتے تھے کہ اگر صلح ہو جائے تو اچھا ہے۔ ان وجوہ سے وائسرائے ان کے ذریعہ سے مطلب براری کے خواہاں تھے۔ انگریزی جماعت میں ہر طرح کے لوگ موجود تھے۔ لارڈ چیمسفورڈ کی جابرانہ اور قاہرانہ پالیسی کے بعد لارڈ ریڈنگ وائسرائے بنائے گئے جو متحمل مزاج، اعلیٰ درجہ کے مدبر اور معاملہ فہم تھے۔ لارڈ ریڈنگ نے آتے ہی اپنا جال بچھا دیا۔ اس وقت تک پورا ہندوستان باغی ہو چکا تھا اور دلیرانہ میدان میں اتر آیا تھا۔ حکومت نے اپنی بندوقوں، رائفلوں، مشین گنوں کا جو مظاہرہ کیا تھا اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ حکومت کی متشددانہ اور سخت گیر پالیسی بھی ناکام ہو چکی تھی۔ لارڈ ریڈنگ کی غرض یہ تھی کہ کسی طرح یہ آگ بجھ جائے۔ اس کے لیے وہ تدبر کی فسوں کاری کو ذریعہ نجات بنانے پر آمادہ ہوئے۔

ان کی پہلی کوشش یہ ہوئی کہ کسی طرح مہاتما گاندھی کو اپنے دام تزویر میں لے آئیں۔ ابھی تک اہل برطانیہ نے گاندھی جی کو پہچانا نہیں تھا۔ وہ اب تک اس غیر معمولی انسان کو عام سطح سے جانچ رہے تھے۔ دوسری کوشش یہ تھی کہ تحریک اور اس کے لیڈروں کو بدنام کیا جائے۔ چنانچہ ایک تیر سے دو شکار کرنے کے لیے لارڈ ریڈنگ نے سب سے پہلے گاندھی جی سے ملاقات کرنی چاہی اور ترکیب یہ کی کہ یہ ظاہر نہ ہو کہ لارڈ ریڈنگ نے ملاقات کی خواہش کی ہے بلکہ فضا کچھ اس طرح بنائی جائے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ گاندھی جی نے ملاقات کی درخواست کی ہے۔

رئیس احمد جعفری نے مولانا محمد علی کا ایک مفصل بیان سیرۃ محمد علی میں نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مالوی جی نے مہاتما گاندھی کو لکھا کہ میں بیمار ہوں ورنہ خود آتا۔ اور میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں، اگر آپ الہ آباد نہ آ سکیں تو میں آؤں۔ اس طرح گاندھی جی جب الہ آباد گئے تو وہاں وائسرائے سے ملاقات وائسرائے کی خواہش پر ہوئی۔ درمیان میں مالوی جی تھے۔ یہ ملاقات چھ دن میں تیرہ گھنٹوں تک جاری رہی۔ لارڈ ریڈنگ نے گاندھی جی سے یہ پیشکش کی کہ ہندوستان کو آزادی دلانے اور خلافت ترکیہ کے اقتدار کو بحال کرانے میں وہ مدد دیں گے۔ مگر وہ مقصود اس کے جواب میں کہ ترک موالات کی تحریک تشدد سے بری ہے۔ یہ کوئی کہنے کی بات نہ تھی کیونکہ ترک موالات کی تحریک کی تو بنیاد ہی عدم تشدد پہ تھی۔ لیکن اس میں ایک راز پنہاں تھا۔

مولانا محمد علی کے خلاف گورنمنٹ نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ ان کے پاس شاہ افغانستان کا بھیجا ہوا ایک آدمی آیا تھا اور وہ ہندوستان پر افغانستان کا قبضہ کرا دینا چاہتے تھے۔ مولانا محمد علی فرماتے ہیں "اس پر بعض معزز ہندو حضرات نے مہاتما گاندھی کو پریشان کر رکھا تھا کہ آپ ان دونوں بھائیوں پر اتنا اعتماد کیوں کرتے ہیں؟ یہ سوراج چاہتے کب ہیں، یہ تو ہندوستان پر افغانستان کا راج کرانا چاہتے ہیں۔

مالویہ جی اور ڈاکٹر سپرو نے مہاتما گاندھی کو مولانا محمد علی کی تقریروں کے "چند جھوٹے چھوٹے سیاق و سباق سے بے تعلق اقتباسات (جو وسرائے نے فراہم کیے تھے) اس غرض سے انھیں دکھائے کہ انھیں ہم سے بدظن کر دیں" اس پر مہاتما گاندھی کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ ان کے متعلق ایک بیان شائع کر دیا جائے کہ مہاتما گاندھی کی ترک تعاون کی تحریک میں رہ کر ہمارا ارادہ نہیں ہے کہ ہم تشدد سے سوراج حاصل کریں۔ لیکن بعض احباب پر ہماری تقریروں کا یہ غلط اثر پڑا ہے۔ اس لیے ہم اظہار افسوس کرتے ہیں کہ ہم نے کیوں ایسے الفاظ استعمال کیے جن سے یہ غلط مطلب بھی نکل سکتا ہے۔"

وہ اقتباسات ڈاکٹر سپرو نے گاندھی جی کو دکھلائے جو سپرو اور مالویہ جی پہلے ہی گاندھی جی کو دکھلا چکے تھے۔ ان کو دیکھ کر مہاتما جی نے فرمایا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں ایک بیان ان دونوں بھائیوں کا شائع کرا دوں تاکہ پھر کسی کو بدگمانی کے لیے کوئی عذر ہی باقی نہ رہے۔ اس پر وائسرائے نے کہا کہ یہ بہت اچھا ہوگا۔ حکومت ہند نے فیصلہ کیا تھا کہ علی برادران پر مقدمہ چلایا جائے۔ لیکن اگر یہ بیان شائع ہو جائیگا تو پھر مقدمہ چلانے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔ یہ سن کر مہاتما نے فرمایا کہ مقدمہ چلانا نہ چلانا آپ کا کام ہے اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔ ہمیں تو ایک ضروری بیان شائع کرانا ہے اور وہ ہر حالت میں فرض ہے خواہ آپ مقدمہ چلائیں یا نہ چلائیں۔

چنانچہ ڈاکٹر سپرو اور پنڈت مالویہ جی کو دکھا کر مولانا محمد علی کا مذکورہ بالا بیان اخبارات میں شائع ہو گیا لیکن بیان دینے سے قبل مولانا محمد علی نے بھی طور پر ان اقتباسات کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی

اتفاق کرتے ہوئے لارڈ ریڈنگ اور پنڈت مالویہ دونوں کو تار دیا۔ لارڈ ریڈنگ نے تو خاموشی اختیار کی لیکن مالویہ جی نے اقتباسات بھیج دیے۔

مولانا محمد علی کا بیان ہے کہ "میں نے جب یہ اقتباسات پڑھے تو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ بعض تو غلط فہمی یا غلط سننے یا غلط نویسی کا نتیجہ ہیں اور بعض کے صحیح غلط معنی پہنائے جا رہے ہیں۔ ایک بھی اقتباس ایسا نہیں ہے جس سے تشدد کی ترغیب یا نیت ثابت ہو" پھر بھی اپنے ابنائے وطن کے دل سے شک و شبہ دور کرنے کے لیے بیان شائع کر دیا۔

بیان کا شائع ہونا تھا کہ حکومت نے تمام ہندوستان میں ڈنکا پیٹ دیا کہ مولانا محمد علی نے معافی مانگ لی ورنہ ان پر مقدمہ چلایا جاتا۔ خیال یہ تھا کہ عوام محمد علی سے بدظن ہو جائیں گے۔ لیکن اب وہ وقت گزر چکا تھا۔ لوگ حیرت زدہ ضرور ہوئے مگر ریشہ دوانی کا بھید سمجھ گئے۔

لارڈ ریڈنگ نے اس بیان اور گاندھی جی کی ملاقات کا بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور چیمسفورڈ کلب میں تقریر کرتے ہوئے ذرا تو یہ ظاہر کیا کہ گویا گاندھی جی ملاقات کے مسائل طے کر آئے تھے۔ دوسری جانب یہ اشارہ تھا کہ محمد علی نے معافی مانگ لی ورنہ ان پر مقدمہ چلایا جاتا۔ مولانا محمد علی تحریر کرتے ہیں کہ "میرے جلد باز بھائی مولانا حسرت موہانی نے اس تقریر کو پڑھتے ہی مجھے ایک کارڈ لکھا جس میں درج تھا کہ اگر مہاتما جی نے تمہیں اس بیان کے شائع کرنے سے پہلے ہی اطلاع دے دی تھی کہ وائسرائے نے اس شرط پر تمہیں معاف کیا ہے تو تم سے بڑھ کر کوئی بزدل نہیں۔ اور اگر انھوں نے اس کی اطلاع تمہیں دی تھی تو ان سے بڑھ کر کوئی بے ایمان نہیں۔ لیکن میرے جوشیلے بھائی کو یہ نہ سوجھا کہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لارڈ ریڈنگ نے ملاقات خلاصہ درج کیا ہو۔"

آگے چل کر مولانا محمد علی لکھتے ہیں کہ:-

"بہر حال جب میں نے چیمسفورڈ کلب والی تقریر پڑھی تو سارا بدن پھنک گیا اور میں نے مہاتما جی سے کہا کہ اجازت ہو تو اس کا جواب دے دوں۔ جب خلافت کا جلسہ تھا میں صدر تھا۔ تقریر صدارت کچھ دبی ہوئی سی تھی مگر اس کے بعد میں نے صرف لارڈ ریڈنگ کی تلبیس کا پردہ چاک کیا اور مشکل ہی سے میں نے ساری عمر میں اس سے زیادہ سخت کوئی تقریر کی ہوگی۔"

اس کے بعد کراچی کا مقدمہ چلایا گیا۔ کراچی کے مقدمے کے فیصلے کے بعد مولانا محمد علی اور زیادہ ہیرو بن گئے۔ اگرچہ سزا تو بہت سے لوگوں کو ہوئی مگر زیادہ ذکر مولانا محمد علی کا تھا کیونکہ اول تو اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے لیڈر تھے دوسرے انھیں نے تجویز صدر کی حیثیت سے پیش کی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سر دھڑ کی بازی لگی ہوئی تھی۔ روزمرہ جلسے ہوتے تھے۔ اور جلسوں میں معلوم نہیں کہاں کہاں سے رضاکار آجاتے تھے جو جلسے کے اندر اور جلسے کے باہر اپنی محفل جماتے اور طرح طرح کے اشعار گاتے تھے۔ ٹولیاں جمع ہو جاتی تھیں اور اوقات کانفرنس کے باہر پبلک کو مشغول رکھتی تھیں۔ گھر گھر یہ صدا پہنچ چکی تھی:

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اسی کے ساتھ بہت سے بند تھے اور آخر کا مقطع وہی تھا "جان بیٹا خلافت پہ دے دو"۔ کاش کہ ادبی و تنقیدی نقطۂ نظر سے الگ ہو کر کسی نے تاریخ کی خدمت کے لیے ان تمام اشعار کو جمع کیا ہوتا تو اس سے اس زمانہ پر اچھی روشنی پڑتی۔ اب کراچی کے فیصلے کے بعد کی ایک دلگداز نظم ملی ہے جو درج ذیل ہے۔

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی — ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
تم کو ریشم کے کپڑے مبارک — تم کو تہذیب دیتے مبارک
ہم کو کمبل کے ٹکڑے مبارک — ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
تم کو محلوں میں رہنا مبارک — تم کو تکیہ مسہری مبارک
ہم کو مٹی پہ سونا مبارک — ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
تم کو دودھ اور حلوہ مبارک — تم کو بسکٹ و کیک مبارک
ہم کو چکی کی روٹی مبارک — ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

یہ والہانہ جذبات، یہ اظہار عقیدت و محبت کیسے دلیرانہ عزم اور قوتوں کی گرفت سے لاپروائی کی داستان بیان کرتے ہیں۔ اشعار پڑھے جاتے تھے اور لوگ زار و قطار روتے تھے۔ بجنور میں ایک مشہور قصبہ کرتپور ہے۔ کرتپور میں مرزا عبداللطیف بیگ کا مکان تھا جو ضلع کانگریس کمیٹی بجنور کے صدر تھے۔ کرتپور میں ایک ضلعی کانفرنس ہوئی جس کی صدارت خود مرزا عبداللطیف بیگ نے کی۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ یہ کانفرنس احمد آباد کانگریس سے پہلے اور کراچی کے مقدمہ کے فیصلے کے بعد ہوئی تھی۔ مرزا عبداللطیف بیگ بڑے دل و دماغ کے آدمی تھے۔ وہ لوگوں کا رونا دھونا دیکھ کر بجائے اس کانفرنس کے تقریر کہنے لگے کہ میں رونے کا قائل نہیں ہوں۔ یہ ایک کمزوری کی بات ہے۔ بات گئی گزری ہو گئی۔ چند ہی روز بعد کرتپور میں کانفرنس ہوئی وہاں معلوم نہیں کہاں سے ایک گانے والے والنٹیروں کی ٹولی آگئی۔ پہلے ان لوگوں نے قصبہ میں گشت کر کے بڑے ہی دلکش انداز میں گھر گھر گایا:۔

اب تو چرخے کا آیا زمانہ   میری ماں مجھ کو چرخہ چلاؤ

میں نے اس پوری نظم کو لکھ لیا تھا مگر افسوس کہ اب موجود نہیں ہے صرف یہی شعر یاد رہ گیا۔ اس کے بعد کانفرنس کے باہر وہی کراچی والی نظم گائی گئی۔ جب کانفرنس ختم ہوئی تو لوگوں کی درخواست پر جناب صدر نے اندرون کانفرنس اس نظم کو پڑھنے کی اجازت دے دی۔ اس قدر اثر ہوا تھا سارا مجمع بے قرار تھا اور سب سے زیادہ مرزا عبداللطیف بیگ کا حال خراب تھا۔ زار و قطار رو رہے تھے۔ تمام چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا۔ بعد کو میں نے ان سے پوچھا حضرت! آپ کا وہ وعدہ کیا ہوا؟ کہنے لگے: سچ ہے میں کیا کروں بے قابو ہو گیا تھا۔

یہ ستیہ گرہ کا اور کھلا ہوا تھا۔ سارے ملک کا یہی حال تھا۔ روزانہ گرفتاریاں ہوتی تھیں۔ لوگ خوشی خوشی جیل جاتے تھے اور بعض جگہ لاریاں کھڑی کر دی جاتی تھیں تو ستیہ گرہی اس پر کود کود کر بیٹھتے تھے کہ پولیس کو روکنا پڑتا تھا کہ اب گنجائش نہیں ہے۔ بالکل یہ حال تھا۔ شعر

بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

حکومت کا رویّہ

انگریز جیسے مغرور قوم کا رویہ جو ہندوستانیوں کا تھا وہ یہ سمجھتے تھے کہ ڈرا دھمکا کر کام نکال لیا جائے گا۔ وہ اپنی گورا فوج، مشین گن اور رائفلوں کی نمائش کرتے تھے اور جب اس سے مرعوب نہیں ہوئے تو دوسرا طریقہ بے حساب گرفتاریوں، نیز جیلوں کے اندر طرح طرح کی سختی کا اختیار کیا۔ بات بات پر قید تنہائی کی سزا دی جاتی تھی۔ جن لوگوں کو قید با مشقت کا حکم ہوتا تھا ان سے رام بانس کٹوایا جاتا تھا۔ دوائیں پسوائی جاتی تھیں۔ گرمیوں میں لوگ بارکوں میں بند کر دیے جاتے تھے اور سردیوں میں بارکوں کے دروازے کھلے رکھے جاتے تھے۔ ٹاٹ اور کمبل میں بے شمار پسو ہوتے تھے۔ کھانے میں روٹی گیلی ہوتی تھی، آدھی کچی تول میں پوری کر دی جاتی۔ جسے انسان تو کیا جانور بھی مشکل سے کھائے۔ صبح آٹھ بجے مسور کی دال دے دی اور پانچ بجے شام کو بینگن کی ترکاری اور ترکاری بھی کیسی جس میں بعض اوقات کیڑے تیرتے رہتے تھے۔ اخبار قطعی منع تھا اور اخبار اگر کسی طرح سے آ جائے اور مل جائے تو ایسا چھاپہ پڑتا تھا کہ جس طرح قتل اور ڈکیتی کے ملزم پر پڑتا ہے۔

البتہ بعض افسران ایسے بھی تھے جو اندازہ لے رہے تھے کہ جذبہ کی گہرائی کیا ہے اور ہندوستانی کتنے پانی میں ہیں۔ وہ یا تو چیلنج کرتے تھے یا کھلی چھوٹ دے دیتے تھے۔ مثلاً لاہور کے کلکٹر نے چیلنج کا رویہ اختیار کیا تھا۔ لالہ لاجپت رائے نے پچاس گز جوٹ دھو لیے گا نہیں 1920ء کا گز جوٹ آج کا

نہیں) ایک دن جیل بھیجے۔ کلکٹر نے چیلنج کے لہجے میں کہا بہت خوب سے جاؤ ان کو انگلش کوارٹر میں۔ انگلش کوارٹر جیل کا سب سے آرام دہ مقام تھا۔ جہاں عمدہ غذا بھی ملتی تھی کیونکہ اس میں گورے رکھے جاتے تھے۔ دوسرے دن لالہ جی نے پھر پچاس گریجویٹ بھیجے۔ پھر کلکٹر نے وہی حکم دیا۔ اندازہ یہ تھا کہ دیکھیں ظرف ہندوستان کا۔ تیسرے دن بھی پچاس گریجویٹ۔ اب تو کلکٹر کے چہرے پر حیرانی اور خوف کے آثار نمایاں ہوئے۔ مگر پھر وہی حکم سے جاؤ انگلش کوارٹر۔ چوتھے دن پھر پچاس گریجویٹ۔ اب کلکٹر ہمت ہار گیا اور کہنے لگا۔

INDIA IS MAKING A SACRIFICE AND IF INDIA GOES ON MAKING THIS SACRIFICE WE SHALL HAVE NO OJECTION IN LEAVING INDIA.

(ہندوستان قربانی دے رہا ہے۔ اور اگر ہندوستان اسی طرح قربانی دیتا رہا تو ہم کو ہندوستان سے چل دینے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا)

ہتھکڑیاں بھی لگائی جاتی تھیں۔ اسی لیے مولانا سید محمد فخر بخود الٰہ آبادی سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل جب گرفتار ہوئے تو ایک نظم کہی اس کا ایک شعر ہے ؎

بیڑیاں مجھ کو پہننے میں ذرا ذلت نہیں ۔۔۔ باپ دادا کا طریقہ سنت سجاد ہے

خواتین

شروع تحریک سے خواتین بھی میدان میں آگئی تھیں۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے قدم اٹھانے والی بی اماں تھیں۔ بی اماں کی گود میں علی برادران جیسے دلاور و جانبازان اسلام نے پرورش پائی تھی۔ بی اماں بڑی ہی دیندار اور خدا پرست بی بی تھیں۔ یہ لوگ چھوٹے ہی تھے کہ بی اماں بیوہ ہوگئیں۔ یہ انھیں کا دل و گردہ تھا کہ اس عالم میں ایسی تعلیم دلائی اور ایسی اسلامی تربیت دی کہ انگلستان جاکر وہ انگریزی کے بہترین انشاء پرداز اور مقرر ہونے کے باوجود اسلامی معتقدات پر مضبوطی سے جمے رہے۔ بی اماں بوڑھی تھیں اور ان کو اوبہ چی وغیرہ بھی ماما ہی کہتے تھے۔ وہ جلسوں میں شریک ہوتی تھیں اور کراچی کے مقدمہ کی سزایابی کے بعد تو وہ مکمل کام کرنے لگی تھیں۔ بیگم محمد علی برقعہ اوڑھتی تھیں اور اسی طرح انھوں نے مقدمہ کراچی کے بعد کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ تمام جلسوں میں جاتی تھیں اور تقریریں بھی کرتی تھیں۔ مولانا حسرت موہانی کے صرف ایک لڑکی تھی۔ مولانا حسرت موہانی برقعے کے قائل نہیں تھے۔ وہ صرف ایسا لباس پہننے کے قائل تھے جس میں سارا بدن چھپا رہے۔ بیگم حسرت موہانی اور ان کی صاحبزادی برابر جلسوں میں شریک ہوتی تھیں میں نے ان دونوں کو لمبی چادریں اوڑھے

دیکھا۔ اگرچہ برقع پہنے ہوئے تھا مگر چہرہ یا جسم کا کوئی حصہ کبھی نظر نہیں آیا۔ ان کی تقلید میں بہت سی عورتیں پردے سے بالکل نکل آئی تھیں۔ جلوس نکالتیں اور دل برچھیاں مارنے والے نعرے لگاتی تھیں۔

جہاں تک ہندو عورتوں کا تعلق ہے گاندھی جی کا ایک خاص مشن تھا یہ بھی کہ ہر سماجی اور سیاسی ملکی کاموں میں گھر گھر جا کر چرخہ کا پرچار کیا گیا۔ اس طرح ہندو کی عورتیں نکل پڑیں اور جلسوں میں بھی آنے لگیں۔ انہوں نے مرد اور عورتوں کے جلوس کے دو گانے سنے تو بہت ہی دلچسپ معلوم ہوئے۔ ایک کا مطلب یہ تھا کہ اٹھ لگے جوتے اور ٹھوکو جیل لے چلئے۔ دوسرے میں ڈاکیہ کو خطاب کر کے دریافت کیا گیا تھا کہ خط آیا ہے کس کا ان لوگوں کا جو ملک پر قربان ہو کر جیل گئے تھے مثلاً

اے ڈاکیے اے ڈاکیے سچ سچ بتا کیا تاصفدر کا کوئی خط آیا ہے؟

اس طرح مختلف قیدیوں کے نام لیے جاتے تھے۔ یہ ہندو مسلم خواتین اور مردوں کی صفائی کا بھی ایک مخصوص اور دلربا منظر تھا۔

الغرض ایسے حالات اور کارناموں کے ذریعے گاندھی جی کی قیادت میں بڑی مشکل اور مصیبت سے لایا ہوا ملک کی جانب چل پڑا، یہی وہ سارے ہندوستان کے مسلم اور ہندو لیڈر گاندھی جی کے ساتھ مل کر [illegible] سوراج کی اسکیم اور علامت عظمیٰ کی بحالی اور حصول سوراج کے لیے پوری طرح کی [illegible] لگانے ہوئے تھے۔

چند مثالیں

ہندوستان کی جرأت و مردانگی و استقامت اور حکومت کی [illegible] کا اندازہ اخبار [illegible] میں طبع ہونے والے چند واقعات سے ہوگا انہیں مشتے نمونہ از خروارے پیش کیا جارہا ہے۔

15 دسمبر 1921ء کو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مدیر ' پیغام ' کلکتہ کو دو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

19 دسمبر 1921ء کو لاہور میں مولانا ظفر علی [illegible] گرفتار کر لیے گئے اور اسی دن مولوی عبد الحسن سکریٹری مجلس خلافت کلکتہ میں گرفتار ہوئے۔ ایک کتب فروش نے حلف لیا کہ وہ دکھ [illegible] گے اور خلافت فنڈ میں ہر ماہ چندہ دیں گے۔

اسی دن کی خبر ہے کہ پنڈت شوبھان [illegible] پنشن 17 نے بیان کیا کہ ان کی بیٹی کو جب وہ بصرہ میں مقیم تھی اخبارات کے ذریعہ کانگریس کے احکام موصول ہوتے اور بعد سے [illegible] ترک ملازمت کے لیے تیار ہوگئے۔ بیٹی کراچی واپس آگئی جہاں ان سب لوگوں نے استعفیٰ دے دیا۔

لاہور میں آٹھ آٹھ سال کے بچے ڈبی بازار میں گشت کر کے کہہ رہے تھے کہ فوج کی ملازمت حرام ہے ان کو پولیس نے ڈنڈوں سے پیٹا۔

20 دسمبر 1921ء کو روزنامہ انڈیپنڈنٹ الہ آباد کی دو ہزار روپیہ کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ اسی دن پنڈت مدن موہن مالوی کے بھانجے شری کرشن کانت مالوی گرفتار ہوئے۔

22 دسمبر 1921ء کو پانچ سو رضاکار کلکتہ میں نکلے 253 گرفتار ہوئے۔

25 دسمبر کو منشی احمد خاں نے ترکی خاتون دختر خانم پر ایک نظم لکھی جس کے مجاہدانہ کارناموں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس کا آخری شعر یہ ہے ؎

اے ننگ قوم مرد بے غیرت کا یہ مقام　　جنس لطیف عازم میدان جنگ ہے

22 دسمبر 1921ء کو لالہ لاجپت رائے، کے سنتانم، ملک لال خاں، ڈاکٹر گوپی چند کا مقدمہ سنٹرل جیل لاہور میں پیش ہوا۔ گورنمنٹ کے وکیل مسٹر ہربرٹ نے جج مذکورہ اشخاص میں کسی پر بھی رحم نہ کرے اور جس قدر سزا کا اختیار ہے وہ کل سزا ان کو دے تو کے سنتانم نے کہا "آمین"۔ مسٹر ہربرٹ نے کہا کہ لالہ لاجپت رائے نے اپنے بیان میں جو 3 دسمبر کو صبح 5 بجے کے وقت لکھا گیا تھا اور جس پر مارچ کے دستخط ہیں لکھا ہے کہ ہم جانتے تھے کہ اس جلسے کے انعقاد کی ممانعت کی جائے گی اور ہم گرفتار کر لیے جائیں گے۔ پھر یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ انھیں اس حکم کا علم نہیں تھا۔ لالہ لاجپت رائے نے فرمایا "لیکن کہنا ہی کون ہے" سنتانم نے کہا "ہم جانتے تھے کہ ایک پاگل کتا موجود تھا کہ وہ ہمیں کاٹتا"

22 دسمبر 1921ء کو لالہ دیپ لال سکریٹری کانگریس کمیٹی سیالکوٹ کو چھ ماہ قید سخت و ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی اور سید حبیب سکریٹری کانگریس کمیٹی لاہور کے مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ لالہ لاجپت رائے جالندھر کو ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی اور جب رضاکاران لاہور نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا وہ گرفتار کر لیے گئے۔ اس کا جواب پبلک نے یہ دیا کہ دو گھنٹے تک اسی موجود راستے سے گزرتے اور نعرے لگاتے رہے۔ اسی 22 دسمبر 1921ء کو لالہ بدری ناتھ ایڈیٹر روزنامہ "سوراج" لاہور پر حسب دفعہ 124 تعزیرات ہند سزا سناتے ہوئے میجر فریر مجسٹریٹ نے کہا "میں بدری ناتھ پر دفعہ 124 تعزیرات ہند فرد جرم لگا رہا ہوں۔ عدالت میں اس کے رویہ کو دیکھ کر میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ دیوانے کتے کے مانند ہے جس کو زہر پھیلانے سے قید کے سوا کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ میں اس کو تین سال قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں۔

20 دسمبر کو مولانا محمد شفیق، محمد عبدالودود، بابو جھنک دھاری پرشاد، بابو نندے ورری پرشاد ورما کا

مقدمہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا۔ صرف دو وکلا کو اجازت دی گئی تھی۔ ایک بجے اذان ہوئی۔ عدالت نے نماز ادا کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن مولوی محمد شفیق اور محمد عبدالودود نے وہیں کمرۂ عدالت میں نماز ادا کی اور کہا کہ پانچ سو رضاکار دستہ میں گشت کر رہے ہیں اور گھنٹہ بجا کر اعلان کیا کہ لوگ کچہری کے احاطہ میں جمع ہوں۔ دو تا کیمپ پرشاد سیکرٹری گرفتار کر لئے گئے۔

25 دسمبر کو ہیڈ کانسٹیبل محمد اکرم جس نے تین دن ہوئے سرکار کی طرف سے گواہی دی تھی درخواست دی کہ میں نے جو بیان دیا ہے۔ دباؤ اور ... بذات خود دیا ہے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر میں استعفیٰ پیش کر دیا اور کہا کہ میرا ضمیر انگریزی حکومت کی ملازمت کی لعنت کو ایک منٹ بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اسے دفعہ 29 پولیس ایکٹ کے تحت تین ماہ قید کی سزا دی گئی۔

دو لڑکوں محمد اعظم اور عبدالعزیز جو 18، 19 سال کے تھے ان پر الزام لگایا کہ وہ کھدر کا پرچار کر رہے ہیں۔ اور ایک ایک سال قید با مشقت کی سزا ہوئی۔

26 دسمبر 1921ء کے ریفارمر کے مقالہ کا حسب ذیل اقتباس ہے:

"پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد سے تحریک کو بہت تقویت حاصل ہوئی ہے۔ مقامی کانگریس کے دفتر میں رضاکاروں کی فہرستیں چلی آ رہی ہیں۔ دور دراز کے رضاکار دستہ کے رضاکاروں میں بھرتی ہونے کے لئے جوق در جوق آ رہے ہیں۔ اور 24 دسمبر کی ہڑتال دیکھنے کے دن جیسی مکمل ہڑتال ہوئی کہ الہ آباد کے آسمان نے آج تک نہ دیکھی تھی۔"

پریزیڈنسی کالج کلکتہ کے طالب علموں نے حکومت کے جبر و تشدد کے خلاف 15 دسمبر سے 21 دسمبر 1921ء تک مکمل ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آنریبل سر دور مسٹر جسٹس سی۔ وی گھوش ڈاکٹر ساررت بہک اور رائے بہادر جوتی بی بہادر کے بیٹوں نے اس قرارداد کے حق میں رائے دی۔ ریفارمر تبصرہ کرتا ہے:

"پنڈت مدن موہن مالوی جی اور ڈاکٹر سپرو کے بیٹے تو عملی حصہ لے چکے ہیں۔ اب ان حامیان موالات فرزندوں کا طرز عمل ملاحظہ ہو۔ یہ تو زیادہ کا زیادہ خراب ہو چلا۔"

22 دسمبر 1921ء کو احمق پھپھوندوی مشہور مزاحیہ شاعر گرفتار ہوئے۔ کلکتہ کے دس ہزار قلیوں نے کام بند کر دیا۔

24 دسمبر 1921ء کو شہزادہ ویلز کی آمد کلکتہ میں تھی۔ مکمل بائیکاٹ کا اشتہار دیا گیا اور ہو کا عالم پیدا ہو گیا۔

26 دسمبر 1921ء مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی 8 بجے صبح اپنے مکان پر گرفتار ہوئے۔ ہوں ماکے

اعزاز اور اتنے عظیم لیڈر کی گرفتاری کے ردعمل سے خوفزدہ ہوکر ایک کثیر تعداد پولیس کو لے کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ خود معہ موٹر آیا تھا مگر مولانا نے موٹر میں بیٹھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے معمولی رضا کار کی طرح ہتھکڑی ڈال کر لے چلو۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے خود مولانا کے ہاتھ ہتھکڑی ڈالی اور لے گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی گرفتاری کے بعد حسب ذیل پیغام دیا تھا۔

مولانا آزاد کا پیغام

انتظار کی رات بڑی تاریک تھی لیکن امید کی صبح بھی کیسی دلفریب اور جانفزا ہے۔ افسوس ان پر جو اب بھی کروٹ نہیں۔ آؤ غفلت کا بستر ہمیشہ کے لیے تہہ کر دیں۔ خدا کا پاک نام لیں اور راہ مقصد میں آخری کوچ کریں۔ راستہ صاف اور منزل سامنے آ رہی ہے۔ ہمت صبر قربانی استقامت کے چند ایام میں صدیوں کا سفر طے ہو جائے گا۔

رہ و تشنہ لب نہ گھبرانا   اب لیا چشمہ بقا تو نے

اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ

فقیر ابوالکلام ۱۰ دسمبر 1921

باپ کا خط بیٹے کے نام

یکے از ہزا ملاحظہ ہو۔

اللہ اکبر

برخوردار من اطیع اللہ خاں زاد اللہ عزۂ وقدرہٗ

بعد دعائے ترقی عمر و درجات کے واضح ہو کر شاباش فی الحقیقت مجھے مسرت ہوئی کہ خداوند تعالیٰ نے تم جیسا بیٹا دیا۔ اپنی بات اور مذہب پر قائم رہنا۔ پائے ثبات لغزش نہ کھا جائے۔ کامیابی ضرور ہوگی انشاءاللہ تعالےٰ۔ ایسے دوستوں کو جو جیل میں ہیں میری مبارک باد اور دعا پہنچا دینا کیونکہ وہ بھی میرے بچے اور بھائی ہیں۔ اور اللہ تمہاری اور سب کارکنان خلافت کی مدد کرے آمین ثم آمین۔

راقم چودھری حبیب اللہ خاں رئیس قصبہ سہاور

ضلع ایٹہ   25 دسمبر 1921ء

جگراؤں میں چند رضا کار گرفتار ہوئے تو دس ہزار کے مجمع نے ان کا استقبال کیا۔ ۷ جنوری

1920ء کو کرشن کانت مالوی اور گووند مالوی اپنے رفقا سمیت پھر گرفتار ہوئے۔ 5 جنوری 1922ء کو ولنگٹن اسکوائر کلکتہ میں رضاکاروں کی بھرتی روکنے کے لیے ایک یورپین کمشنر ایک ہندوستانی ماتحت افسر اور سارجنٹ نے دھاوا بول دیا۔ جس پر ہزاروں آدمی رضاکار بنے اور دوسرے چار سو رضاکاروں نے گشت کیا جس میں 169 گرفتار ہوئے۔

20 جنوری 1922ء کو علی گڑھ میں سب انسپکٹر نے رضاکاروں سے منتشر ہونے کو کہا رضاکاروں کے لیڈر عبدالمجید خاں نے جواب دیا کہ تم اگر اس ریاکار حکومت کے اتنے دلدادہ ہو تو کیا ہم مذہبی اور احکام الٰہی سے سرمو سرتابی کر سکتے ہیں۔ اس پر پولیس والوں نے بندوق کے کندوں، بوٹ کے ٹھوکروں اور ڈنڈوں سے مارنا شروع کیا اور عبدالمجید خاں نے کہا دبا کر جم جاؤ اور یہ شعر پڑھا۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور قومی نعرہ لگا کر سب بیٹھ گئے۔ سب انسپکٹر نے قریب ایک گھنٹہ پیٹ اور ہتھیلیوں کے بل گھسیٹا لیکن ان کے ابرو پر بل نہ آیا۔ حتیٰ کہ ایک رضاکار صادق علی کو ایک دوکاندار کے جلتے ہوئے تیل کی کڑھائی پر دھکیل دیا جس سے اس کا جسم جل گیا۔ جو رضاکار مار سے بے ہوش ہو جاتا اسے اٹھا کر دفتر بھیج دیا جاتا تھا۔ مگر نہ کوئی بھاگا اور نہ کوئی ہاتھ اٹھا (ایسے واقعات عام تھے)

6 جنوری 1922ء کو 24 رضاکاروں کا دستہ پنڈت پریم پرکاش اور ماسٹر دیارام کی سرکردگی میں نعرے لگاتا ہوا امرت سر میں نکلا۔ پولیس اور گورکھا فوج کا ایک زبردست دستہ لاٹھیوں اور بندوقوں سے مسلح وہاں پہنچا اور نہایت بے دردی سے بید اور لاٹھیوں سے مضروب کیا۔ پنڈت پریم پرکاش کو سخت ضرب آئی اور وہ بے ہوش ہو گئے مگر رضاکاروں کے دوسرے دستوں نے برابر گشت جاری رکھا۔

18 جنوری 1922ء کو مولوی منظور احمد صاحب مبلغ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو رہا کرتے ہوئے مجسٹریٹ نے مسکرا کر کہا کہ ہمارے پاس ڈپٹی کمشنر کا حکم آیا ہے کہ آپ ساڑھے تین ہفتے جیل گزار چکے۔ ہم آپ کو زیادہ دیر جیل میں رکھنا نہیں چاہتے۔ مولوی منظور احمد نے جواب دیا مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے کہ مجھے آپ رکھتے ہیں کہ چھوڑتے ہیں۔ میں تو ایک دو سال جیل میں گزارنے کی امید رکھتا تھا۔

شراب کی دوکانوں پر خریدار اب نہیں ملتے تھے۔ شراب کی دوکانوں پر مسلسل پہرے کا بار تھا جو کانگریس والنٹیر جاری رکھے ہوئے تھے 23 جنوری 1922ء کو اکالی پریس اور سیاست پریس کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی گرفتاری پر ظفر حسن خاں نے منٹگمری جیل سے حسب ذیل نظم بھیجی جو مستقل کے فرضی نام سے ۱۹ فروری ۱۹۲۲ء کے زمیندار میں طبع ہوئی۔

توبہ کو میں بھی توڑ دوں بادہ جو جاں نواز ہو — اس میں ملی ہوئی مگر چاشنی حجاز ہو
لاوہ دو آتشہ شراب جس سے ہو گرم خوں مرا — ساقی انجمن نواز عمر تری دراز ہو
بزم میں روشنی ہوئی شمع جہاں پگھل گئی — کیوں نہ دعا میں ہو اثر دل میں اگر گداز ہو
کفر کی شوخیوں کو دیکھ تاکہ ہو خوں ترا جگر — خون جگر سے کر وضو تاکہ تری نماز ہو
آئے ابوالکلام بھی ہو کے اسیر جیل میں — تاکہ دراز رشتۂ خلوتیان راز ہو

گیارھواں باب

جنگ ترکی و یونان

سمرنا پر یونانی قبضہ

جنگ عظیم کے بعد سب سے بڑی طاقت برطانیہ عظمیٰ کی تھی۔ بہت سے ممالک جو ترکی سے
تھے ان کے حکم پر دبا دیے رہتی تھی۔ اس لیے ترکی کے ساتھ جس قدر ناانصافیاں اور ترکوں پر ظلم آرائیاں
ہوئیں ان کا ذمہ دار بجا طور پر برطانیہ ہی کو قرار دیا گیا۔ برطانیہ روس کی کا عزم ہو رہی تھی۔ اب کو
لائڈ جارج کہیں موسیو کلیمنشو کے بیچ کہیں کوئی اور اور زیادہ نئی رنگ میں۔ سب بہ صورت انگریز یعنی
برطانیہ کے آلہ کار تھے۔ بات وہی ہوتی تھی جو انگریز چاہتے تھے۔ خاص طور پر ان کے کار عالیہ نے اس کو
فریب میں مبتلا کرنے کے سب کا دعویٰ بھی سب گئے تھے۔ چنانچہ ایک ہی وقت میں یہ بات یہ ہوئی کہ مستقل
صلح سے قبل اور جو بات عارضی صلح میں نہیں تھی وہ کانفرنس نے منظور کر لیا۔ یونان کو سمرنا پر قبضہ
کرنے اور اناطولیہ پر تسلط جمانے کا حق دے دیا گیا۔ پیرس کانفرنس میں لائیڈ جارج، موسیو کلیمنشو اور
لانڈو دنیا کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھے۔ موسیو کلیمنشو کو ترکی سے شدید نفرت تھا اور وہ معاہدہ میں پیش پیش
رہتے تھے۔ چنانچہ ۵ مئی ۱۹۱۹ء کو موسیو کلیمنشو کی تجویز پر صلح کانفرنس نے یونان کو سمرنا پر قبضہ کرنے کی اجازت
دے دی اور 13 مئی 1919ء کو اتحادی بیڑے کی حمایت میں یونانی فوج سمرنا پر اتری۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ 13 مئی 1919ء کو برطانوی اور اطالوی جہازوں کے زیر سایہ یونانی فوج سمرنا
پر اتری۔ اسی دن مصطفیٰ کمال اناطولیہ کے لشکر کے انسپکٹر جنرل کی حیثیت سے سمرنا کی جانب روانہ ہوا۔ واقعہ
اس طرح پیش آیا کہ سمرنا کے ساحل پر یونانی فوجیں اتریں اور ایک تیز رو موٹر ساحل سمندر سے جا کر سمرنا کے
ترک گورنر کو بلایا۔ گورنمنٹ کمانڈنگ افسر نے کہا کہ امیر البحر (برطانیہ) نے حکم دیا ہے کہ سمرنا اور صوبہ ایدین
یونان کے حوالہ کر دیا جائے۔ اگر گورنر کے پیروں کے پاس بجلی گری ہوتی تو وہ اتنا مدہوش نہ ہوتا جتنا کہ
اس حکم سے ہوا۔ بہادر ترک حالات سے مجبور کمانڈنگ افسر کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ حکم اس نے جب سنا تو

اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ گورنر نے سر اوپر اٹھایا زبان کھولی اور کہا کہ سمرنا برطانیہ فرانس، اٹلی کسی کے حوالے کر دیا جائے مگر یونان کے حوالے نہ کیا جائے۔ افسر کمانڈنگ نے مغرور لہجہ میں جواب دیا "یہ اتحادیوں کی سپریم کونسل پیرس کا فیصلہ ہے اور ناقابل ترمیم ہے۔" مجبوراً گورنر نے چارج دے دیا۔ خلیفۃ المسلمین خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ سلطان عبدالوحید خان غازی کا فرمان واجب الاذعان پہلے ہی آچکا تھا کہ سمرنا میں مداخلت نہ کی جائے۔ ظل اللہ نے مجلس ملی (ترکی پارلیمنٹ) کو جو احتجاج کر رہی تھی پہلے ہی توڑ دیا تھا اور کاسہ لیس برطانیہ داماد فرید پاشا کو جملہ اختیارات سونپ دیے تھے۔ چنانچہ اس وقت حالت یہ ہوئی کہ سمندر کے ساحل پر ایک لاکھ کے قریب یونانی جمع ہو گئے۔ ان سب میں شامل یونان کا پادری تھا جس نے یونانی سپاہی ہمارے ساحل سمندر پر آئے۔ اس نے اپنے مذہب کو مدد کہا اور یونان کے سب ہموطنوں نے اپنی مدد میں تیغ کر لیے جن کو اس نے دعا دی ترک دشمن کچھ باقی رہ رہے تھے۔

"یہ ایک صلیبی جہاد ہے۔ مسلمان مردود ہیں۔ ان کتوں کو مار کر ختم کر دو۔ ان کا وجود مٹا دو۔ سمرنا اور ادرنہ یونان کا ہے۔"

پادری کی اس تقریر سے یونانی سپاہیوں کے دل عزم سے بھر گئے اور وہ جوش سے دیوانے ہو گئے۔ غریب گورنر کیا کرتا۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

ورنہ ترکی گورنر اور اس کے بچے کھچے جانباز ترک سپاہی اپنی شمشیر آبدار کا جوہر دکھلاتے ہیں نتیجہ خواہ کچھ ہوتا۔ دوسری طرف ترک پبلک میں بے پناہ جوش تھا۔ اناطولیہ کا ہر ترک و بچہ کا مسلمان اس ذلت کو برداشت کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا جب تک کہ اس کی سانس میں سانس باقی رہتی۔ چنانچہ عام باشندے مسجد میں جمع ہوئے اور وہاں پر جوش نعرہ لگایا کہ سمرنا ترکوں کا ہے۔ سب آگ سے کھیلنے کے لیے تیار تھے لیکن یونان کی غلامی کرنے اور اپنا ملک دوسرے کو سپرد کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ سب نے ایک وفد مرتب کیا اور سمرنا کے گورنر کی خدمت میں روانہ کیا اور مقابلہ کی اجازت طلب کی لیکن گورنر کے پاس چارہ کیا تھا۔ اس نے بادل ناخواستہ یہ جواب دیا کہ امیر المومنین کا فرمان ہے کہ مقابلہ نہ کیا جائے۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

کاش سلطان عبدالوحید غیرت و حمیت سے اتنا بے بہرہ نہ ہوتا تو اناطولیہ میں اتنے بے گناہوں کا خون نہ بہتا۔ اس ظلم و وحشت کی کہانی ادھوری رہ جاتی جو قیامت تک تہذیب انسانی کے استادوں کو تاریخ کے صفحات پر شرمندہ کرتی رہے گی اور وہ داغ لگا ہے جو کسی صابن سے دھویا نہ جا سکے گا۔

ادھر اگر سلطان وحید الدین اتحادیوں کے [illegible] ختم کرنے کے لئے تیار ہو تو خلیفہ کا [illegible] مسلمان ملکوں کی ہمدردیوں کے [illegible] [illegible] ناراض ہو گئیں۔ [illegible] مرتب ہوئے۔ سلطان وحید الدین کو خطرہ ہوا کہ کہیں اتحادی [illegible] ناراض نہ ہو جائیں۔ [illegible] خلیفہ کو [illegible] سے الگ کرنے [illegible] کا فیصلہ کیا۔

مصطفیٰ کمال پر خلیفہ کو ہمیشہ [illegible] رہا تھا۔ [illegible] کی بات ہے کہ جس دن سمرنا میں یونانی [illegible] [illegible] مصطفیٰ کمال کو [illegible] [illegible] مصطفیٰ کمال معاملات پر غور کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ [illegible] ملک [illegible] کیا جاتا ہے۔ جرمنی جو اصل [illegible] [illegible] شکست [illegible] اتحادیوں کی [illegible] تھا [illegible] [illegible] کی [illegible] اتحادیوں کے سربراہ مطالعہ کرتے تھے۔ [illegible] [illegible] جرمنی [illegible] [illegible] مقاصد حاصل [illegible] [illegible] کرنے کے منصوبے [illegible] تھے اور کوئی راہ نہ تھی۔ جو لوگ [illegible] جنگ [illegible] تھے وہ فرار ہو چکے تھے یا روپوش تھے۔

مصطفیٰ کمال [illegible] سے جرمنی [illegible] جنگ میں [illegible] [illegible] دماغ کے [illegible] [illegible] کہ جرمنی کو [illegible] شکست ہوگی۔ مگر جنگ کا اعلان [illegible] پاشا [illegible] کا کام تھا۔ اور جب [illegible] تو مصطفیٰ کمال نے [illegible] فوجی بصیرت اور خود اعتمادی کا جو مظاہرہ کیا اس نے ثابت کر دیا کہ اسے صرف میجر رکھنا ارباب حل و عقد کی کوتاہ [illegible] تھی۔

مصطفیٰ کمال نے [illegible] [illegible] کبھی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

مصطفیٰ کمال کا تدبر

مصطفیٰ کمال نے جس تدبر [illegible] [illegible] [illegible] اظہار کیا [illegible] سب کو [illegible] [illegible] عظیم [illegible] تھا اس سے جنگاری کو [illegible] آتش فشاں [illegible] [illegible]

میں خون زندگی دوڑا دیا۔ مصطفیٰ کمال اپنے کل اعزازات تمغات کے ساتھ سلطان کے نائب کی حیثیت سے روانہ ہوا۔ جب مصطفیٰ کمال جا چکا تو داماد فرید پاشا نے سلطان سے کہا کہ آپ نے مصطفیٰ کمال کو اناطولیہ کی افواج کا انسپکٹر جنرل بنا کر اسے اس بات کا موقع دے دیا ہے کہ وہ اناطولیہ میں بغاوت کی آگ لگا دے۔ سلطان کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا اور فوراً اس نے ہرکارے دوڑا دیے اور حکم بھیجا کہ مصطفیٰ کمال واپس چلا آئے لیکن وہ اس تیزی سے غائب ہوا کہ کہیں پتہ نہ چلا۔

مصطفیٰ کمال نائب السلطان کی حیثیت سے ایک ٹوٹے ہوئے کشتی نما جہاز پر سمسون کے بجائے سمرنا اپنے پانچ ساتھیوں کے ہمراہ پہنچا۔ وہاں دول متحدہ کے فوجی افسران نے اسے اپنا آدمی سمجھا۔ ساحل سمندر سے وہ سیدھا گھر گیا اور چار دن اسی گھر میں چھپا رہا اور مختلف مقامات کے ترکی فوجی افسران کو دعوت دیتا رہا کہ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ اناطولیہ آ جائیں۔

19 مئی 1919ء کو مصطفیٰ کمال سمسون پہنچا۔ وہاں بھی انگریزوں کا قبضہ تھا وہ وہاں سے بھی نکل گیا۔ چنانچہ وہ اندرون ملک چلا گیا اور وہاں بغاوت پھیلاتا رہا۔ پھر وہ شہر افز علی پہنچا۔ یہ شہر سمسون کے قریب ہے۔ اور ایک جگہ چھپ کر رہا۔ یہاں اس کو سمرنا کے وحشیانہ مظالم کی اطلاع ملی اور وہ اور تیزی سے بغاوت کی آگ پھیلانے لگا۔ انگریزوں کو مصطفیٰ کمال کی کارروائیوں کی اطلاع مل گئی اور انھوں نے مصطفیٰ کمال کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ مصطفیٰ کمال اماسیہ چلا گیا۔ وہاں اس نے ایک مشاورتی جلسہ طلب کیا تھا۔ یہاں پر انگریزوں کا قبضہ نہیں تھا

اماسیہ کا جلسہ

اماسیہ میں مصطفیٰ کمال نے کمال رأفت، علی فواد بے اور رؤف بے کو طلب کیا۔ ان چاروں نے اماسیہ میں جمع ہو کر اس جمعیت کا ... اور موجودہ حالات میں حسب ذیل امور اتفاق رائے سے طلب کیا۔

1 سمرنا کی مدافعت کے لیے بے ترتیب ٹولیوں کے بجائے منظم فوج ترتیب دے کر تیار کی جائے۔

2 تمام شہروں اور گاؤں میں بغاوت کی روح پھیلائی جائے۔

3 رضاکاروں کو فوجی تعلیم دی جائے۔

4 روپیہ، ہتھیار اور سامان رسد مہیا کیا جائے۔

5 اناطولیہ کی مدافعت تین حصوں میں تقسیم کر دی جائے۔

(الف) مشرقی حصہ کی مدافعت کاظم قرہ بکر کے ذمہ ہو۔

ب۔ مغربی حصہ علی فواد کے ذمہ ہو۔

ج۔ قلب کا چارج خود مصطفیٰ کمال کے پاس ہو۔

6 پورے ملک کی مدافعت کے لیے ایک مرکزی حکومت قائم کی جائے جس کا تعلق سلطان کی حکومت سے نہ ہو۔

7 اس مرکزی حکومت کو بنانے کے لیے ملک کے حقیقی نمائندوں سے مشورہ لینا ضروری ہے۔ چنانچہ جا بجا جو چھوٹی چھوٹی انجمنیں یا کمیٹیاں مدافعت کی غرض سے قائم ہو گئی ہیں۔ ان کا انضمام ایک واحد ادارہ میں کیا جائے جس کے قیام کے بعد ہی ہم لوگ اپنے ملک کو بچانے کے لیے بھرپور کوشش کر سکیں گے اور دنیا کو مخاطب کرنے کے حق دار ہوں گے۔

ان ہم اور جاندار فیصلوں کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مصطفیٰ کمال اور ان کے ساتھی کس عزم کے بنے ہوئے تھے۔ یوں تو وہ جانتے ہی تھے۔ گویا علامہ اقبال کے اس شعر کی تفسیر تھے۔

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

ترکی کی فوجی حالت اور یونانیوں کے مظالم

جب یونانی سمرنا میں اترے تو اس وقت سترھویں آرمی کور سمرنا میں اور بنا کی ہرکردگی میں تھی۔ دو رجمنٹ چھبیسویں ڈویژن کی لفٹیننٹ کرنل حریم بے کی قیادت میں تھیں جن میں سے ایک رجمنٹ ۱۷۲ اور ایک میں ہر کن علی بے تھی۔

سمرنا جانے سے قبل مصطفیٰ کمال نے جب اناطولیہ جا کر مدافعت کی تنظیم کرنے کی خفیہ مدارت قسطنطنیہ میں کر رہے تھے تو عصمت پاشا اور رؤف بے وغیرہ سب ان کے ساتھ ہو گئے۔ سب اور بہت سے دوسرے لوگ مصطفیٰ کمال کے چلے آنے کے بعد بھاگ کر اناطولیہ پہنچے اور اماسیہ کے مشاورتی جلسے تک کسی قسم کی مدافعت نہیں کی گئی کیونکہ سلطان کے حکم کے خلاف کوئی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے یونانیوں کو پورا موقع اپنے وحشیانہ مظالم کے دکھانے کا مل گیا۔ وہ مغرب میں سمرنا پر بڑھے اور مشرق میں عسکی شہر جانا چاہتے تھے جو ایک اہم ریلوے اسٹیشن تھا۔ اعتدال علی بے جس کی فوج محفوظ تھی۔ اس نے یونانیوں کا سختی سے مقابلہ کیا اور زبردست نقصانات پہنچائے۔ اب یہ سب لوگ پورے ملک میں بکھر گئے اور اپنا سامان پورا کرنے لگے۔ جنگ کی تیاریوں کا آغاز ہوا۔ اس دوران یونانی دیہاتوں میں گھس گئے اور انہوں نے وہاں کے باشندوں کے قتل عام کا اور عورتوں کی آبروریزی

کا وسیع پیمانہ پر آغاز کیا۔ وہ ان گاؤں کو جہاں ترک آباد تھے جلا دیتے تھے۔ بے شمار گاؤں انھوں نے پھونک کر خاک سیاہ کر دیا۔

علی بے نے یونانی فوجوں کے آنے پر اپنی انفرادی ذمہ داری پر ان کا مقابلہ کیا۔ یہ واقعہ 28 مئی 1919ء کا ہے۔ اس سے پہلے یونانیوں سے کوئی مزاحم نہیں ہوا تھا۔ لیکن سوما اک حصار اور ساسیبل کے مقامات پر ترکی فوجیں اپنے کو منظم کر رہی تھیں 15 جون 1919ء کو کرنل قاسم بے نے عارضی طور پر اکسٹھویں ڈویژن کا بالکیسری کے مقام پر خود چارج لیا۔ بعد ازاں وہ شمالی حصہ کے انچارج ہوئے جس میں ادرے میک سوما اور اک حصار شامل تھے۔ بہت سے محبان وطن فوج کو آمادہ کر رہے تھے۔ جلال بے نام بدل کر سمرنا سے نکل گیا اور 15 جون 1919ء کی شب میں بہادر علی بے کی فوجوں نے شب خون مارا اور پرگمان کے مقام پر یونانیوں کو تہس نہس کر دیا۔ علی بے کی مدد کے لیے بالکیسری اور بندرما سے بھی فوجیں آئی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانیوں کو اپنی منتشر افواج کو جمع کرنے کے لیے ناسلی کو خالی کرنا پڑا۔ ایدین میں تیاری ہو رہی تھی اور عوام یونانیوں پر دباؤ ڈال رہے تھے لیکن یہ سب متفرق لڑائیاں تھیں۔ ابھی کوئی منظم پروگرام نہیں بنا تھا۔ آخر جون تک ایدین کا محاذ قائم ہو سکا۔

مصطفیٰ کمال برخاست

اماسیہ سے مصطفیٰ کمال ارض روم چلا گیا۔ وہاں خلیفۃ المسلمین کا نامہ بر مصطفیٰ کمال کو ملا اور تحریری حکم پہنچا کہ مصطفیٰ کمال واپس قسطنطنیہ جائیں۔ انھوں نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا اور استعفیٰ دے دیا۔ جب خبر سلطان وحید الدین کو ملی تو اس نے غصہ اور مایوسی کے عالم اپنا ہونٹ اپنے دانتوں سے کاٹ ڈالا اور کانپتے ہوئے حکم دیا کہ مصطفیٰ کمال کو برخاست کر دیا گیا۔

مصطفیٰ کمال نے اپنے کل تمغے اور یونیفارم اتار دیے اور دیہاتوں میں نکل گیا اور وہاں اپنی تقریروں سے بغاوت کی آگ پھیلاتا رہا۔ مصطفیٰ کمال کے سامنے حسب ذیل دقتیں تھیں۔

1 پورا اناطولیہ جس کو اسے آمادۂ بغاوت کرنا تھا، سب خلیفۃ المسلمین کا مطیع و منقاد تھا۔ اور خلیفۃ المسلمین مصطفیٰ کمال کے سخت مخالف تھے۔

2 پورے اناطولیہ میں آگ بھری تھی۔ مرد تو مرد عورتوں نے بھی اپنی فوجیں بنائی تھیں۔ مگر کوئی نقطۂ اتحاد نہ تھا۔ پورے ملک میں مختلف کمیٹیاں اور انجمنیں قائم تھیں۔ اور جب تک ان کو ایک مرکز پر جمع کر کے ایک دستوری و جمہوری شکل نہ دی جائے اس وقت تک کوئی گفتگو کا محاذ کیسے ہو سکتا ہے۔

اور یہ ایک بڑا مشکل کام تھا۔ باہمی رقابتیں بھی کارفرما تھیں اور ایک مرکز پر سب کا جمع ہو جانا آسان نہ تھا۔ اس میں بڑے تدبر اور حکمتِ عملی کی مہارت کی ضرورت تھی۔

3۔ سرمایہ، سامانِ حرب اور رسد کی فراہمی کا بھی مسئلہ کچھ کم مشکل نہ تھا۔ جو … خارجی طاقتیں مدد کرنے کے لیے تیار تھیں۔ مگر آہنی دل و گردہ کا مصطفیٰ کمال ہمت ہارنے والا نہ تھا۔ اس پر یہ ذمہ داری آن پڑی تھی کہ صرف جنرل ہی نہیں ایک مدبر کے بھی فرائض انجام دے اور کچھ عرصہ بعد ایک جدید حکومت کی تعمیر کرے۔

مصطفیٰ کمال نے دن رات بغیر آرام کیے سادہ یونیفارم میں گاؤں گاؤں کا گشت لگایا اور تقریریں کرنا شروع کیا۔ اس مجاہدے میں اس کے کپڑے بھی تار تار ہو جاتے تھے۔ اس کو فاقے بھی کرنا پڑتے … چل پڑتا تھا۔ مگر کوئی مشکل ایسی نہیں تھی جس کو اس نے مشکل سمجھا ہو۔ اس نے اناطولیہ کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کے احترام میں اپنے کو خلیفہ کا نائب ظاہر کیا اور کہا کہ خلیفہ کو غیروں نے قید کر رکھا ہے۔ میں جو کہتا ہوں وہ خلیفہ کی آواز ہے۔ اس کے سوا اس کے پاس چارہ ہی کیا تھا۔

جنگ کے اختتام کے بعد احمد امین آفندی ایڈیٹر روزنامہ "وقت" قسطنطنیہ کو مقام انگورہ میں انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے۔

"جب ترکی اور اتحادیوں میں شرائط التوائے جنگ پر دستخط ہوئے تب میں حلب میں تھا۔ [illegible] میں نے ہر شخص کو رنجیدہ اور زندگی سے بیزار پایا۔ ترکی کی فوری مصیبت نے خلیفہ کے آدمیوں کو … کر دیا تھا۔ … لیے ہوئے تھے۔ قوم میں ایک خلاقی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ صورت حال کا مقابلہ صرف ایک ایسا نظام کر سکتا ہے جس کی مدد پر قوم خود آمادہ ہو۔ … اناطولیہ کے باشندوں کو ترکی کی تقسیم کے خطرات سے آگاہ کر کے ان کو موثر مدافعت کی جائے اور کوئی صورت نہ تھی … قوم میں جا کر اور ان سے مل کر کام کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کام کا … اناطولیہ ہو سکتا تھا قسطنطنیہ میں کام کرنا ناممکن تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے فوج کا انسپکٹر جنرل مقرر کیا گیا۔ میں قسطنطنیہ سے اسی روز روانہ ہوا جس دن یونانی سمرنا میں اترے۔

میرا نظامِ عمل یہ تھا کہ قومی مدافعت کی غرض سے ملک میں بہت سی انجمنیں قائم تھیں ان کو متحد کر کے ایک زبردست نظام مرتب کیا جائے اور پھر اس نظام کو مقصد پورا کرنے کے لیے اور قومی آزادی کی مدد اور مدافعت کے لیے فوج کو استعمال کیا جائے۔"

سیواس کے مقام پر اناطولیہ کے گوشہ گوشہ سے نمائندے جمع ہوئے۔ یہ قومی نمائندوں کا ایک حقیقی اجتماع

تھا۔ یہاں ایک انجمن تمام اناطولیہ کی یک آواز قائم ہوئی اور مصطفیٰ کمال کو اس قومی انجمن کا صدر چنا گیا۔ اب مصطفیٰ کمال کو پوری قوم اناطولیہ کی طرف سے بات کرنے کا حق مل گیا۔ چنانچہ یہ ایک جدید عوامی حکومت قسطنطنیہ کے مدمقابل بنائی گئی۔

ادھر داماد فرید پاشا نے اگست ۱۹۱۹ء میں خلیفۃ المسلمین سے یہ اعلان کرا دیا کہ مصطفیٰ کمال باغی ہے۔ مداہنت کر کے افتراق پیدا کیا جائے اور سلطان وقت کی اطاعت کی جائے۔ اور یہ بھی حکم دیا کہ مصطفیٰ کمال کو گرفتار کر کے منصب سے علیحدہ کیا جائے۔ اس طرح داماد فرید پاشا کو امید تھی کہ اناطولیہ کے مسلمان جو خلیفہ کے وفادار ہیں مصطفیٰ کمال سے الگ ہو جائیں گے۔ دوسرا اور داماد فرید پاشا نے یہ کیا کہ شیوخ کُرد کو مصطفیٰ کمال کے خلاف لڑنے پر آمادہ کر لیا۔ اور اس کے لیے انگریزوں نے شیوخ کو کثیر رقم رشوت دینے کا جال بچھایا۔ مصطفیٰ کمال نے ان دونوں کا بھرپور جواب دیا۔

پہلا کام مصطفیٰ کمال نے یہ کیا کہ سیواس کانفرنس میں ایک تجویز احتجاج منظور کرائی۔ یہ کل اناطولیہ کی پہلی آواز تھی اور اس میں قومی جوش اور عزم بھرا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ یہ مطالبہ بھی تھا کہ داماد فرید پاشا کو برخاست کیا جائے۔ پھر اس نے استنبول کے باشندوں کے نام حسب ذیل پیغام بھیجا۔

"اے اہل استنبول (قسطنطنیہ کا دوسرا نام استنبول ہے) وطنی فرض انجام دینے میں شریک ہو جاؤ تاکہ ہمیں فرید پاشا کی وزارت پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ہو جائے۔ اگر ہم چپ رہیں گے تو دنیا کہے گی کہ اس قوم نے اپنی حکومت پر اعتراض کرنے کا حق کیوں، بروقت استعمال کیا۔ دنیا کا یہ کہنا بے جا بھی نہ ہوگا۔ ہمارے نبی کا فرمان ہے کہ جیسے تم ہو گے ویسے ہی تم پر حاکم بنائے جائیں گے۔"

استنبول کے اخبارات نے اس پیغام کو شائع کر دیا اور اس سے بم جیسا دھماکا ہوا۔ مسجدوں میں دعائیں ہونے لگیں۔ پرجوش نوجوان چھپ چھپ کر قسطنطنیہ سے نکل کر اناطولیہ مصطفیٰ کمال کے پاس آنے لگے۔ قسطنطنیہ میں انگریزوں کا قتل ہونے لگا۔

مصطفیٰ کمال نے چند روز بعد دوسرا بم گرایا جس کا دھماکا پہلے سے بھی زیادہ بھیانک تھا۔ اس نے انگریزی، فرانسیسی، امریکی، اطالوی، جرمن، سویڈنی، ڈنمارکی اور اسپینی سفیروں کے نام ایک دستاویز بھیجی جس پر سیواس کانفرنس کی مہر ثبت تھی۔ اس میں اعلان کیا گیا تھا کہ داماد فرید پاشا قوم کا غدار ہے۔ اس کی حکومت کا فیصلہ ناقص ہے۔ فرید پاشا کی حکومت انگریز کی پٹھو ہے۔ یہ مجلس حقیقی مجلس ملی ہے جس میں قوم کے نمائندے ہیں۔ کوئی فیصلہ اس وقت تک قابل قبول نہ ہوگا جب تک کہ قوم کے حقیقی نمائندوں کے

اس پر دستخط نہ ہوں۔

سلطان نے یہ حکم صادر کیا کہ ان کی اطاعت کی جائے اور فوراً ہی نئے انتخابات کرائے جائیں۔ داماد فرید پاشا کے خلاف جو محاذ مصطفیٰ کمال نے پیدا کر دیا تھا اس کا وزارت پر اثر ہوا۔ داماد فرید پاشا اس درجہ غیر ہر دلعزیز ہو چکا تھا کہ جب تک وہ رہے گا حکومت نہیں چل سکے گی۔ داماد فرید پاشا کو معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ علی رضا پاشا وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ علی رضا نے فوراً مجلس ملی ترکی پارلیمنٹ کو طلب کیا۔ اور اس میں جو نئے ممبر منتخب ہوئے تھے انہوں نے جمعیت کی خوب خوب مدح سرائی کی اور مصطفیٰ کمال پر تحسین برسائی لیکن نہ معلوم مصطفیٰ کمال کی موجودگی میں ان کی قسمت کا فیصلہ ہو جاتا۔

جب مصطفیٰ کمال نے انگورہ کو دارالسلطنت قرار دیا۔ انگورہ دو وجوہ سے ان کے مقاصد کے لیے موزوں تھا ایک تو یہ کہ انگورہ ساحل سمندر سے دور تھا۔ اور دشمن کا ادھر آنا ممکن نہ تھا۔ دوسرے انگورہ سے اناطولیہ کے اکثر مقامات کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ یہیں سے ترک چھپے چھپے دشمن پر حملے کرتے اور یہیں سے دور دراز مقامات تک فوجیں بھیجی جاتی تھیں اور یہیں سے دونوں محاذوں کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔

بالشویکوں سے تعلقات

اب سوال یہ تھا کہ یہ جنگ کیسے جیتی جا سکتی ہے، جب ترکی کے دشمن بہت زیادہ تھے اور ان کے حلیف شکست کھا چکے تھے۔ اور دوسری طرف مصطفیٰ کمال کی ذاتی طاقت محدود تھی۔ انہوں نے بالشویکوں سے مدد لینے کا ارادہ کیا۔ اور بین الاقوامی سیاست سے کام لے کر دول عامہ کی کمزوریوں اور باہمی رقابتوں کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جنہوں نے روس سے بھی معاہدہ کیا۔ اس وقت روس کی حالت یہ تھی کہ بالشویک انقلاب ہو چکا تھا اور بالشویک برسر اقتدار آ چکے تھے لیکن کچھ عرصہ تک ان کے خلاف بھی بالشویک مخالف جماعت سے لڑائی جاری رہی۔ مصطفیٰ کمال کو روس سے بہت فائدہ پہنچا اور اصل میں یہ بالشویک افغانستان اور ایشیا کی تحریکات کی مدد کے لیے اپنی کارروائیاں کر رہے تھے جن سے انگریز سخت خائف ہو گیا تھا

بالشویکوں اور انگریزوں کی عداوت تھی۔ انگریز قسطنطنیہ پر قابض تھے اور وہ سلطان اور ان کی مدد کر رہے تھے تو بھی جنوبی روس میں بالشویکوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اس لیے مصطفیٰ کمال بالشویکوں کی طرف رجوع ہوا اور بالشویکوں نے سامان واسلحہ دینے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

ترکان اناطولیہ کا جوش

ترکان اناطولیہ کا جوش بیان کرنے سے قلم عاجز ہے۔ انہوں نے سب کچھ لگا کر ڈال دیا۔ جوان سب فوج میں بھرتی ہو گئے۔ عورتیں اور بوڑھے دوسرے کاموں میں لگ گئے۔ جس طرح ایک ڈاکٹر خطرناک مرض سے آخر وقت میں موت سے بچانے کے لیے تن دہی کرتا ہے اسی طرح ترکی کو موت سے بچانے کے لیے اناطولیہ کا مسلمان اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار تھا اور مصطفیٰ کمال نے کمان ڈال دی۔

اس جوش و خروش کا شعلہ تھوڑی مدت میں گویا دنیا کے تمام مسلمانوں کو مشتعل کر دیا جس پر یونانیوں کی وحشت و بربریت کی داستانوں نے جو مغرب پسند یورپیوں کی زبانی بھی اخبارات میں آ رہی تھیں آگ پر تیل کا کام کیا۔ یونانیوں کے مظالم اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ قسطنطنیہ کی طرف سے بھی اس پر لفظی احتجاج کیا گیا اور ترک جو ابھی تک تھے مستقبل پر رکھ کر اور بھاگ بھاگ کر اناطولیہ پہنچنے لگے۔ بہت سے فوجی افسروں نے استعفے دے دیا اور قسطنطنیہ سے اناطولیہ چلے گئے اور مصطفیٰ کمال کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ سب نے سمجھ لیا تھا کہ یہ حیات و موت کی لڑائی ہے۔

اب اپنی جماعت کی نمائندگی کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے مصطفیٰ کمال نے خلیفۃ المسلمین کو چیلنج کیا۔ سلطان اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ آخر کار اس نے آقایان فرنگ سے فریاد کی مگر دول متحدہ کے اراکین میں جیسے بجرے لگانے پر جھگڑا ہو گیا تھا اور وہ عوامی تحریک کے خلاف کوئی موثر قدم اٹھانے کے لیے تیار نہ تھے۔ گرچہ انگریزی خبروں سے عیاں تھا کہ ترکی کا جو حشر ہونے والا ہے اس کے عمل درآمد کے لیے بری اور بحری افواج کے افسر مصطفیٰ کمال پاشا کی اناطولیہ تحریک کی وجہ سے دقت محسوس کرتے تھے کافی فوج اور سامان کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مصطفیٰ کمال نے اس دوران عسکری قوت سے انگریزوں کو اور جنوبی اناطولیہ میں فرانس کو مدافعتی پوزیشن سے نکال باہر کیا۔

اس طرح 1919ء اور شروع 1920ء کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اس تمام زمانہ میں اناطولیہ کی خبروں اور یونانیوں کے وحشیانہ مظالم کی داستانوں سے دنیائے اسلام کا ضمیر بیدار ہو گیا اور ہر چہار جانب سے دول متحدہ پر لعن طعن شروع ہو گئی۔ مصر، افغانستان اور ایران کے علاوہ خود عرب سے بھی انقلابی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہندوستان آتش کدہ بنا ہوا تھا اور گاندھی جی کی قیادت میں منزل آزادی کی جانب بڑے جوش سے چلا جا رہا تھا۔

ادھر انگریزی پروپیگنڈہ مشنری بھی تیز ہو گئی تھی۔ انگریزوں نے یہ مشہور کر دیا کہ مصطفیٰ کمال خلافت

کا دشمن ہے۔ مختصر یہ کہ یہ خبر ان خلیفوں کے لیے بڑی خطرناک تھی۔ جون 1920ء میں ٹائمز آف لندن جیسے
وسیع انگریزی روزنامہ نے یہ خبر شائع کی کہ مصطفیٰ کمال نے جمال مدنی پاشا، خلف بے اور شوکت آفندی وغیرہ
کو جو حال ہی میں اناطولیہ گئے ہیں، ذمہ دار بنا کے تیسرے حصے کے اعلیٰ افسر ہوتے ہیں سلطان معظم کی حکومت
ہے اور خود مصطفیٰ کمال وزیر مقرر ہوتے ہیں۔ احمد حسینی وسابق وزیر جنگ فرحت پاشا عاقل عادل کو وزیر
امور داخلہ اور شیخ سنوسی کو شیخ الاسلام بنایا گیا ہے۔

"ٹائمز نے یہ بھی لکھا تھا کہ بالشویکوں کی سرگرمیاں بہت ترقی کر گئی ہیں اور مصطفیٰ کمال بالشویک ہو گیا
مذہب اسلام ترک کر دیں گے۔ یہ بھی تحریر کیا کہ عرب میں شامی پاشا، شیخ عبدالعزیز فرمانروائے نجد وغیرہ باہم
متحد ہوتے ہیں اور بالشویکوں کی مدد سے مغربی ایشیا میں بڑی زبردست حالت پیدا کر رکھی ہیں۔

ان سب گروہوں کا ایک جواب کافی تھا کہ اناطولیہ کی مسجدوں میں سلطان وحید الدین کے نام کا خطبہ
برابر پڑھا جاتا تھا۔

خلیفۃ المسلمین نے اس وقت شیخ الاسلام کو گرفتار کرا کے ماشا... کر دیا تھا کیونکہ وہ غلط فتویٰ
دینے کے لیے تیار نہ تھے اور سید عبداللہ کو شیخ الاسلام اور مفتی اعظم قرار دیا تھا۔ مفتی اعظم نے اپریل
1920ء کو حسب ذیل فتویٰ دارالخلافہ باشا کی جدید وزارت میں صادر فرمایا۔

"شریعت کی رو سے یہ ممکن ہے کہ جن لوگوں نے متحد ہو کر بغاوت کی رعایا کو دھوکا دیا جائے ان
کی بیخ کنی کر دی جائے کیوں کہ ان دونوں نے بھرتی کرنی شروع کر دی ہے اور ان کی فوج
تیار کرنے اور ان کی خوراک کا سامان کرنے کے بہانے سے ان پر ٹیکس لگائے ہیں۔ سلطنت
کے بعض مقامات پر حملے کیے ہیں اور وفادار رعایا کو قتل کیا ہے۔ جنرل ایچ وائی (؟) آف خلافت
کے ساتھ سلسلہ رسل و رسائل قطع کر ڈالے ہیں اور سلطنت کے دوسرے حصوں سے بھی
سلسلہ رسل و رسائل کو قطع کر دیا ہے جنھوں نے مذہبی حکام کو بلا وجہ اپنی جگہ سے ہٹا دیا
ہے اور ان کی جگہ پر اپنے ہوا خواہوں کو مقرر کیا ہے۔ گورنمنٹ کے انتظامی حکم کو روک دیا ہے
اور دارالحکومت کو بقیہ ملک سے علیحدہ کر کے اقتدار خلافت کے دامن پر دھبہ لگایا ہے۔ جھوٹی جھوٹی باتیں
مشہور کر کے جھگڑے پھیلا دیے ہیں حالانکہ ان لوگوں کو حکم دے دیا گیا ہے کہ منتشر ہو جائیں مگر
اس پر بھی یہ لوگ اپنی جدوجہد سے باز نہیں آئے۔ سلطنت عثمانیہ میں جتنے مسلمان ہیں وہ خلیفہ
وحید الدین خاں کے گرد کیوں نہ جمع ہوں۔ اگر خلیفہ کے سپاہیوں نے بے وفائی اور علیحدگی اختیار
کی تو وہ فقط اس دنیا میں نہیں بلکہ دوسری دنیا میں بھی سزا کے مستحق ہوں گے۔ خلیفہ کے وہ سپاہی

جو باغیوں کو قتل کریں گے کیا وہ غازی نہ کہلائیں گے اور جو سپاہی قتل ہو جائیں گے کیا وہ شہید نہ کہلائیں گے۔ جن لوگوں نے بادشاہ وقت کے حکم کو نہ مانا کیا وہ بموجب شریعت سزا کے مستحق نہ ہوں گے؟ ان سب سوالوں کا جواب اثبات میں ہے۔ اس فتویٰ پر زبدالعبد عبداللہ کے دستخط ہیں۔

13 مئی 1920ء کو داماد فرید پاشا کے سوال پر شیخ الاسلام نے دوسرا فتویٰ بالفاظ ذیل شائع کیا۔

اختصار فتویٰ شیخ الاسلام باجلاس مجلس جدید مشیران سلطنت داماد فرید پاشا

"کیا شریعت کے مطابق یہ جائز ہے اور ممکن ہے کہ ان اشخاص کو قیمت و نابود کر دیا جائے جنھوں نے رعایائے ملک معظم کو دھوکہ دینے کے لیے باہمی تعلق سے ایک غول بنا لیا ہے جنھوں نے بد ذاتی شروع کر دی ہے جن کو کھانا کھلانے اور مسلح کرنے کے بہانے سے لوگوں سے محصولات وصول کیے ہیں، جنھوں نے سلطنت کے مختلف حصوں پر حملہ آور ہو کر عوام کو زیر ظلم کیا ہے، جنھوں نے خیر خواہ رعایا کو ہلاک کیا، جنھوں نے خلیفہ کے جنرل اسٹاف ہیڈ کوارٹر اور سلطنت کے دیگر حصص کے مابین آمدورفت کے ذرائع منقطع کر دیے ہیں، جنھوں نے بلا وجہ معقول خدا پرست حکام کو علیحدہ کر کے "خرانذکر" کے بجائے اپنے پیروؤں کو مقرر کر دیا جو عاملان سلطنت کے احکام کی بجا آوری میں سدراہ ہو رہے ہیں، جنھوں نے دار الخلافت کو ملک کے دوسرے حصوں سے جدا کر کے خلیفہ کی شہرت پر دھبہ لگایا ہے، جنھوں نے جھوٹی جھوٹی باتیں مشتہر کر کے تنازعات پیدا کر دیے ہیں۔ اور جو باوجود اس کے کہ ان کے لیے منتشر ہونے کے احکام جاری کر دیے گئے ہیں اپنی کارروائیوں سے باز نہیں آتے۔ کیا جملہ مسلمانان سلطنت کا فرض نہیں ہے کہ وہ اس موقع پر خلیفہ وحید الدین کی مدد کریں۔"

اگر خلیفہ کے سپاہی ان کو چھوڑ کر جا میں گے تو کیا وہ نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی سزا کے مستوجب نہ ہوں گے۔ کیا خلیفہ کے وہ سپاہی جو ایسے باغیوں کو مار ڈالیں گے "غازی" اور وہ لوگ تو مر جائیں گے وہ "شہید" نہ ہوں گے۔ کیا وہ لوگ جو اپنے بادشاہ کے لڑنے کے حکم کی انجام دہی میں مانع ہوں گے اس سزا کے سزاوار نہ ہوں گے جو ایسے لوگوں کے واسطے شریعت میں تجویز کی گئی ہے۔ ان تمام سوالات کا جواب اثبات میں ہے۔

ان فتووں کو ذرا غور سے پڑھیے۔ اس سے مصطفیٰ کمال کی طاقت اور قسطنطنیہ کا اضطراب اور خلیفہ اور ان کے حامیوں

کی وطن دشمنی عیاں ہے۔

مصطفیٰ کمال کا تعلق بالشویک حکومت سے ہوگیا تھا۔ اس کو اکھاڑنے کے لیے شیخ الاسلام نے ایک تیسرا فتویٰ صادر کیا جو حسب ذیل ہے:۔

فتویٰ حجۃ الاسلام جناب شیخ الاسلام قسطنطنیہ

"وہ لوگ جن کے دست قدرت میں قوم اسلام کی قسمت ہے مسئلہ بالشوزم پر غور کر رہے ہیں ایسی صورت میں اسلام کا جو بنی نوع انسان کے ایک بڑے حصے کی رہنمائی کرتا ہے اور ان کے خیالات کا آئینہ ہے یہ فرض ہے کہ اپنے نقطۂ نظر کا مسلمانوں بلکہ ساری دنیا پر اظہار اور اعلان کر دیں۔ بالشوزم کے اصلی اور اساسی اصول خواہ کچھ بھی ہوں۔۔۔ مگر حقیقت امر یہ ہے کہ فعلاً و عملاً بنی نوع انسان معاشرت اور تمدن کے حق میں اور بندگان خدا کے ذاتی حقوق و ملکیت کے لیے مضر ہے۔ اور اس سبب نا ممکن ہے کہ بالشوزم کے اصول اور اسلام کے اصول کو مطابق و موافق بنایا جاسکے۔ ابتدائے ظہور اسلام سے آج تک جان و مال پر حملہ، چوری، قتل اور سب و شتم۔۔۔ پھر ان افعال قبیحہ کی اسلام نے ہمیشہ مذمت و تعزیر کی ہے اور ہماری کتب مقدسہ نے صرف ان جرائم قبیحہ کی مذمت کی ہے بلکہ ان کے لیے حدود شرعی یعنی سزا و تعزیر کے احکام مقرر کیے ہیں۔ مقتضائے اسلام ترقی عام امن و امان اور فلاح نوع انسانیت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام قتل اور غضب کی ممانعت کرتا ہے اور نہایت تاکید کے ساتھ افراد اور اقوام کے حقوق ملکیت کی تامین کرتا ہے۔ چنانچہ شریعت کا حکم ہے کہ ہر شخص کو اپنی ملکیت پر پورا پورا تصرف کا حق ہے۔ اور حین حیات ہبہ کر سکتا ہے یا مرنے کے بعد وصیت کر سکتا ہے۔ اسلام اسراف کو جائز نہیں سمجھتا اور مسرف کو اپنی دولت لٹانے سے باز رکھنے کے لیے اس کے حقوق کی حق تلفی۔ ہو۔ یہ قرار دیتا ہے کہ اس کی دولت کا کچھ حصہ اقربا اور کچھ حصہ فقرا پر تقسیم ہو۔ مختصر یہ کہ اسلام اس کا مقتضی ہے کہ اس کی تمام قوت و شوکت بالشوزم کے خلاف صرف کی جائے جو مذہب، انصاف اور حقوق افراد کے لیے ایک خطرہ ہے۔"

مصطفیٰ کمال کی پوزیشن اناطولیہ میں اچانک کمزور کر دی اور اناطولیہ کے عوام مذہب کے شکار ہونے لگے مگر قدرت اس مرد آہن کی مدد کرنے پر آمادہ تھی۔ چنانچہ 20 مئی 1920ء کو آخری صلحنامہ ترک

کے بارے میں شائع ہو گیا جس پر صاحب خلیفۃ المسلمین توفیق پاشا نے اسی دن دستخط کر دیے۔ ایک ہولناک واقعہ تھا۔ مصطفیٰ کمال نے فوراً اپنا وار کیا۔ اس نے انگورہ کی قومی اسمبلی میں ایک گرجدار تقریر کے دوران داماد فرید پاشا کو ان تمام مصائب کا ذمہ دار قرار دیا اور یہ تجویز پاس کرا دی کہ داماد فرید پاشا غدار ہے اب کل اناطولیہ میں یہی نعرہ گونج گیا کہ "داماد فرید پاشا مردہ باد" عوام کی آنکھیں کھل گئیں۔ لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ ایسے ذلیل صلح نامہ پر خلیفہ خود دستخط نہیں کر سکتا۔ یہ سب داماد فرید پاشا کی شرارت اور وطن فروشی ہے۔ اور مصطفیٰ کمال بلا اتفاق ترکوں کا لیڈر قرار پا گیا۔ معاہدہ سیورے کی اشاعت اور اس پر قسطنطنیہ کا دستخط کر دینا ایک عظیم الشان ناقوس ثابت ہوا۔ معاہدہ سیورے کی شرائط ایسی سخت تھیں کہ انھیں دیکھ کر سلطان وحید الدین خان کا چہرہ بھی زرد پڑ گیا تھا لیکن سلطان نے صرف اپنی غرض مد نظر رکھی۔ وہ سوچتا رہا کہ کیا کرے۔ ایک طرف اس کا ضمیر تھا جو اسے اس معاہدے کے پرزے پرزے کر دینے پر اکسا رہا تھا۔ دوسری جانب اس کے سامنے یہ چمکدار خیال تھا کہ وہ خلیفۃ المسلمین کے خطاب کے ساتھ ایک معقول پنشن اور زر کثیر کے ساتھ راحت و آرام کی زندگی گزار سکے گا۔ آخر کار نفس ضمیر پر غالب آ گیا اور وحید الدین نے ترکی کے محضر قتل پر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔

اب اناطولیہ کے ترکوں پر صاف واضح ہو گیا کہ دول متحدہ کے ارادے ترکی کے بارے میں کیا ہیں اور خلیفہ کی کیا پوزیشن ہے اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب ان کی مدد صرف ان کا اتحاد اور ان کی تلواریں کر سکتی ہیں۔ اناطولیہ اپنی بقا کے لیے خاک و خون میں ملنے پر تیار ہو گیا اور مصطفیٰ کمال ان کی امیدوں کا آخری آماجگاہ تھا۔

یونان کا حملہ

20 مئی 1920ء کو معاہدہ سیورے پر دستخط ہوئے تھے اور جون 1920ء میں بولون کانفرنس میں اتحادیوں نے یہ تجویز منظور کی کہ ترکان احرار اناطولیہ کی تحریک کو دبانے کے لیے یونان کو مجاز کیا جائے چنانچہ 24 جون 1920ء کو یونانیوں نے اناطولیہ پر حملہ کر دیا۔ ترکان احرار نے ان کا مقابلہ کیا لیکن یونانی کامیاب ہوتے گئے۔ ہندوستان میں رائٹر اور ٹائمز کے حوالے سے ترکان احرار کی شکست کی خبریں شائع ہوتی رہیں اور مسلمانوں کے غم و غصہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ مسجدوں میں نمازیوں کی کثرت ہو گئی۔ دعائیں ہونے لگیں۔ نماز مغرب میں دعائے قنوت پڑھی جانے لگی اور حکومت برطانیہ کو ان تمام حرکتوں کا ذمہ دار قرار دے کر تحریک ترک موالات میں تیزی کر دی گئی۔ افغانستان، مصر، افریقہ اور تمام دنیا کے مسلمانوں نے صدائے احتجاج بلند کرنا شروع کی لیکن اصل بات یہ ہے کہ مصطفیٰ کمال یونانی جیش سے کہیں بھی فیصلہ کن جنگ لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کی لائن لمبی ہو جائے اور وہ اپنے وطن سے دور آ جائیں تب ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔

وہ صرف یونانی فوجوں کو مشغول رکھنا تھا اور مدافعانہ پالیسی اختیار کر لیا تھا۔

اس درمیان میں اٹلی اور فرانس کا رویہ بدل گیا۔ معاہدہ سیورے میں وہ ترمیم چاہتے تھے۔ یہ مصطفی کمال کے پروپیگنڈہ مشنری کی کامیابی تھی۔ وہ تمام ممالک سے تعلق سے قائم کیے ہوئے تھا۔ 28 نومبر کو لندن میں وزیر اعظم فرانس اور وزیر خارجہ اٹلی اور مسٹر لائڈ جارج نے مشرق کی نئی صورت حال پر غور کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کی اور یہ طے کیا کہ معاہدہ سیورے میں ترمیم کی جائے۔ لیکن یونان کی ضد کی وجہ سے یہ کانفرنس ملتوی کر دی گئی۔ اس درمیان میں قسطنطین یونان کا بادشاہ ہو گیا تھا۔ اور اتحادیوں کی مرضی کے خلاف ایتھنز پہنچ گیا۔ اس نے فوراً پھر جنگ چھیڑنے کا ارادہ کیا۔ اس درمیانی وقفہ میں یونانی فوجیں جہاں قبضہ کر چکی تھیں قبضہ کیے پڑی رہیں اور مصطفی کمال اپنی تیاریوں میں مشغول رہا۔ قسطنطین نے اوائل جنوری 1921ء میں زبردست حملہ شروع کیا۔ مصطفی کمال نے اب مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا اور اونونو کے مقام پر تین دن اور تین رات جنگ ہوتی رہی اور آخر میں تلواروں اور سنگینوں کی بھی نوبت آئی۔ انجام کار یونانیوں کو شکست ہوئی۔ اس پہلی فتح پر اناطولیہ میں خوشی کی دوڑ گئی اور دول متحدہ کو اضطراب لاحق ہو گیا۔ اسی جنگ کی یادگار کے سبب عصمت پاشا اونونو کہلاتا ہے۔ کیونکہ وہی اس جنگ کا ہیرو تھا۔

22 جنوری 1921ء کو پیرس کانفرنس اس غرض سے منعقد ہوئی کہ معاہدہ سیورے میں ترمیم کی جائے اور دوسرا بڑا معاملہ یہ ہوا کہ پیرس کانفرنس نے یہ طے کیا کہ لندن میں دوسری کانفرنس کی جائے جس میں حکومت انقرہ کے بھی نمائندے طلب کیے جائیں۔ یہ ایک عظیم الشان کامیابی تھی۔ 21 فروری 1921ء کو لندن کی دوسری کانفرنس منعقد ہوئی جس میں معاہدہ سیورے میں کافی ترمیم کر دی گئی۔ لیکن یہ ترمیمات کافی در ترکان احرار کے لیے نا قابل قبول تھیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ جواب دیں یونان نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا۔

یونان کا دوسرا حملہ

یونان نے بڑی تیاری سے دوسرا حملہ شروع کر دیا۔ یہ حملہ انقرہ پر قبضہ کرنے کے ارادے سے کیا گیا تھا۔ ترک پیچھے ہٹتے گئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ یونانی ترکوں کے مورچے کے قریب آجائیں۔ نتیجہ جب ایسا ہوا تو انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یونانیوں کو زبردست شکست ہوئی۔ یہ معرکہ 27 مارچ 1921ء سے 31 مارچ 1921ء تک جاری رہا۔ شب و روز لڑائی ہوتی رہی۔ ایک یورپین اخبار نے لکھا کہ یونانی پسپائی کے وقت اتنا تیز دوڑے کہ ترک ان کے تعاقب سے عاجز آگئے۔ اس جنگ کے حالات فوزی پاشا نے ایک تقریر میں واضح کیے اور ہر چہار جانب سے مبارک باد اور مسرت کی صدائیں بلند ہوئیں۔

یونان کا تیسرا حملہ

8 جون 1921ء کو یونانی زبردست جمعیت اور تیاری کے ساتھ تیسرے حملے کے لیے روانہ ہوئے۔ انھوں نے ابتدا میں یونانیوں کو کامیابی ہوئی۔ لیکن 23 اگست 1921ء کو مصطفیٰ کمال نے اپنے فیصلہ کن جنگ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی پوری طاقت سے وار کیا۔ یہ لڑائی تیرہ دن بڑی خونریزی سے جاری رہی اور آخر کار ترکوں نے یونانیوں کو شکست فاش دے کر بالکل پیچھے دھکیل دیا۔ اس کے بعد ہی مصطفیٰ کمال نے مجلس ملی میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"حضرت باری تعالیٰ نے مجلس ملی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے سامنے یونانی افواج کو بری طرح شکست نصیب ہوئی اور جب تک ہمارے مطالبات پورے طور پر حاصل نہ ہو جائیں اور دنیا ہمارے تمام حقوق کا اعتراف نہ کرلے ہمارے ہاتھ اسلحہ سے علیحدہ نہ ہوں گے۔"

مصطفیٰ کمال نے اس کے بعد خاموشی اختیار کرلی اور چھ ماہ تک خاموش رہا۔ اس درمیان میں دریائے سقاریہ کے اس پار یونانی فوجیں ڈٹی ہوئی تھیں اور دوسری طرف ترکان احرار کی فوجیں پڑی تھیں۔ مصطفیٰ کمال نے تمام ممالک میں اپنے وفود روانہ کیے۔ مصطفیٰ کمال نے مجلس ملی کی تقریر میں یہ بھی کہا تھا کہ۔

"ہم جنگ کے شیدائی نہیں ہیں۔ ہم صلح و امن کے خواہشمند ہیں۔ ہم نے اپنا حق حاصل کرنے کے لیے تمام پرامن ذرائع و وسائل اختیار کیے لیکن دنیا ہماری طرف سے بے معنی دھمکیوں کے ساتھ ہماری تنگ ہمتی کا مظاہرہ کرتی رہی اور ہمارے ساتھ غیر مہذب قبائل کا سا سلوک کرتی رہی اب تمام دنیا کو آگاہ رہنا چاہیے کہ ترکی کے باشندے اس کی حکومت اور مجلس ملی عظمیٰ اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتے اور جب تک تمام مہذب قوموں کی طرح ان کی حریت اور آزادی کا احترام نہ کیا جائے اس وقت تک وہ اپنا اسلحہ اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑیں گے۔ ہمارا قطعی فیصلہ دنیا پر ثابت و منکشف ہو جائے۔ ہم روس کے دوست ہیں صرف اس لیے کہ اس نے ہمارے حقوق کا اعتراف و احترام کیا۔ روس نے سب سے پہلے انگورہ کی حکومت کو تسلیم کیا تھا اور ہم ہمیشہ اس کے دوست رہیں گے کیونکہ ہمیں آج بھی اس پر اعتماد ہے۔ وہ آئندہ بھی رہے گا۔ اور جب اتحادی حکومتوں نے بھی ہماری قومی آزادی کو اعتراف کرلیا تو ہم ان کی طرف بھی ہاتھ بڑھانے اور مصالحہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

یہ آواز تمام دنیا کے دارالسلطنتوں میں گونجی اور سارے عالم کو اچنبھے میں ڈال دیا۔ خاک سے اٹھا کر مصطفیٰ

کمال نے ایک قوم کو زندگی بخش دی تھی، اور ایک پارلیمنٹ اور ایک حکومت کی تعمیر کر دی تھی جس کی عمر اگرچہ ابھی دو ایک سال تھی مگر وہ پختہ کار معلوم ہوتی تھی۔

ترکی کے وفود جہاں جہاں گئے اپنے ملک کا مطالبہ پیش کیا اور کہا کہ ترک اپنے مطالبات سے کسی مقام سے دستبردار نہیں ہوں گے اور میثاق ملی سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہٹیں گے حتیٰ کہ اناطولیہ کا آخری جانباز سپاہی لڑتا لڑتا شہید ہو جائے۔

وفد جب لندن پہنچا اور مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ سے ملاقات کی تو لائڈ جارج کے دریافت کرنے پر بالکل مطالبہ دہرایا اور مسٹر لائڈ جارج نے پوچھا دلیل کیا ہے؟ وفد نے کہا کہ دلیل کچھ نہیں، ہماری قوم اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ لائڈ جارج نے کہا کہ ابھی ہندوستان کا وفد آیا تھا اس نے بہت سی دلیلیں دی تھیں آپ کوئی دلیل نہیں دیتے اور مطالبہ کر رہے ہیں۔ وفد نے کہا کہ ہماری دلیل یہ ہے کہ ہماری قوم اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ لائڈ جارج یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ میری میٹنگ کا وقت ہو رہا ہے وقت ضائع ہو رہا ہے۔ وفد نے وہاں سے نکل کر ایک خط مصطفیٰ کمال کو کوڈ ورڈز میں تار دیا ATTACK "حملہ کرو"۔ اس کا نتیجہ ملی کے وفد سے پہلے ہی معلوم ہو گیا کہ غلاموں کی عرضداشت اور ایک جانباز مرد مجاہد کی للکار میں کتنا فرق ہوتا ہے۔

ترکی وفد کے نتائج

مصطفیٰ کمال جس طرح میدان جنگ میں کامیاب ہو رہا تھا اسی طرح سیاست میں بھی کامیاب تھا۔ روس کو اس نے پہلے ہی ہموار کر لیا تھا اور اب اکتوبر 1921ء میں ترکوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس سے ترکی اور فرانس کے درمیان حالت جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ کیلیکیا ترکوں کے حوالے کر دیا گیا۔

اٹلی سے بھی ایک معاہدہ ہوا جس میں اٹلی نے وعدہ کیا کہ وہ ترکی کے مقبوضہ علاقوں کی واپسی میں مدد کرے گا۔ اس طرح برطانیہ کے سوا کوئی بھی یونانیوں کا طرفدار باقی نہ رہا۔ لیکن برطانیہ کی طرفداری معمولی بات نہ تھی۔ اس وقت برطانیہ دنیا کے تمام ممالک کا لیڈر تھا۔

مصطفیٰ کمال نے روس سے تعلقات قائم کر کے لینن سے برقی پیغامات کا تبادلہ کر کے اور روسی وفد کو انگورہ بلا کر اور ایک مستحکم محاذ قائم کر کے وسط ایشیا کی تمام جمہوریتوں سے تعلقات قائم کر لیے۔ اسی طرح یوکرین سے معاہدہ کیا۔ قفقاز سے بھی دوستانہ معاہدہ ہوا۔ قفقاز 65 چھوٹے شہروں پر مشتمل ایک ملک ہے جس میں مسلمان 67 لاکھ روسی 40 لاکھ گرجی 20 لاکھ ارمنی 10 لاکھ یہودی وغیرہ 5 لاکھ

ہیں۔ قفقاز میں اس وقت پانچ جمہوری حکومتیں تھیں (۱) جمہوریہ جبل (۲) جمہوریہ آذربائیجان (۳) جمہوریہ داغستان (اسلامی) (۴) جمہوریہ گرجستان اور (۵) جمہوریہ ارمستان۔ جمہوریہ جبیلی کا پایہ تخت ارماویر۔ آذربائیجان کا بارکو۔ داغستان کا تیمر خاں شورا۔ گرجستان کا طفلس اور ارمنستان کا ایروان تھا۔ جمہوریہ جبیلی کے علاوہ بقیہ تمام حکومتوں کی آزادی روس تسلیم کر چکا تھا۔ قفقازیوں کا ایک بااثر وفد جس میں کریمیا باشگرش تاتار اور کرغیز کے وسط ایشیائی نمائندے بھی شامل تھے انگورہ آیا اور عہد دوستی کیا گیا۔ اسی طرح بخارا اور نیوا ایران یوکرین وغیرہ سے تعلقات استوار کیے اور سب نے حکومت انگورہ کو تسلیم کر لیا۔ اور یہ سب اس کی دوستی اور امداد کا نتیجہ تھا۔

مصطفیٰ کمال کے روشن کارنامہ کا اثر نمایاں ہو رہا تھا ایک تو اس نے پوری قوم کو متحد کر کے ایک آزاد جمہوری حکومت بنائی تھی۔ دوسرے یونان کو میدان جنگ میں شکست دیا تھا۔ انگریز یہ دوسرے ارکین روس متحدہ کا دخیرہ بنا تھا وہ دولت کلیتاً نظرانداز نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے کانفرنسیں منعقد ہو رہی تھیں پیرس کانفرنس ۲۲ مارچ ۱۹۲۲ء کو منعقد ہوئی جس میں انگورہ کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس ۲۶ مارچ کو ختم ہوئی اور اس میں معاہدہ سیورے کی کچھ ترمیم کی گئی مگر اس کانفرنس کا کوئی نام نہیں ہوا کیونکہ یونان ناطولیہ خالی کرنے پر راضی نہ ہو سکا جو ترکوں کی ابتدائی شرط تھی۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۲۲ء میں دوسری کانفرنس تلی کی تجویز زیر صدر قدس ہونے والی تھی کہ ترکان احرار کی خارا شگاف تلواروں نے کل مسئلہ حل کر دیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ یونان نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھا۔ اس نے اعلان کیا کہ عنقریب شاہ یونان کی تاجپوشی ایا صوفیہ کے گرجا میں بازنطینی شاہ کی حیثیت سے ہوگی اور قوم سے کہا جا رہا تھا کہ سلسلہ شاہنشاہان بازنطینیہ کا بارھواں تاجدار عنقریب قسطنطین اعظم کے پایہ تخت قسطنطنیہ میں داخل ہونے والا ہے۔ ادھر یہ زبانی لن ترانیاں جاری تھیں ادھر مصطفیٰ کمال کے لیے آخری ضرب لگانے کا وقت آ گیا تھا۔ اس کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ برطانیہ کے پاس کتنے سے ایسے آدمی ہیں جو ان لوگوں کے دوست بن جاتے ہیں جن کو وہ مٹانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اسی قسم کے کچھ دوست دل میں یہ ارادہ لے کر اندازہ کریں کہ مصطفیٰ کمال کی طاقت کتنی ہے۔ انگورہ گئے اور دوستی کے پردہ میں سب کچھ دیکھا اور آ کر رپورٹ کر دیا کہ مصطفیٰ کمال کی طاقت بہت ہی نحیف ہے اور اس میں یونانیوں کو نکال باہر کرنے کا دم نہیں ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا جیسا کہ بعد کو اخباروں اور بیانات میں کھلم کھلا تسلیم کیا گیا کہ مصطفیٰ کمال نے اپنی فوجوں کو پہاڑوں کے ایسے دامنوں میں چھپا رکھا تھا جہاں یہ مجبان ترکی ملے ہوائی جہاز سے بھی نہ دیکھ سکے۔

21 اگست 1922ء کو مصطفیٰ کمال نے اپنا بھرپور حملہ شروع کیا۔ ورچشم زدن میں افیون قرہ حصار کے میدان میں سرلئے کوئی اور طاقچہ پر قبضہ کر لیا۔ 23 اگست 1922ء کو اسد کے میدان میں بھی جنگ ہوئی اور 26 اگست کو افیون قرہ حصار پر حملہ بول دیا۔ اس کی کمان خود مصطفیٰ کمال کر رہا تھا۔ یہاں کا قلعہ ناقابل تسخیر مانا جاتا تھا مگر ترکی توپوں نے اس کے پرخچے اڑا دیے اور 27 اگست 1922ء کو بعد ظہر ترکی فوجیں افیون قرہ حصار میں داخل ہو گئیں اور یونانی فوجیں سب مال و اسباب و سامان رسد و اسلحہ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ دوسری فوجیں جو دیمراد عسکی شہر تک پھیلی ہوئی تھیں وہاں جمع ہو گئیں۔ دیار بکر، عسکی شہر اور افیون قرہ حصار اس طرح واقع ہیں کہ ایک دوسرے کے درمیان 40، 40 یا 45، 45 میل کا فاصلہ ہے۔ مصطفیٰ کمال نے تینوں پر یکبارگی حملہ کیا تھا اور فوجیں تینوں کو توڑ کر نکل گئی تھیں اور ایک مقام پر جمع ہوئیں۔ مصطفیٰ کمال گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں اس گھوڑے پر سجدہ کیا اور افواج کے سامنے حسب ذیل تقریر کی۔

"سپاہیو! تم نے وطن کی مدافعت اور آزادی کا ایک اور کارنامہ انجام دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت نے تمہارا ساتھ دیا ہے۔ لیکن سپاہیو ابھی کام باقی ہے۔ جب میرا گھوڑا ساحل سمندر کے کنارے کھڑا ہو۔ ایک طرف سمندر ہو اور دوسری طرف میرا ملک۔ یونانی یا تو سمندر میں غرق کر دیے گئے ہوں یا قتل کر دیے گئے ہوں اور ایک بھی یونانی سرزمین اناطولیہ پر نہ ہو تب تمہارا کام پورا ہوگا۔"

اس جنگ میں تقریباً بیس ہزار یونانی قتل اور اکیس ہزار اسیر ہوئے۔ سات سو میدانی توپیں دو ہزار مشین گنیں گیارہ طیارے اور 950 موٹریں 36 کفاری مال غنیمت ملا۔ مصطفیٰ کمال کی ایک تقریر میں ہے کہ دشمن کا خسارہ ایک لاکھ آدمیوں سے زیادہ ہے۔ اور ترکوں کا دس ہزار سے تجاوز نہیں ہوا اور ان میں بھی تین چوتھائی مجروحین ہیں۔

اسی زمانہ کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک جگہ 44 یونانی جرنل بیٹھ کر مشورہ کر رہے تھے کہ مصطفیٰ کمال نے گھیر کر سب کو گرفتار کر لیا اور اخبارات نے یونان کا خوب خوب مذاق اڑایا۔

اس کے بعد مصطفیٰ کمال 28 اگست کو التون طاش اور دومیلو کار پر حملہ آور ہوا 30 اگست سے یکم ستمبر کے درمیان عشاق دومیلو کار اور التون طاش کی مثلث اور عشاق کدوس اور کوتاہیہ کے مثلث پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد عام ہلّہ بول دیا اور 9 ستمبر کو ترک سواروں کا ایک دستہ کپتان فوزی بک کے زیر قیادت سمرنا میں داخل ہوا اور لفٹننٹ نور الدین پاشا سمرنا کے گورنر مقرر ہوئے۔ 14 ستمبر کو مصطفیٰ کمال خود ایک

پرجلال جمعیت اور اپنے جیش کی معیت میں بصد شان وشوکت وشادمانی ومسرت سمرنا آئے۔ معرکۂ عشاق میں یونانی جنرل ترکیو بھی ترکوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا اور 9 ستمبر کو دوسرے مقامات فتح کرتے ہوئے ترکی فوجیں بحر ایجین پہنچ گئیں۔ اب مصطفیٰ کمال کا خواب پورا ہوا۔ ایک طرف سمندر اور دوسری طرف ان کا ملک تھا اور یونانی جنوبی اناطولیہ سے غائب ہو چکے تھے۔

جہاں جہاں ترکان احرار اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ فاتحانہ داخل ہوئے خواہ وہ افیون قرہ حصار ہو یا اسکی شہر یا سمرنا یا کوئی اور جگہ کے باشندے نے اپنے آنسوؤں کے سیلاب سے ان کا استقبال کیا۔ بعد ازاں شمالی اناطولیہ سے یونانیوں کا اخراج درست۔ یہ قطعہ معمولی کام تھے جو جلد انجام پا گئے۔

فرانس سے جنگ

فرانس سے بھی ترکی افواج کو ہر جگہ لڑنا پڑا اور وہ ہر جگہ غالب رہیں۔ آخر کار فروری 1921ء میں جب بکر سامی بک وزیر خارجہ انگورہ لندن کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے جا رہا تھا تو وہ راستہ میں پیرس ٹھہرا اور وہاں فرانسیسی مدبرین سے ملاقات ہوئی اور وہیں صلح کی بنیاد رکھ دی گئی۔ 30 ستمبر 1921ء کو موسیو فرنکلن بولون انگورہ پہنچا اور وہاں مکمل صلح فرانس کے ساتھ ہو گئی اور 20 اکتوبر 1921ء کو اس پر فریقین کے دستخط ہو گئے۔ اس معاہدہ کی رو سے علاقہ اطنہ ترکوں کو واپس مل گیا اور 29 نومبر 1921ء کو ترکی افواج دارالسلطنت میں داخل ہو گئیں اور یکم دسمبر 1921ء کو ترکوں نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

لوزان کانفرنس

جس زمانہ میں یہ سب ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی میں روزنامہ زمیندار لاہور کا ایڈیٹر تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب تک مصطفیٰ کمال نے دریائے سقاریہ پر فیصلہ کن جنگ کر کے یونانیوں کو دریا کے اس پار دھکیل نہیں دیا تھا، انگریز اس کو ڈاکو کے نام سے نوازتے تھے لیکن جیسے ہی سقاریہ کے جنگ میں فتح حاصل ہوئی فوراً انگریز کا رخ بدل گیا اور وہ "بہادر سپاہی" کے نام سے مصطفیٰ کمال پکارا جانے لگا۔ انگریزوں نے اب صلح کا جال پھیلایا اور اس میں اس کو گرفتار کرنا چاہا۔ غرض یہ تھی کہ اناطولیہ ترکی اور یونان میں تقسیم ہو جائے۔ میں نے اس وقت زمیندار میں ایک مقالہ افتتاحیہ "سازش گاہ صلح" کے عنوان سے لکھا تھا جس پر علامہ اقبال نے میرے بعض اور دیگر مضامین کی طرح بنظر تحسین مجھے چائے کی دعوت دی اور مضمون کی تعریف کی۔ نوجوانوں کی ہمت بڑھانا علامہ اقبال کا خاص رویہ تھا۔

مصطفیٰ کمال صلح سے گریز کرنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ برابری اور باعزت صلح پر آمادگی ظاہر کرتا رہا تھا۔ وہ تمام دنیا کو مخاطب کر کے بار بار کہتا تھا کہ ہم امن چاہتے ہیں لیکن اپنے وطن کی مدافعت کے لیے جب تک کہ ہمارے اوپر حملہ جاری ہے ہمارا ہاتھ تلوار کے قبضہ پر رہے گا۔ غرض مصطفیٰ کمال بتاتے ہوئے تھا کہ میثاق ملی کے مطالبات جب تک پورے نہ ہو جائیں وہ جنگ بند نہیں کرے گا۔

اب جبکہ ترکی اور یونانیوں کو شکست دے کر بھگا چکا تھا اور اس نے اتحادی بادشاہوں سے صلح کر لی تھی۔ سمرنا کی فتح کے بعد جنگ بندی تو باقی رہ گئے تھے مگر برطانیہ خود بھی جلد ہی ... آگئے اور اناطولیہ سے یونانیوں کا مکمل اخراج ہو گیا اور جو لوگ سمرنا پر قبضہ ... دیکھ رہے تھے ان کے دلوں میں ترکوں کے ... ہوگا۔

سمرنا جب فتح ہوا تو وہ آخری جنگ تھی جو یونانیوں کے خلاف لڑی گئی۔ یونانی تمام شہر کو آگ لگا کر ... یونانیوں نے وحشت کے جو مظالم کیے تھے مصطفیٰ کمال نے اس شہر میں داخل ہونے کے بعد سب کو ... اور عام معافی کا اعلان کر دیا۔ سمرنا کے مظلوم باشندے ... اور اپنے بچوں کو دیکھ کر خوشی کے آنسو بہاتے تھے۔

اب مصطفیٰ کمال برطانیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے لیے تیار تھا۔ فرانس سے جو معاہدہ ترکی نے کیا اور جس طرح اٹلی نے اپنے مقبوضات واپس کر دیے وہ برطانیہ کے لیے ایک عظیم دھچکا تھا اور برطانیہ نے فرانس کے معاہدے پر اپنے سخت غصے کا اظہار کیا۔ مصطفیٰ کمال نے میدان سیاست و تدبر میں جو فتح حاصل کی تھی وہ اسی طرح عظیم الشان تھی جس طرح اس کی فتح میدان جنگ میں تھی۔

معاہدہ سیورے میں ترمیم

اب وقت آ گیا تھا کہ بدنام زمانہ معاہدہ سیورے کی دھجیاں کمال پاشا کی نوک شمشیر سے فضائے آسمانی میں اڑتی ہوئی نظر آئیں۔ چنانچہ اس میں ترمیم کے لیے لوزان میں صلح کانفرنس 20 نومبر 1922ء کو منعقد ہوئی۔ 20 نومبر 1922ء سے 4 فروری 1923ء تک مختلف مباحث سامنے آئے۔ ترکوں کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ انگریز موصل سے نکل جائیں۔ برطانیہ کی طرف سے لارڈ کرزن اور ترکی کی جانب سے عصمت پاشا بات چیت کرنے والے تھے۔ لارڈ کرزن مشہور استعمار پسند اور مغرور انسان تھا۔ وہ ہندوستان میں بھی وائسرائے رہ چکا تھا اور اس کی بد دماغی کا عام چرچا تھا۔ رعونت میں سرشار لارڈ کرزن نے ترکوں کو یہ محسوس کرانا چاہا کہ اب صلح میں ترکی کو اگر کچھ دیا جائے گا تو وہ محض احسان ہوگا۔ اس کو عصمت پاشا نے ... ترکان

حضرت کے آہنی دل و دماغ کا اب بھی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ عصمت بہت بہرا تھا۔ اس کا ایک مختصر نویس کل تقریریں لکھا کرتا تھا جو نائپ ہو کر اس کے سامنے رکھ دی جاتی تھیں تب وہ سمجھتا تھا کہ کیا کہا جا رہا ہے لیکن وہ کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ بہرا ہے۔ چنانچہ تقریروں کے دوران وہ برابر مسکرایا کرتا تھا۔ تمام دنیا کے اخباروں کے نمائندے لوزان میں جمع تھے۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ عصمت کی مسکراہٹ بڑی الجھن میں ڈالنے والی ہے۔ مذاکرات [illegible] آیا تھا۔ وہ معاہدہ کے مسودے میں کچھ لفظی ترمیم کرنا چاہتا تھا لیکن ترکوں کو جو بات سے خارج کر دینے پر مصر تھا۔ چنانچہ برطانیہ نے جو شرائط پیش کیے ان کو عصمت نے کلیتاً نامنظور کر دیا۔

4 فروری 1922ء کو کانفرنس کی گفت و شنید منقطع ہو گئی اور باہمی تبادلہ خیال جو تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھنے والے زیادہ باتیں نہیں بناتے۔ مذاکرات کا وقت بے نتیجہ بحثوں میں گزر گیا۔ آخر کار لارڈ کرزن نے [illegible] کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ہے چنانچہ انھوں نے عصمت پاشا کو ایک نہایت مغرورانہ اور احساس برتری سے بھرا خط لکھا جس میں درج تھا کہ "میں حکومت برطانیہ کا وزیر خارجہ ہوں۔ میرے پاس وقت نہیں ہے میں نے CONTINENTAL MAIL کانٹی نینٹل میل دو گھنٹے کے لیے روک لی ہے۔ اس دو گھنٹے کے اندر جو تجاویز پیش کی گئی ہیں منظور کی جائیں ورنہ ترکی کی قسمت پر مہر لگ جائے گی۔" اس کا جواب عصمت پاشا [illegible] دیا جو لارڈ کرزن کے لیے قطعی غیر متوقع رہا ہو گا۔

"میں نہ صرف حکومت عالیہ ترکیہ کا وزیر خارجہ ہوں بلکہ اس کی افواج کا سپہ سالار اعظم بھی ہوں میں محاذ جنگ پر جا رہا ہوں اور مجھے فرصت نہیں ہے۔ البتہ میں نے اپنے ایک کلرک کو یہاں چھوڑ دیا ہے تاکہ اگر آپ کوئی مکتوب روانہ کریں تو وہ ہمارے پاس انگورہ پہنچ جائے۔"

عصمت پاشا اس طرح ترکی کی شان خودداری و خوداعتمادی کا پرچم بلند کر کے 20 فروری 1923ء کو انگورہ چلا گیا۔ وہاں پہنچنے پر برطانیہ کی جانب سے پھر گفت و شنید جاری کرنے کی تحریک ہوئی اور مجلس ملیہ عظمیٰ نے حکومت کو اجازت دی کہ وہ گفت و شنید کو مکمل کرے۔ چنانچہ 5 اپریل 1923ء کو دوسری کانفرنس مدعو ہوئی — 23 اپریل 1923ء سے کانفرنس کا افتتاح ہوا اور 16 جولائی 1923ء کو عہد نامہ صلح مکمل طور پر طے ہو گیا۔ اور 24 جولائی 1923ء کو معاہدہ صلح پر دستخط ہو گئے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ اب قسطنطنیہ کی حکومت نابید ہو چکی تھی۔ جو کچھ بات چیت ہوئی تھی صرف حکومت انگورہ سے ہوئی تھی جسے روس نے اولاً اور بعدہٗ تقریباً تمام ممالک نے تسلیم کر لیا۔ صلح نامہ لوزان کے ابتدائی و تمہیدی فقرے حسب ذیل تھے۔

"سلطنت برطانیہ، روس، اٹلی، جاپان، یونان، رومانیہ، سرب، کروٹ اور سلووینیا جنگ عظیم کے درمیان ان قوموں کی ایک طرف سلطنت عثمانیہ کی حکومت ایک طرف اور سلطنت ترکی دوسری طرف سے اس امر پر متحد ہوگئی ہیں کہ ۱۹۱۴ء سے جو جنگ جاری ہے اس کا اب خاتمہ کر دیا جائے۔ ان حکومتوں کی خواہش ہے کہ آپس میں خوشگوار تجارتی تعلقات بحال کیے جائیں کیونکہ ان حکومتوں اور قوموں کا مفاد ان ہی تعلقات پر منحصر ہے۔ ان حکومتوں نے اس امر پر بھی اتفاق کیا کہ مذکورہ بالا تعلقات کی بنیاد باہمی اعتراف آزادی پر قائم ہوں جیسے مذکورہ حکومت ہائے بالا نے حسب ذیل معاہدہ پر اتفاق کیا۔"

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس صلح نامہ میں روس اور امریکہ شریک نہیں تھے۔ روس کے شریک نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ زار کا تختہ الٹا جا چکا تھا اور کمیونسٹ روس کو روس متحدہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔ امریکہ درمیان سے جنگ کی گندگی سے باہر ہو کر الگ ہو گیا تھا۔ اس صلح نامہ کی رو سے ترکی کو مسلمانوں کی نظر میں کامل مرتبہ حاصل ہو گئیں ترکوں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے کافی تدبیر اور دور اندیشی کا اظہار کیا اور اس میں ایسی علامت نہیں کی جس سے جو ناممکن الحصول ہو۔

تحریکِ خلافت کا فتح ترکی پر اثر

برطانیہ نے اگرچہ دردانیال اور جزیروں کی بندرگاہوں اور مقامات میں کچھ مداخلت نہیں رکھا لیکن علانیہ فوجی امداد نہیں دی اس کے حسب ذیل وجوہ تھے۔

1. جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد دول متحدہ کے اراکین میں ایسا اختلاف آراء پیدا ہو گیا تھا۔ اور مصطفیٰ کمال نے اپنے تدبر کا ایسا جال بچھا رکھا تھا کہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ دوبارہ کوئی اور جنگ یورپ پر مسلط ہو جائے اور برطانیہ کسی حالت میں اپنی قوم کو ایک دوسری جنگ میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا

2. روس نے جو رویہ اختیار کیا تھا وہ اس خطرے میں عظیم اضافہ تھا۔ بالشویزم ملک بالطبع حاصل ممالک سے کر آندھی اور طوفان کی طرح اٹھا تھا اور وہ نظریہ نو آبادی نظریے سے براہ راست متصادم تھا۔ بالشویک روس زار کی امپیریل پالیسی کو الٹ کر ہر ملک میں انقلاب لانا چاہتے تھے اور انگریز اس تحریک سے بہت زیادہ خائف تھا کیونکہ اس سے اس کے وجود پر کاری ضرب لگتی تھی۔

-

3. تیسری سب سے بڑی وجہ ہندوستان کی صورت حال تھی۔ پورا ملک انگریز کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اب تک مسلمان سب سے بڑے پشت پناہ رہے تھے اور علی گڑھ تحریک انگریز کے لیے ایک نعمت ثابت ہوئی تھی لیکن گاندھی جی کی قیادت میں سارا اسلامی ہندوستان وحدت کی بازی لگائے ہوئے تھا اور گاندھی جی اپنی تمام تقریروں میں "خلافت" کو مرکزی حیثیت قرار دیتے تھے۔ گاندھی جی کہتے تھے کہ خلافت مسلمانوں کا مذہبی معاملہ ہے اور اس میں انگریزوں نے مداخلت بے جا کی ہے اور ہمارے بھائی مسلمان آزردہ ہیں تو ہم کیسے مطمئن رہ سکتے ہیں۔ اس لیے ہندوستان میں "تحریک خلافت" بہانے کے طور پر ہندو مسلم اتحاد کے مظاہر جیل خانوں کو پُر کرنے کی تمنا اور گولی کھانے کی آرزو سے ہندو مسلم اتحاد اور مسلمانوں کے اس متفقہ فیصلے نے سامراج کو بچانے کی شکل صرف یہ ہے کہ ہندوستان سے انگریزوں کو نکال کر اس کی طاقت توڑ دی جائے۔ ان سب نے ترکان آل عثمان کی بڑی سے بڑی مدد کی۔ مسلمانوں نے سوچا کہ اگر ہندوستان کو انگریز کے چنگل سے بہرحال آزاد کرایا جائے تو دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ ادھر دوسری طرف بھی مسلمانوں کے ان جرأت مندانہ اقدامات سے برطانیہ کے مستقبل کے منتظم خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔ چنانچہ لارڈ نارتھ کلف جس کو جرنلزم کے میدان کا صاحب زبان گردانا جاتا تھا اور جو ہندوستان سے خاص لگاؤ رکھتا تھا اس نے لائیڈ جارج کی مسلم کش پالیسی کے خلاف زبردست محاذ بنایا۔ اس کے خیالات لارڈ لائیڈ جارج کے خلاف آگ اگلتے تھے اور اس کا خیال تھا کہ لائیڈ جارج کی پالیسی برطانیہ کی نوآبادی طاقت کو تہس نہس کر دے گی۔ چنانچہ اس نے خود بلاد اسلامیہ و مشرق کے ممالک کا دورہ کیا۔ اپنے دورے کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب جہاں میں گیا مسلمانوں کو مضطرب اور بے چین پایا۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ میں نے دیکھا کہ گھٹنے ٹیکتے جاتے اور سجدے کرتے ہوئے مسلمان بغاوت کی آگ سے کھیل رہے ہیں۔ اور سب سے دلچسپ بات یہ لکھی کہ حد ہو گئی کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے گاندھی کیپ پہننی شروع کر دی ہے۔ لارڈ نارتھ کلف کے خیال میں یہ گاندھی کیپ ایک طرف بغاوت اور انگریز دشمنی اور دوسری جانب ہندو مسلم اتحاد کا نشان تھی۔ اس نے آگاہی دی کہ یہ سر فروش حکومت برطانیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔

4. ایک چیز اور انگریز کے راستے میں رکاوٹ بن گئی۔ دول متحدہ کانفرنس میں انگریز کا اثر نمایاں تھا اور انگریز کی سازش سے یونانی سمرنا میں اترے تھے اس لیے ان کے اعمال و افعال کی ذمہ داری برطانیہ پر عائد ہوتی تھی۔ یونانیوں نے سمرنا اور اناطولیہ میں لرزہ خیز مظالم کیے۔ قتل، غارت گری، آتش زنی

اور عورتوں کی عصمت دری کے واقعات اس کثرت سے ہوئے کہ یورپ کا ضمیر تھرا اٹھا۔ بہت سے فرنگی اخبار نویسوں اور دانشوروں نے چشم دید حالات لکھے جو بڑے ہی وحشیانہ تھے۔ حتیٰ کہ غدار برطانیہ خلیفہ وحید الدین کی حکومت بھی احتجاج کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ مہذب دنیا نے ان ہولناکیوں کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس لیے جب انگورہ گورنمنٹ نے قوم عام کے سامنے اعداد و شمار پیش کیے تو مجبوراً دول متحدہ کو ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنا پڑا۔ اس تحقیقاتی کمیشن نے کھلی کارروائی کی ورشہادتیں لیں۔ شہادت کا ایک نمونہ یہ تھا کہ نوجوان ناطولیہ کا باشندہ بندوق کندھے پر لٹکائے آیا اور بندوق ایک کنارے رکھ کر کمیشن سے یوں گویا ہوا۔

"ہم دس پندرہ نوجوان کھنڈرے تھے۔ ملک ورانا طولیہ میں کیا ہو رہا تھا ہمیں کوئی خبر نہ تھی۔ ہم پہاڑوں پر گھومتے شکار کرتے اور خوشیاں مناتے تھے۔ ایک دن جو میں واپس لوٹا تو دیکھا کہ میرا سارا گاؤں جل رہا ہے اور ایک طرف عورتیں جمع ہو کر رو رہی ہیں۔ میں وہاں گیا تو میری چچا زاد بہن نے اپنی شال میرے منہ پر ماری اور کہا کہ جا بے غیرت چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ۔ میں نے پوچھا یونانیوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا۔ اس نے کہا ہم سے مت پوچھو کہ ہمارے ساتھ کیا کیا گیا۔ مگر ایک لمبے دانتوں والا یونانی تمہیں ملے تو اس کو زندہ نہ چھوڑنا۔ اسی وقت ہم سب نے ایک جگہ بیٹھ کر قسم کھائی اور بندوقیں لے کر نکل گئے۔ ہم جبتی آگ میں کودے بہتے دریا میں تیرے، یونانی فوجوں میں گھسے افسوس کہ وہ لمبے دانت والا یونانی مجھے نہیں ملا۔ اگر وہ ملتا تو گو ہزار جان رکھتا ہوتا تو ایک سلامت نہیں لے جا سکتا تھا۔"

ان ہولناک اور وحشیانہ واقعات نے یونان کا چہرہ مہذب دنیا میں سیاہ کر دیا اور ترک اپنے وطن کی مشکل حالت میں مدافعت کرنے پر تمام عالم کی ہمدردی کے قدرتاً مستحق ہو گئے۔ کوئی پروپیگنڈا کمال پاشا کے خلاف کارگر نہ ہوتا تھا۔ ایک عریاں حقیقت سامنے تھی۔ برطانیہ جو تہذیب کا اپنے کو علمبردار محافظ اور پاسبان ظاہر کرتا تھا ان حالات میں علانیہ یونان کی مدد کرنے کی جرأت نہ کر سکا تھا۔ البتہ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اس نے مدد نہیں کی۔ انگریز فوجی افسران جنگی حرکتوں اور اسکیموں میں مدد کرنے کے لیے ہر وقت موجود رہتے تھے اور سامان اور اسلحہ بھی خاموشی سے فراہم کرتا تھا۔

ادھر ہندوستان شور و غل مچا رہا تھا کہ کل کارروائی انگریز کرا رہا ہے۔ اخباروں میں شور اٹھا کہ ایک انگریز جنرل ہیرنگٹن محاذ جنگ کے قریب دیکھا گیا ہے۔ عوام نے لعن طعن جلسے اور جلوس احتجاج

اور تجویز ملامت کی بھرمار کر دی۔ انگریز انکار کرتا رہا۔

پورا ہندوستان کمال پاشا کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ جدھر دیکھو ٹولیوں کی ٹولیاں گشت کر رہی ہیں اور کمال پاشا کی مدح و ثنا کے ترانے گا رہی ہیں جو اکثر شاعرانہ نکات سے عاری لیکن جوش اور جذبے سے بھرے ہوتے تھے مثلاً ؎

ہمارا غازی کمال پاشا کمال اپنا دکھا رہا ہے

کوئی یہ نہ سمجھے یہ نعرے صرف مسلمان لگاتے تھے ہندو نوجوان اور رضا کار و انٹیر سب برابر کے شریک تھے جس طرح کہ وہ اللہ اکبر کا نعرہ جوش و خروش سے لگانے میں ہم زبان تھے۔

بارھواں باب

تحریکِ خلافت کا دوسرا دور

حکومت بمبئی کا کمیونک اور مہاتما گاندھی کا دنداں شکن جواب

جس وقت کراچی کا مقدمہ مولانا محمد علی وغیرہ پر 19 اگست 1921ء کو چلایا گیا تو گاندھی جی نے ستمبر 1921ء میں مسلمانوں کے نام ایک پیغام میں کہا:

"ہم کو عدم تشدد پر پوری طرح عمل کرنا چاہیے لیکن بے بسی کے ساتھ نہیں۔ علی برادران نے جو فار مولا سپاہیوں کے فرض کے بارے میں بتلایا ہے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اور قید خانہ کی دعوت دینا چاہیے۔ ہم کو یہ نہ سوچنا چاہیے کہ ہمارے بہترین آدمیوں کے بغیر تحریک جاری نہیں رہ سکتی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم سوراج کے قابل نہیں ہیں اور نہ خلافت کے اور پنجاب کے ساتھ جو مظالم ہوئے ہیں ان کا مداوا کر سکتے ہیں:"

4 اکتوبر 1921ء کو گاندھی جی نے بمبئی میں لیڈروں کا ایک اجتماع کیا جس میں گورنمنٹ کے احکام کے خلاف ایک مینی فسٹو جاری کرنے کے لیے کہا۔ مینی فسٹو حسب ذیل ہے:۔

"بمبئی کی حکومت نے 15 ستمبر 1921ء کو جو کمیونک جاری کیا اور جس میں علی برادران وغیرہ پر مقدمہ چلانے کا حکم ہے اس کے متعلق ہم دستخط کنندگان اپنی انفرادی حیثیت سے یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہر شہری کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ بلا کسی رکاوٹ کے حکومت کی ملازمت میں خواہ وہ سول ہو یا ملٹری رہنے یا نہ رہنے کی بابت اپنی آزادرائے ظاہر کرے۔ ہم دستخط کنندگان اپنی یہ رائے ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ یہ بات ہر ہندوستانی کی قومی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ بحیثیت سویلین کے اور بطور ایک فوجی سپاہی کے ایک ایسے نظام حکومت کی نوکری کرے جس نے ہندوستان کو اقتصادی اخلاقی اور سیاسی

حیثیت سے قعر ذلت میں ڈال دیا ہے اور جس نے قومی مقاصد کے حصول کے اقدامات کو زبردستی کچلنے کے لیے پولیس اور فوج استعمال کی ہے۔ مثلاً رولٹ ایکٹ کے ایجی ٹیشن کے موقع پر اور جس نے فوج کے سپاہیوں کو عرب، مصر، ترکی اور دیگر ملک کی آزادی کو پامال کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ جنھوں نے ہندوستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ہماری رائے میں ہر ہندوستانی سیویلین اور سپاہی کا فرض ہے کہ وہ گورنمنٹ سے اپنا تعلق منقطع کرے اور اپنے گزر بسر کے لیے کوئی دوسرا روزگار تلاش کرے۔"

پچاس افراد نے اس مینی فسٹو پر دستخط کیے جن میں ممتاز حضرات حسب ذیل تھے:۔

گاندھی، ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، لالہ لاجپت رائے، موتی لال نہرو، مسز نائیڈو، عباس طیب جی، این سی کیلکر، وی جے پٹیل، ولبھ بھائی پٹیل، ایم آر جیکر، جواہر لال نہرو، گنگا دھر راؤ دیش پانڈے، عمر سوبانی، جمنالال بجاج، ایم ایس اینے، ڈاکٹر انصاری، خلیق الزماں، عبدالباری، سی راجگوپال آچاریہ، جئے رام لال ہرجی، راجندر پرشاد، حسرت موہانی، یعقوب حسن، ڈاکٹر مونجے اور جے رام داس دولت رام۔

• 5 اکتوبر 1921ء کو آل انڈیا نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اس مینی فسٹو کو پاس کیا اور اس کے ساتھ ہی ہزاروں پلیٹ فارموں سے لاکھوں آدمیوں نے اس کو دہرانا شروع کر دیا۔ حکومت اس جوابی حملہ سے حواس باختہ ہو گئی۔ وہ اس کل ہند آتش فشاں کے مقابلے کے لیے تیار نہ تھی۔

گاندھی جی نے ینگ انڈیا میں اور اپنی تقریروں میں اس مینی فسٹو کی وضاحت اور اپنے فلسفے کی تشریح زور و شور سے شروع کی۔ لمبے لمبے مضامین لکھے، مدلل تقریریں کیں۔ زندگی کے آخری زمانے میں تو گاندھی جی بہت مختصر گفتگو کیا کرتے تھے لیکن اس زمانہ میں جب ان کو اپنا فلسفہ سمجھانا تھا وہ طوالت سے گھبراتے نہ تھے۔ انھوں نے یہاں تک لکھا کہ "میری خاکساری میرے راستے حائل ہے ورنہ میں مکانوں کی چھتوں پر سے اعلان کر تا کہ ترک تعاون ترک تشدد اور سودیشی کا ایک ہی پیغام ہے جو میں ساری دنیا کو دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ "سوراج کے معنی ہیں موت کا خوف دور کر دینا۔ جو لوگ کہ روح کا وجود مانتے ہیں، اور کون ہندو عیسائی یا پارسی ہے جو نہیں مانتا، وہ جانتا ہے کہ روح لافانی ہے اس لیے ہم کو موت کا خوف نکال دینا چاہیے۔ اور اگر موت کا خوف نہیں ہے تو جیل خانہ کیا ہے کہ جس سے ڈرا جائے۔ ہم غلطی پر نہیں ہیں ہم کو جیل جانا، پھانسی کے تختہ پر لٹک جانا اس لیے منظور ہے کہ ہم گورنمنٹ کے ظالمانہ قوانین کی مخالفت کرتے ہیں۔"

علی برادران کی وحشیانہ سزایابی کے مقابلہ کا عزم آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ قوم نے اس کا بھرپور

جواب یہ دیا کہ 5 نومبر 1921ء کی آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے مہاتما گاندھی کے مینی فسٹو مورخہ 6 اکتوبر 1921ء کی دوبارہ توثیق کی اور تمام صوبوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی ذمہ داری پر سول نافرمانی کا آغاز کریں جس میں عدم ادائیگی ٹیکس کا پروگرام بھی شامل ہو۔ البتہ سول نافرمانی میں شرکت سے پہلے سودیشی پروگرام کی مکمل حمایت جس میں چرخہ کاتنا بھی شامل ہے اس کی تسلیم یقینی ہوگی اور حلف لینا ہوگا کہ وہ عدم تشدد پر پوری طرح عمل کریں گے جو شخص سول نافرمانی میں حصہ لے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد پر کامل عقیدہ رکھتا ہو اور چھوت چھات کو دور کرے۔ یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ جو کوئی بھی تحریک میں آئے گا اس کو یا اس کے خاندان کو مالی امداد نہیں دی جائے گی۔ ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ جب گاندھی جی نے یہ پروگرام بنایا تو کچھ لوگوں نے یہ شبہ ظاہر کیا کہ رضا کاروں کے خاندان کے لوگ بھوکوں مر جائیں گے گاندھی جی نے جواب دیا مر جانے دو۔ لیکن فوراً مسکرا کر کہا کہ کوئی بھوکوں نہیں مرے گا اور وہی ہوا۔ بھلا عوام ان جانبازان وطن کو بھوکوں مرنے دیتے ؟

بردولی میں سول نافرمانی

اسی کے ساتھ ہی گاندھی جی نے یہ حکم دیا کہ ابھی کوئی بھی سول نافرمانی کا آغاز نہ کرے وہ خود بردولی میں سول نافرمانی کی قیادت کریں گے اسے لوگ دیکھیں اور پھر اسی نمونہ پر سارے ہندوستان میں سول نافرمانی شروع ہو۔ بردولی صوبہ گجرات کے ضلع سورت کا ایک تعلقہ ہے۔ ملک کے لیڈروں سے انھوں نے کہا کہ میں کسی سے کوئی مدد سوائے اس کے نہیں مانگتا کہ میری کوششوں سے لوگ ہمدردی رکھیں اور چوکنے رہیں کہ ان کے صوبوں میں کہیں تشدد رونما نہ ہو۔ اگر دوسرے صوبوں میں امن قائم رہا تو مجھے کوئی خوف نہیں اور ہماری کوششوں کے سر پر کامیابی کا تاج لازماً رکھا جائے گا۔"

گاندھی جی نے سول نافرمانی کا انحصار عدم تشدد پر ہونے کی دلیلیں بھی برابر قوم اور کانگریس کے سامنے پیش کیں۔ ورکنگ کمیٹی کے سامنے سول نافرمانی کا ریزولیوشن پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا:۔

"عام سول نافرمانی ایک بھونچال کی طرح ہے جہاں سول نافرمانی کا راج قائم ہو جاتا ہے وہاں حکومت معطل ہو جاتی ہے۔ وہاں ہر پولیس کے سپاہی، ہر فوج کے سپاہی، ہر گورنمنٹ کے افسر کے لیے مجبوری ہو جاتی ہے کہ یا تو وہاں سے بھاگ جائے یا سوراج کا سپاہی بن جائے۔ پولیس اسٹیشن اور تمام گورنمنٹ کے دفاتر وغیرہ حکومت کی ملکیت سے خارج ہو کر عوام کے قبضہ تصرف اور چارج میں آجائیں گے۔ لیکن ان سب باتوں کے لیے ایک بنیادی اور لازمی شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ عوام ادنیٰ ترین مظاہرہ یا تشدد کا استعمال نہ کریں۔ نافرمانی اتنی مکمل ہونی چاہیے کہ اگر حکومت کہے کہ دا ہنے جاؤ تو بلا توقف و بلا تامل

اور بلا کسی ہچکچاہٹ کے ہم کو فوراً بائیں جانب چل دینا چاہیے۔ حکومت کی مخالفت اگرچہ عزم بالجزم کے ساتھ ہونی چاہیے۔ لیکن یہ سب پورے اطمینان و سکون سے انجام پانا چاہیے۔ البتہ یہی نافرمانی بجائے پرامن ہونے کے اگر بطور اظہار تہوّر و شجاعت یا غرور یا ازراہ تضحیک یا غصہ یا اشتعال یا انتقامی جذبہ سے ہوئی تو یہی نافرمانی سول کے بجائے حقیقتاً دواقعتاً "کرمنل (مجرمانہ) ہو جائے گی۔ اس طرح ہر شخص سول نافرمانی کی تحریک میں شرکت کے قابل نہیں ہے۔" تقریر کے آخر میں گاندھی جی نے کہا کہ "جب بردولی پر سوراج کا جھنڈا لہرایا جائے گا تو قریب کے اضلاع بھی یہی کریں گے۔ اسی طرح ضلع بہ ضلع تمام ہندوستان میں سوراج کا جھنڈا بلند ہوگا۔ لیکن بہر حال جب تک یہ تحریک جاری ہے اگر ملک کے کسی حصہ میں ذرا بھی تشدد کا مظاہرہ ہوا تو تحریک کو جاری رکھنا قرین مصلحت نہ ہوگا۔ تمام ملک کو ایک آواز ہو جانا چاہیے اور اتحاد و یکسانیت مکمل ہونا چاہیے اس لیے اگر ملک کے اندر کسی حصہ میں تشدد ظاہر ہوا تو افتراق اسی طرح پیدا ہو جائے گا جس طرح ایک تار کے بگڑنے سے باجے کی آواز میں فرق ہو جاتا ہے۔"

چند روز کے بعد وہ بمبئی کے راستہ سے بردولی کی جانب روانہ ہوئے۔ تمام ملک سانس روکے ہوئے تھا۔ گاندھی جی نے ایک سال کے اندر سوراج دلانے کا جو وعدہ کیا تھا اس کی ابتدا ہونے جا رہی تھی۔

پرنس آف ویلز کی آمد

اہل بمبئی کو گاندھی جی نے پیغام دیتے ہوئے کہا کہ میں عنقریب بردولی میں سول نافرمانی کا آغاز کرنے جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں فوج بلائی گئی ہے گولیاں برسائی جائیں گی لیکن بہرحال بادا میں بردولی جا رہا ہوں۔ بمبئی کے لوگوں سے میں صرف یہ درخواست کرتا ہوں کہ بردولی میں جو کچھ بھی ہو وہ پرامن اور خاموش رہیں۔

17 نومبر 1921ء کو تاج برطانیہ کے ولیعہد شہزادہ پرنس آف ویلز بمبئی کے ساحل پر جہاز سے اترنے والے تھے۔ حکومت نے معزز مہمان کے استقبال کے لیے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ مگر کانگریس، خلافت کمیٹی اور گاندھی جی نے پرنس کے استقبال کے بائیکاٹ کا پیغام دیا۔ گاندھی جی اس دن احمد آباد سے بمبئی آ گئے تھے۔ اور انھوں نے چوپاٹی کے میدان میں ایک عام جلسہ کا اعلان کیا اور تمام قوم کو پکارا کہ کوئی بھی پرنس کے استقبال کے لیے نہ جائے بلکہ ہمارے جلسہ میں لوگ آئیں۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ پرنس جب جہاز سے اترے تو مکمل سناٹا تھا اور پورے شہر بمبئی میں مکمل ہڑتال تھی۔ اس سے بہتر مظاہرہ عوام کی بے اطمینانی اور بغاوت کا اور کیا پیش کیا جا سکتا تھا جبکہ گاندھی کے جلسہ میں لاکھوں آدمی جمع ہوئے۔ لیکن عدم تشدد پر قائم عمل پیرا

دن دہ سکی اور بمبئی اور مضافات میں بلوہ ہوگیا۔ گاندھی جی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ انھی کی جے بول کر پارسیوں اور سرکاری افسران کی موٹریں جلادی گئیں، سرکاری ٹرامیں توڑ ڈالی گئیں، پارسی عورتوں کی ساڑیاں کھول کر انھیں ننگا کر دیا گیا اور ان ساڑیوں کی ہولی منائی گئی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ان واقعات پر پردہ ڈال دیتا لیکن گاندھی جی نے جن کا بنیادی اصول ہی سچائی تھا سب باتیں من وعن تسلیم کریں اور اپنے بیان میں انتہائی رنج وغم کا اظہار کیا۔ انتہائی یاس کی حالت میں وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کن امیدوں سے وہ چلے تھے اور اب کیا ہوگیا۔ گاندھی جی کو یہ یقین ہوگیا کہ اس کے پیچھے کوئی خاص دماغ کام کر رہا ہے اور سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت ماہرانہ انداز میں یہ بلوے کرائے گئے ہیں تاکہ تحریک کے بادبان سے ہوا نکل جائے۔ یہ انقلاب فرانس کے وقت سے انگریزی آزمودہ تکنیک تھی۔ اس لیے گاندھی جی کا شبہ بے جا نہ تھا۔

وہ ایک بجے رات تک اسی غم والم میں جاگتے رہے اور رات ہی میں انھوں نے سورت اور بردولی جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ دوسرے دن پارسی اینگلو انڈین اور یہودی کافی مسلح ہوکر مجنونانہ جوش میں نکلے۔ وہ انتقام کے لیے بے چین تھے۔ کانگریس کے لیڈر لوگوں کو امن وسکون پر آمادہ کرنے کی شہر میں مسلسل کوشش میں لگے تھے لیکن حملہ اور جوابی حملہ، پتہ نہیں تھا کہ معاملہ کہاں جا کر ختم ہوتا۔

گاندھی جی سوچتے تھے کہ میں کیا کروں، مظلومین کو میں گورنمنٹ کی امداد لینے کے لیے کہہ نہیں سکتا اور اگر میں اپنے آپ کو پارسیوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کیے جانے کے لیے پیش کر دوں تو اور بھی خونریزی ہوگی بہت کچھ غم انگیز سوچ بچار کے بعد ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ برت رکھیں۔ انھوں نے کہا کہ میرے لیے صرف ایک راستہ ہے کہ میں خدا کے سامنے حاضر ہوکر مزید طاقت طلب کروں تاکہ اس کا کام کر سکوں اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب میں اپنے کو اس کے سامنے ایک ذرہ ناچیز کی حیثیت سے پیش کروں اور وہ کھانا کھانے سے اپنے کو روک دوں جو اس نے ہم کو دیا ہے۔ اس طرح یا تو وہ مجھ کو طاقت دے گا یا موت دے کر اپنے یہاں بلالے گا تاکہ مجھے نئے سرے سے تعمیر کرے۔ اس طرح گاندھی جی نے ایک طویل بیان سے اپنے برت کا اعلان کیا جس میں انھوں نے ظاہر کیا کہ خدا سچائی اور محبت کا خدا ہے۔ میں کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ میں انگریزوں سے بھی نفرت نہیں کرتا۔ میں تو اس نظام حکومت کے خلاف اٹھا ہوں جو ناجائز ہے۔ ہندو مسلم اتحاد میرا ایمان ہے اور جب تک ہندو اور مسلمان پارسیوں سے حقیقی معذرت نہ کریں میں ان کی آنکھ سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔ آخر میں انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کیا۔

"میں اپنے مسلمان بھائیوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں خدمت کی تحریک میں اسے ایک مقدس معاملہ سمجھ کر شریک ہوا ہوں۔ میں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے جدوجہد کی کیونکہ ہندوستان اس کے بغیر

زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر ہم ایک دوسرے کو دشمن سمجھیں تو خدا سے انکار ہوگا۔ میں نے اپنے آپ کو علی برادران کی گود میں ڈال دیا ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ سچے اور خداترس لوگ ہیں۔ میرا یقین ہے کہ گزشتہ دو دن کے بلوؤں میں مسلمانوں نے بیش از بیش حصہ لیا ہے۔ اس سے مجھ کو سخت صدمہ ہوا ہے میں مسلمان کارکن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی پوری طاقت سے کھڑا ہو اور اس کے مذہب نے جو فرض اس پر عائد کیا ہے اس کا احساس کرے اور محنت کر کے اس فساد کو ختم کرے۔"

19 نومبر 1921ء کو گاندھی جی نے دیوی داس اپنے لڑکے کو بمبئی واپس بلا لیا اور کہا کہ دیوی داس ایک خاص غرض کے لیے بلایا گیا ہے۔ وہ غرض یہ تھی کہ اگر قریب کے اضلاع میں پھر تشدد کا اظہار ہوا تو دیوی داس کو بلوائیوں کے ہاتھوں قربان ہونے کے لیے بھیجا جائے گا۔ اس درمیان میں گاندھی جی کو کارکن گھیرے رہتے تھے اور پوچھتے تھے کہ ہم کیا کریں کیسے یہ جھگڑے ختم ہوں۔ گاندھی جی جواباً کہتے تھے کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ البتہ فاقہ کرنے سے میں انتہائی اندرونی سکون و طمانیت محسوس کر رہا ہوں۔ اس برت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ گاندھی جی نے یہ طے کیا کہ جب تک سوراج حاصل نہ ہو جائے وہ ہر دو شنبہ کو 24 گھنٹے کا فاقہ کریں گے۔ ان کے نزدیک یہ تزکیہ نفس کا ایک ذریعہ تھا اور روحانی طاقت سے ہی ان کے نزدیک کامیابی ممکن تھی۔

22 نومبر 1921ء کو گاندھی جی کا برت رنگ لایا۔ اراکین و ہمدردان تحریک موالات اور اس کے مخالفین ہندو مسلمان پارسی سب متحد و متفق ہو کر جمع ہوئے اور اتحاد اور اتفاق قائم ہوا تب گاندھی جی نے برت توڑا۔

23 نومبر 1921ء کو بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور گاندھی جی کی تحریک پر بر دولی کی سول نافرمانی غیر معین مدت کے لیے ملتوی ہوگئی۔

حکومت کا رویہ اور تحریک میں نیا خون

بمبئی میں شہزادہ ویلز کی مکمل بائیکاٹ اور ہڑتال نے حکومت کے اراکین میں سخت غصہ پیدا کر دیا اینگلو انڈین طبقے نے وائسرائے پر کارروائی کرنے کے لیے زور ڈالا اور مختلف جبری احکام پورے ہندوستان میں جاری کیے گئے۔ 19 نومبر 1921ء کو بنگال کی گورنمنٹ نے کانگریس اور خلافت کی تمام والنٹیر تنظیموں کو خلاف قانون قرار دیا اور سیاسی جلسوں کو دبانے کا حکم صادر کر دیا۔ پنجاب صوبہ متحدہ بہار اور آسام نے تقلید کی اور اسی طرح کے احکام جاری کیے۔ اس چیلنج کا دل کھول کر مقابلہ کیا گیا اور ان احکام کی مکمل خلاف ورزی بلا کسی تامل و تردد کے اور بغیر کسی پریشانی کے کی گئی۔ یو۔پی جبر و تشدد میں سب سے آگے نکل گیا۔

الہ آباد میں صوبائی کانگریس کمیٹی کے 55 ممبران کو جو ایک ہنگامی جلسہ میں والنٹیروں کے بارے میں ایک تجویز پر بحث کر رہے تھے بیک وقت گرفتار کر لیا۔ مسٹر سی آر داس جو کانگریس سیشن احمد آباد کے صدر منتخب ہوئے تھے دسمبر میں گرفتار ہوئے۔ مختار لیڈران مثلاً لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو تمام ملک میں گرفتار کیے گئے۔

ہزاروں والنٹیر بھی گرفتار ہوئے لیکن ان کی جگہ لینے کے لیے ہزاروں دوسرے لوگ رضاکارانہ بھرتی ہو گئے۔ دھارا پلٹ گیا اور تحریک میں پھر قوت پیدا ہو گئی اور جو معمولی اضمحلال بمبئی میں آیا تھا وہ دور ہو گیا جہاں جہاں پرنس آف ویلز گئے مکمل ہڑتال نے ان کا استقبال کیا۔ جبریہ توہین کا ایک خاص منشا یہ تھا کہ پرنس آف ویلز کا دورہ امن و سکون سے ختم ہو مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

گورنمنٹ عدم تشدد کا جواب جبر و تشدد سے دے رہی تھی حتیٰ کہ کھدر کا لباس اور گاندھی ٹوپی حکام کے لیے سخت کوفت کا باعث تھی اور جو استعمال کرتا تھا اس کی توہین و تذلیل کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا تھا اور جھوٹے مقدمات چلائے جاتے تھے۔ پولیس محض تفریحاً یا مذاقاً والنٹیروں کے کپڑے اتروا لیتی تھی کبھی ان کو تالاب میں ڈبوتی نکالتی تھی۔ اس کے علاوہ قومی تعلیم گاہوں کے ریکارڈ جلا دیے جاتے تھے مکانات پھونکے گئے۔ کانگریس اور خلافت کے دفتروں کے سامان برباد کرڈالے گئے۔ فصلیں جلائی گئیں۔ مال و اسباب لوٹا گیا حتیٰ کہ ایسے واقعات کی بھی اطلاع ملی کہ عورتوں کے زیورات چھین لیے گئے اور ان پر مجرمانہ حملہ کیا گیا۔

پنڈت مدن موہن مالویہ پر ان جابرانہ حرکات کا بہت اثر ہوا اور وہ وائسرائے سے ملے۔ وہ چاہتے تھے کہ گاندھی اور وائسرائے میں صلح ہو جائے۔ چونکہ وائسرائے کی یہ بڑی خواہش تھی کہ جب پرنس آف ویلز کلکتہ آئیں تو امن و سکون سے ان کا استقبال کیا جائے اس لیے وہ گاندھی جی سے صلح کی بات کرنے پر راضی ہو گئے لیکن 19 دسمبر 1921ء کو گاندھی جی نے پنڈت مالویہ کو حسب ذیل بہادرانہ اور ولولہ انگیز تار دیا۔

"آپ گورنمنٹ کی سختیوں کی مطلق کوئی پروا نہ کریں۔ اس وقت تک وائسرائے سے کانفرنس بیکار ہو گی جب تک کہ گورنمنٹ اپنے افعال پر ندامت کا اظہار کرے اور تین چیزوں کو طے کرنے پر تیار نہ ہو۔ یعنی پنجاب، خلافت اور سوراج۔"

مالویہ جی اس کے بعد سی آر داس اور مولانا آزاد سے پریسیڈنسی جیل کلکتہ میں ملے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر داس اور آزاد کو چند شرائط پر ہڑتال روکنے کے لیے راضی کر لیا جائے تو گاندھی جی کو بھی موافق کیا جا سکے گا لیکن گاندھی جی نے مالویہ جی کو ان کے تار کے جواب میں دوسرا تار دیا کہ شرائط پہلے طے ہونی چاہئیں۔ اور اول ضروری چیز یہ ہے کہ تمام قیدی جن میں کراچی کے قیدی بھی شامل ہیں رہا کر دیے جائیں اور کانفرنس کی تاریخ پہلے سے طے کی جائے۔

اگر یہ دونوں باتیں منظور ہوں تو ہڑتال کو رد کیا جا سکتا ہے۔ جب مالوی جی نے گاندھی جی کا تار وائسرائے کو دکھایا تو وہ بہت چراغ پا ہوئے لیکن پھر بھی بات چیت جاری رہی لیکن لارڈ ریڈنگ جو کھیل رہے تھے اسے گاندھی جی نے سمجھ لیا تھا اور آخر میں حسب ذیل تار دیا۔

"نہایت افسوس ہے کہ جو عہد آپ کرانا چاہتے ہیں اس سے میں معذور ہوں۔ ترک موالات کی تحریک اسی وقت رد کی جا سکتی ہے جب کانفرنس کا کوئی کامیاب نتیجہ نکلے اور میں کسی حالت میں کانگریس کا فیصلہ بدل نہیں سکتا۔"

اب انگریز کو معلوم ہوا ہوگا کہ کس دل و جگر اور کس دماغ کے آدمی سے ان کا مقابلہ ہے۔ اس طرح مالوی جی اور وائسرائے کی گفت و شنید ناکام ہو گئی۔

آنکھوں دیکھا حال

رضاکاروں کی تحریک کو دبانے کے لیے گورنمنٹ نے جو احکام جاری کیے ان کا کس جوش سے مقابلہ کیا گیا اس کی ایک مثال خود میرے علم میں ہے۔ میں ان دنوں اخبار "مدینہ بجنور" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں تھا اور کانگریس میں پرزور کام کر رہا تھا۔ میں یونیورسٹی اسکول آف لا الٰہ آباد سے ترک موالات کر کے آیا تھا اور کچھ دنوں کانپور حسرت موہانی صاحب کے ساتھ رہنے کے بعد بجنور "مدینہ" میں چلا گیا تھا۔ پورا ضلع کانگریس کا کام تھا۔ تقریباً روزانہ جلسے ہوتے تھے اور میں زیادہ تر جلسوں کی صدارت کرتا تھا اور تقریر تو روز ہی کرتا تھا۔ بہت سے ممتاز اشخاص اس وقت وہاں تھے جن میں سے بیشتر ابھی موجود ہیں۔ ہزاروں آدمی روزانہ جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ عورتوں نے جلوس نکالا اور ان میں سے چند گرفتار بھی ہوئیں۔ فضا میں آگ ہی آگ بھری تھی۔ ایک دن میں ایک جلسہ کی صدارت کر رہا تھا کہ ایک مقرر صاحب نے کہا کہ ایک انگریز یوپی کا خون پیتا ہوا پایا گیا ہے۔ یہ خبر غلط تھی لیکن مشہور ہو چکی تھی اور اس کی پر زور تردید بھی ہو گئی تھی۔ اب جو یہ بات پھر کہی گئی تو میں نے فوراً روک دیا اور مقرر کو بٹھا دیا۔ میں نے کہا کہ گاندھی جی کے اصول کے مطابق ہماری لڑائی انگریز سے نہیں بلکہ نظام حکومت سے ہے۔ بجنور کا سب انسپکٹر اس جلسہ میں موجود تھا۔ وہ میری اس کارروائی سے بہت خوش ہوا اور دوسرے دن آکر میری بڑی تعریف کی اور مجھ پر بھروسہ کرنے لگا اور مجھ سے برابر ملا کرتا تھا شاید بھید لینے کے لیے۔

جب والنٹیروں کا نظام خلاف قانون قرار دیا گیا تو وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ آپ کے پاس کتنے والنٹیر ہیں۔ میں نے کہا ہمارے پاس کوئی والنٹیر نہیں ہے اور اس کو یقین ہو گیا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ واقعی بھی اس وقت کچھ

اسی طرح کا تھا۔ کام کرنے والے تو بہت تھے مگر والنٹیر خصوصیت سے بنائے نہیں گئے تھے۔ اس کے جانے کے بعد ہم لوگ نکل پڑے اور خاموشی سے قریب 150 والنٹیر بنا دیے۔ یہ کانگریس اور خلافت کے مشترک والنٹیر تھے۔ یہ سمجھ کر کہ یہاں کوئی والنٹیر نہیں ہے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اعلان کرایا کہ کانگریس اور خلافت کا والنٹیر بنا خلاف قانون ہے۔ اور بننے پر گرفتاری کی دھمکی دی۔ جب یہ اعلان ہوا تو کئی ساتھی احمد آباد کانگریس کے لیے بجنور سے بذریعہ بس نجیب آباد میں گاڑی پکڑنے کے لیے جا چکے تھے۔ اس وقت بجنور میں ریل نہیں تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ ان کو روک لیا جائے اور اس چیلنج کا مقابلہ کر کے مرتب کیا جایا جائے چنانچہ میں فکر مند ہوا کہ کیسے نجیب آباد پہنچوں۔ ایک مسلمان ٹیکسی والا سر راہ مل گیا۔ میں نے کہا خلافت کی کچھ خدمت کرو گے۔ وہ فوراً بلا معاوضہ چلنے پر تیار ہو گیا اور ہم لوگ وہیں سے روانہ ہو گئے۔ نجیب آباد اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی نہیں آئی تھی ــــ ساتھیوں کو لادا اور رات ہی میں بجنور واپس آ گئے۔ میں بھی احمد آباد کانگریس سیشن میں یو پی کا ایک ڈیلیگیٹ تھا مگر ابھی کچھ دن باقی تھے۔ خیال یہ تھا کہ خوش قسمت جیل چلے جائیں گے۔ ان کے علاوہ جو بچ رہیں گے وہ احمد آباد روانہ ہو گئے۔ دوسرے دن صبح کا منظر عجیب تھا۔ ایک مسلمان والنٹیر اچھے تن و توش کا کمر میں رضا کار کی پٹی لگائے والنٹیروں کا سردار بنا اور ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ والنٹیروں نے پولیس اسٹیشن کے سامنے گانا شروع کیا۔

اے پولس والو ستانا ظلم کرنا چھوڑ دو   بھائیوں کے حلق پر خنجر چلانا چھوڑ دو

چار دن کی زندگی ہے چار دن کی چاندنی   چار دن کے واسطے چاندی رچانا چھوڑ دو

سب انسپکٹر ہڑ بڑا کر بستر سے اٹھا اور حیران ہو کر یہ نظارہ دیکھا۔ غم اور غصہ میں بار بار اپنا ہاتھ اپنے سر پر مارتا تھا اور چلاتا تھا کہ قاضی عدیل نے خوب دھوکا دیا۔ یہ گیارہ رضا کار گرفتار ہو کر جیل چلے گئے تو دوسرے گیارہ دفتر کانگریس سے روانہ کیے گئے۔ کل کارروائی کی نگرانی مرزا عبد اللطیف بیگ صدر ضلع کانگریس کمیٹی بذات خود کر رہے تھے۔ اب دوسرے اور تیسرے جتھے کے بعد سب انسپکٹر نے یہ کہنا شروع کیا کہ قاضی عدیل کہاں ہیں وہ کیوں نہیں آتے۔ میں نے سنا تو بے تاب ہو گیا اور فوراً والنٹیروں کے گروہ میں شریک ہونے کے لیے لپکا۔ مرزا عبد اللطیف بیگ نے مجھے پکڑ لیا اور کمرے میں بند کر دیا۔ میں بہت غصہ میں تھا اور دروازہ پیٹ رہا تھا۔ مرزا عبد اللطیف بیگ نے ایک اور جتھا روانہ کر کے مجھے کھولا اور کہا سکون سے باتیں کرلو۔ تحریک چلانے کا طریقہ یہ ہے کہ مضبوط آدمی پیچھے رکھے جاتے ہیں تاکہ تحریک کو تھامے رہیں۔ تم سب سے آخر میں جیل جاؤ گے۔ تم سے پہلے میں جاؤں گا۔ چنانچہ الغرض انھوں نے مجھے سمجھا بجھا لیا۔ تین دن حکومت کے چیلنج کا جواب دے کر ہم لوگ احمد آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ ان تینوں دنوں کے اندر سیکڑوں آدمیوں سے دفتر کانگریس کے باہر کا میدان ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ لوگ

نعرے لگاتے تھے۔ والنٹیروں کو ہار پہناتے تھے اور پولیس اسٹیشن تک لے جاتے تھے۔ ہر شخص والنٹیر بننے کے لیے تیار تھا۔

آگرہ صوبائی خلافت و کانگریس کانفرنس

اس سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۱ میں آگرہ کے مقام پر صوبائی خلافت کانفرنس زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد اور صوبائی کانگریس کانفرنس زیر صدارت مولانا حسرت موہانی منعقد ہو چکی تھی۔ اس کانفرنس میں اخبار مدینہ کے نمائندہ کی حیثیت سے میں بھی شریک تھا۔ مجھے مولانا آزاد کی تقریر کا پہلا جملہ اب تک یاد ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں نے آج یہاں آتے ہوئے دریائے جمنا میں اتنا پانی بھی نہیں دیکھا جتنا مسلمان کا خون گزشتہ دس سال میں بہہ چکا ہے۔" مولانا نے اپنی طویل تقریر میں سورۂ والعصر کی تفسیر بیان کی تھی۔ لب لباب یہ تھا کہ زمانہ اور تاریخ شاہد ہے کہ کسی کام کے کرنے کے لیے چار شرطیں ہیں اور جب وہ چاروں پوری ہوں تو کامیابی یقینی ہے ورنہ گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ وہ چار چیزیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جو کام کرنا ہو اس پر پورا یقین۔

(2) اس کام کو اسی طرح کرنا جس طرح کرنا چاہیے۔

(3) خود عمل کرنے کے بعد دوسروں کو دعوت دینا۔

(4) جب ایسا ہو اور مشکلات آئیں تو اس کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا۔

مولانا آزاد پر ایک مخصوص سی آئی ڈی انسپکٹر غلام حسین تعینات تھا۔ وہ یوپی میں سب سے بہتر اردو شارٹ ہینڈ جانتا تھا ایک سو بیس الفاظ ایک منٹ میں لکھ لیتا تھا وہ کھلم کھلا سب کے آگے بیٹھتا تھا اور تقریر لکھتا تھا۔ مولانا کبھی کبھی اپنی رفتار تیز کر کے ایک سو پچاس الفاظ ایک منٹ میں بولنے لگتے تھے تو وہ پنسل رکھ کر دونوں ہاتھ جوڑتا تھا۔ مولانا مسکرا دیتے تھے اور رفتار دھیمی کر دیتے تھے۔ مولانا کا ایک کیمپ علاحدہ تھا۔ غلام حسین کافی چاپلوس تھا۔ دوسرے دن صبح میں مولانا کے کیمپ میں گیا تو وہ بھی موجود تھا اور کہہ رہا تھا حضور میں لکھ نہیں پایا کیا جواب دوں گا۔ مولانا نے جہاں جہاں وہ کہتا گیا کہ سلسلہ ٹوٹ ٹوٹ گیا ہے پڑھ کر ادا کرا دیا۔ شجاعت اللہ خاں مینیجر اخبار "زمیندار" بھی وہاں آئے تھے۔ میں دراصل مدینہ سے مستعفی ہو چکا تھا یا ہونے والا تھا۔ شجاعت اللہ خاں سے طے ہو چکا تھا کہ احمد آباد کانگریس سے فارغ ہو کر میں سیدھا لاہور جا کر اخبار "زمیندار" کا بحیثیت چیف ایڈیٹر چارج لے لوں۔ کسی وقت مولانا فتح پور سیکری کار سے جانے والے تھے۔ شجاعت اللہ خاں نے کہا کہ آپ اکیلے ہیں میں بھی ساتھ چلا چلوں تو مولانا نے فرمایا "عزیز من تنہائی بذات خود ایک معیت ہے۔" شجاعت اللہ

تنہائی پسند تھے۔ یہ بھی کہتے تھے کہ قید تنہائی کو لوگ سزا کیوں کہتے ہیں۔ مولانا آزاد سبحانی صاحب نے بھی جلسہ خلافت میں بڑی معرکتہ الآرا تقریر کی تھی۔ ایک اور واقعہ شفاعت اللہ خاں نے مولانا آزاد کا بیان کیا۔ شفاعت اللہ خاں نے کہا کہ مولانا آپ نے فرمایا تھا کہ آپ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ مرتب کر رہے ہیں صرف قرآن پاک سے لکھنے والے ہیں تو اس کتاب کا کیا ہوا۔ مولانا نے فرمایا "عزیز من! وہ کتاب دماغ میں مرتب و مدون ہو کر مکمل ہو چکی ہے صرف کاغذ پر لے منتقل کرنا ہے۔" افسوس کہ اس انتقال مکانی کا انتظار ہی ہوتا رہا اور مولانا کا انتقال روحانی ہو گیا۔

کانگریس کی صوبائی کانفرنس بڑے دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ جواہر لال بھی آئے ہوئے تھے۔ مولانا حسرت موہانی کی آمد صبح کو تھی۔ میں ایک دن قبل چلا گیا تھا۔ صدر کانفرنس کے لیے ایک الگ کیمپ آراستہ کیا گیا تھا اور اسٹیشن پر استقبال اور وہاں سے جلوس کا زبردست انتظام تھا۔ ہار پھول کثرت سے مہیا تھے۔ سواریوں کا انتظام تھا۔ پبلک کو اطلاع دی گئی تھی اور یقین تھا کہ اسٹیشن پر ازدہام خلائق ہو گا۔ مگر سادہ دل سادگی پسند تکلف و تصنع سے لاپرواہ مولانا حسرت موہانی رات کو گیارہ بجے ٹرین سے آئے، ایک یکہ کرایہ کے کانفرنس پر پہنچے۔ ان کے ہاتھ میں ایک ٹین کا بکس تھا جو رسی سے بندھا ہوتا تھا۔ اس میں ایک تکیہ تھا ایک دری ایک جوڑا کپڑا ایک چھوٹا لوٹا پھٹے کپڑوں کو سلنے کے لیے سوئی تاگا جو ہر سفر میں ان کا رفیق تھا۔ وہ لگے اپنی نون غنہ کی آواز میں صدر مجلس استقبالیہ کو پکارنے۔ وہ بے چارہ سو رہا تھا۔ جاگا تو دیکھا کہ مولانا صدر کانفرنس ہاتھ میں ٹین کا بکس لیے کھڑے ہیں۔ دیکھتے ہی جل بھن گیا۔ مولانا نے کہا مجھے کہیں لیٹنے کی جگہ دو۔ اس نے کہا میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔ صدر کانفرنس کی آمد کل صبح ہے۔ مولانا نے ملائمت سے اسے سمجھایا اور اپنے کیمپ میں جائے۔ میں نے دوسرے دن مولانا سے کہا یہ آخر آپ وقت مقررہ سے قبل کیوں آ گئے۔ منتظمین بہت رنجیدہ ہیں۔ مولانا نے لاپرواہی سے سر ہلایا اور کہا کہ یہ کوئی بات نہیں۔ مولانا حسرت موہانی اپنا خطبۂ صدارت بانس کے کاغذ پر اردو میں چھپوا کر لائے تھے جس میں صرف اس بات پر دلیلیں پیش کی تھیں کہ ہندوستان میں مکمل آزادی بیرون حکومت برطانیہ ہونی چاہیے اور ڈومینین اسٹیٹس کی سخت مذمت کی تھی۔ بقیہ امور کے بارے میں انھوں نے کہا تھا کہ ان کی رائے میں کانفرنس کو طے کرنا چاہیے اور صدر کا یہ منصب نہیں ہے۔ آزادی کامل کے لیے مولانا حسرت کا موڈ دیوانگی تک پہنچا ہوا تھا۔ ایک شخص جو عرصہ تک جیل میں رہ کر آیا تھا انقلابی تھا اور کہتا تھا کہ اسے جیل میں پیشاب پلایا گیا اس نے چند بھونڈے سے اشعار لکھے تھے جو موزوں بھی نہیں تھے مگر جن کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ زیر سایہ برطانیہ رہنا چاہتے ہیں وہ گویا زیر سایۂ شیطان رہنے پر راضی ہیں۔ مولانا حسرت کا حال یہ تھا کہ اچھل اچھل کر ہر شعر پر داد دے رہے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ ہندوستان کا عظیم ترین شاعر ایسے بھونڈے اور غیر موزوں اشعار کی داد کیوں دیتا ہے۔ مدعا سے ہر جگہ لیے لیے پھرتے تھے اور مدح و ثنا کرتے تھے۔

دونوں جگہ کل لیڈران جاتے تھے۔ اژدہام خلائق کی کوئی حد نہ تھی۔ ہر ضلع سے نمائندے آئے تھے۔ مولانا حسرت موہانی کی رعایت سے مجھے بھی کانگریس کے اجلاس میں پانچ منٹ تقریر کا موقع مل گیا تھا۔

مولانا آزاد نے خلافت کانفرنس میں اپنی افتتاحی تقریر میں کہا:۔

"اٹھارہ مہینے کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اس اٹھارہ مہینہ کے اندر تحریک خلافت کی کتنی منزلیں ہیں جو ہمارے سامنے آئیں اور ہم طے کر چکے ہیں۔ میں اس وقت مسئلہ خلافت پر مقامات مقدسہ پر ہندوستان کی آزادی پر جو مسلمانوں کے لیے ویسا ہی فرض ہے جیسا تحفظ خلافت و روضہ گا۔ میں مناسب نہیں سمجھتا ہوں کہ ان مسائل پر کچھ عرض کروں۔ اس کے لیے آپ کے پاس خاموش گویائی موجود ہے جو آپ کے دلوں کو متوجہ کر سکتی ہے۔

میرٹھ میں خلافت کا جو جلسہ ہوا اس میں مہاتما گاندھی بھی شریک تھے۔ اس میرٹھ کے جلسے میں سب سے پہلے ترک موالات کا خلافت کمیٹی کی جانب سے بطور ایک عمل دفاع بطور ایک امر احتجاج کے اعلان کیا گیا۔ اٹھارہ مہینے گزر چکے اب ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم اپنے سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک نظر ڈالیں کہ اب تک ہم نے کتنا سفر طے کیا ہے۔

اس امر پر نظر ڈالتے ہوئے آپ کو یہ حقیقت اپنے سامنے لانا چاہیے کہ مقصد خلافت کی مدافعت کے لیے جو میدان تھا وہ کون سا تھا۔ کیا وہ میدان وہ تھا جو ہندوستان کے رقبے سے باہر تھا یا اس کے علاوہ دوسرا میدان بھی تھا۔ اس بارے میں فی الحقیقت دو میدان تھے۔ پہلا میدان جو آپ کی کامیابی کے لیے اولین قیام گاہ تھا وہ ہندوستان کے باہر کا میدان تھا۔ وہ عراق و شام کا ایشیائے کوچک و سمرنا کا تھا جہاں مسلمانوں کا خون بہہ چکا ہے۔ وہ میدان آپ کے ملک کا تھا اور اپنے ملک کی فتح و شکست کا تھا۔ جب تک آپ اسے فتح نہ کرتے دنیا کی کامیابی آپ کا استقبال نہ کر سکتی۔

"جب آپ کی تحریک محض اپنی زندگی کی ابتدائی گھڑیاں کاٹ رہی تھی جس وقت بے چارگی کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں زبانیں موجود تھیں جن پر خلافت کا نعرہ تھا لیکن کوئی متفقہ میدان عمل آپ کے سامنے نہ تھا وہ ابتدائی گھڑیاں آج تحریک خلافت پر گزر چکی ہیں۔ اللہ کے فضل و رحمت نے اپنا دروازہ کھول دیا اور چند مہینوں کے اندر ہم نے یہ میدان فتح کر لیا اور جب دنیا کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ یہ محدود جماعت کی تحریک نہیں بلکہ ہندوستان کا متفقہ مسئلہ ہے۔

تحریک کی دوسری منزل یہ تھی کہ خلافت کے مسئلے پر سات کروڑ دلوں میں گھر نہ بناتی بلکہ تیس کروڑ کے دلوں میں گھر بناتی۔ تحریک خلافت کی اس کامیابی میں خوبی یہ ہے کہ اس نے ایسے طاقتور

ہنگامے کے ساتھ کل ہندوستان کے مسئلہ کو زندہ کر دیا جو چالیس سال کی کوشش سے ہندوستان کو نہیں ملا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تحریک خلافت کے ساتھ ہندوستان کا مسئلہ پوری قوت سے زندہ ہو گیا ہے۔"

مولانا نے مہاتما گاندھی کی تحسین کی کہ ممدوح پہلے ہی دن سے تحریک خلافت کے سب سے بڑے رفیق رہے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے یہ سامان کر دیا کہ تحریک خلافت کی روشنی نے ہندوستان کے چراغ کو روشن کر دیا۔ یہ مسئلہ خلافت کی دوسری فتحمندی تھی جو اس کو ہندوستان کے میدان میں حاصل ہوئی۔

احمد آباد کانگریس 22 دسمبر 1921ء

دسمبر 1921ء کی آخری تاریخوں میں احمد آباد میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ سیشن منعقد ہوا۔ میں وہاں یو۔ پی کانگریس کے ایک ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک تھا۔ وہیں خلافت کانگریس بھی منعقد ہوئی۔ کانگریس نگر اور خلافت نگر بڑے وسیع پیمانہ پر بڑے وسیع میدان میں تعمیر کیے گئے تھے۔ کھلے اجلاس کے لیے بہت دور تک دونوں کے لیے شامیانے لگے تھے۔ پنڈال کے باہر ٹھہرنے کے انتظامات تھے۔ نمائش کا الگ کیمپ تھا۔ دو ہزار کھدر میں ملبوس والنٹیر جن میں لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی کام کر رہے تھے۔ یہ والنٹیر زیادہ تر گریجویٹ تھے۔ احمد آباد میں تعلیم بہت آگے جا چکی تھی۔ نمائش میں قریب چالیس ہزار آدمی آسکتے تھے۔ کانگریس سیشن کے صدر سی۔ آر۔ داس تھے مگر وہ گرفتار ہو چکے تھے۔ ان کی قائم مقامی حکیم محمد اجمل خاں نے کی۔ صدر مجلس استقبالیہ ولبھ بھائی پٹیل تھے۔ کس طرح کاروباری انداز میں یہ سیشن منعقد ہوا اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ولبھ بھائی پٹیل نے صرف پندرہ منٹ میں اپنا خطبۂ استقبالیہ پڑھا اور صدر کا خطبہ صرف بیس منٹ میں ختم ہو گیا۔

کھلا اجلاس جب نہیں ہوتا تھا تو باہر مختلف قسم کے جلسے ہوتے رہتے تھے۔ کہیں ایک ہزار کہیں دو ہزار آدمی جمع ہیں اور لیڈران قوم لیکچر دے رہے ہیں۔ اس زمانہ میں مولانا آزاد سبحانی گاندھی جی سے بہت قریب تھے اور وہ اکثر ان کے اصولوں کی مدافعت کیا کرتے تھے اور ان کے آشرم میں بھی رہ چکے ہیں۔

کانگریس نگر اور خلافت نگر دونوں میں باورچی خانے تھے۔ چائے اور ناشتہ کی بھی دوکانیں تھیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ میں ایک دوکان کے اندر چائے پینے گیا تو منیجر نے کہا کہ مسلمان کو ہم یہاں چائے وغیرہ نہیں دیتے ہیں۔ بس میں ابل پڑا۔ میں نے کہا کانگریس نگر میں تم مسلمان ہندو کا فرق کرتے ہو۔ میں جاتا ہوں ابھی گاندھی جی سے شکایت کرتا ہوں۔ بس وہ لگا میری خوشامد کرنے اور آخر کار بڑی خاطر داری سے مجھے

چائے پلائی۔

اجلاس میں ایک لاکھ سے زائد آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ گاندھی جی نے کانگریس پلیٹ فارم سے انگریزی میں بھی ایک نہایت پرجوش تقریر کی جس سے سب لوگوں کے دل گرما گئے۔

خلافت کانفرنس میں بھی گاندھی جی کی تقریر ہوئی۔ وہ ننگے بدن صرف آدھی ٹانگ کی دھوتی یا لنگوٹی پہنتے تھے۔ کانگریس پنڈال میں بہت تیزی کے ساتھ داخل ہوئے۔ آتے ہوئے ایک آدمی کو ان کا پیر لگ گیا وہ رک گئے اور معافی مانگی۔ اس نے تو اسے اپنے لیے ایک نعمت تصور کیا ہوگا۔

مولانا حسرت موہانی چونکہ میرے اوپر بہت مہربان تھے میں ان کے ساتھ ہر جگہ چلا جاتا تھا اور کوئی نہیں روکتا تھا۔ میں سبجکٹ کمیٹی یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں بھی گیا۔ ایک کنارے دور بیٹھ کر کل کارروائی دیکھتا تھا۔ وہاں گاندھی جی نے کانگریس کا نصب العین سوراج اور ذریعہ حصول عدم تشدد وہ بھی قول و عمل اور خیال میں تجویز کیا۔

SWARAJ BY NON-VIOLENCE INWARD THROUGOUT DEED

ریزولیوشن انگریزی میں تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے سوراجیہ کی جگہ آزادی کامل بیرون حکومت برطانیہ اور ذریعہ قول و فعل اور خیال میں عدم تشدد کی جگہ ممکن ذریعہ سے رکھنے کی ترمیم پیش کی۔ مولانا حسرت موہانی نے آزادی کامل کے لیے ایک مدلل اور پرجوش تقریر کی اور یہ بھی کہا کہ اگر کانگریس کا نصب العین آزادی کامل بیرون حکومت برطانیہ منظور نہیں ہوتا ہے تو میں کانگریس سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ مگر دوسری سانس میں ہنس کر کہا "اگرچہ میں مستعفی نہیں ہوں گا" گاندھی جی نے کہا کہ ایسے شخص کو استعفیٰ دے ہی دینا چاہیے۔ حسرت کی تقریر کے ختم ہونے کے بعد گاندھی جی نے جو تقریر کی وہ مجھے اب تک یاد ہے:۔

"اگر مولانا آزادی کامل کے لیے آگے بڑھیں گے تو میں ان سے پیچھے نہیں رہوں گا۔ مگر اس کے لیے طاقت کی ضرورت ہے۔ میں تو آگرہ کے قلعہ پر کانگریس کا جھنڈا گاڑ سکتا ہوں۔ اگرچہ وہاں ہٹلر جیسا پاگل گورنر ہے۔ لیکن ایسا کرنے کے لیے طاقت چاہیے۔ میں کوئی ایسی بات کہنا نہیں چاہتا جس کو میں کر نہ سکوں یا جس کے کرنے کے لیے میرے اندر طاقت نہ ہو"

سبجکٹ کمیٹی میں مولانا حسرت کی ترمیم نامنظور ہو گئی۔ دوسرے دن مولانا حسرت موہانی نے قیامت مچا دی۔ برابر چھوٹے چھوٹے جلسوں میں پرشور تقریریں کرتے تھے کہ مسلمان خیال میں عدم تشدد رکھے گا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جہاد کا خیال ترک کر دے گا اور اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ گاندھی جی مسلمانوں کو جین مذہب کا پیرو بنانا چاہتے تھے۔ اسی طرح کے ایک جلسے میں مولانا حسرت اپنا عصا میز پر رکھ کر تقریر کر رہے تھے کہ مولانا آزاد سبحانی

کھڑے ہوئے اور کہا کہ مولانا اگر خیال THOUGHT کو ارادہ INTENTION میں بدل دیا جائے تو آپ کو پھر تو کوئی اعتراض نہیں رہے گا۔ مولانا حسرت نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور چل دیے۔ بعد کو وہ تنہائی میں مولانا آزاد سبحانی پر برس پڑے "آپ کو کیا ضرورت تھی خیال کو ارادے میں بدلنے کی تحریک کرنے کی۔" بات یہ ہے کہ یہ بات مشہور ہو گئی تھی اور گاندھی جی مضطرب تھے اور مولانا آزاد سبحانی گاندھی جی سے خیال کو ارادے میں بدلنے کی اجازت لے آئے تھے۔ مولانا آزاد سبحانی نے ایک دن قبل مولانا حسرت اور گاندھی جی میں صلح کرا دی تھی اور مولانا حسرت راضی ہو گئے تھے کہ وہ دو سال تک گاندھی جی کے مزاحم نہ ہوں گے مگر پھر وہ بدل گئے تھے مولانا آزاد سبحانی نے مجھے یہ بات بتائی۔ وہی جواب انھوں نے حسرت کو بھی دے دیا۔

میں نے مولانا حسرت سے کہا کہ آپ آج ہی آزادی کامل پر کیوں زور دیتے ہیں۔ گاندھی جی تو ٹھیک کہتے ہیں کہ کہنے سے کیا حاصل؟ کر دکھانا ہے۔ اور جب قوم میں طاقت ہوگی تو وہ آزادی کامل کا نعرہ دیں گے مولانا حسرت نے کہا کہ تم سمجھے نہیں ہو گاندھی جی گوکھلے کے شاگرد ہیں جو پکے ماڈریٹ تھے۔ یہ قوم کو ابھاریں گے اور پھر ڈومینین اسٹیٹس (نو آبادیاتی طرز) پر راضی ہو جائیں گے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ اس پر آج ہی پابندی عائد کر دی جائے۔ مولانا حسرت کا یہ مغالطہ آخر عمر تک دور نہیں ہوا اور وہ مسلم لیگ میں بھی اسی لیے بعد کو شامل ہوئے کہ جناح اور گاندھی کو مل کر ڈومینین اسٹیٹس پر صلح کرنے سے باز رکھ سکیں جیسا کہ خود انھوں نے مجھ سے کہا۔ مولانا حسرت کا شبہ کس قدر غلط تھا وقت نے ثابت کیا۔

مسٹر محمد علی جناح

میں ایک پھاٹک پر اپنا پاس دکھانے کے لیے لائن میں کھڑا تھا کہ ایک نہایت خوب صورت خاتون نیم برہنہ لباس میں آئیں اور اندر جانا چاہا۔ والنٹیر نے پاس مانگا تو انھوں نے انگریزی میں کہا میں مسز جناح ہوں۔ والنٹیر نے انگریزی میں بڑی لجاجت سے کہا کہ میں اپنے فرض کی انجام دہی سے مجبور ہوں کہ کسی کو بلا پاس جانے نہ دوں" اتنے میں بہترین سوٹ میں خود مسٹر جناح تشریف لائے۔ خاتون نے ان کی جانب مخاطب ہو کر انگریزی میں کہا "جے (J) یہ مجھ سے پاس مانگتے ہیں اور اندر جانے نہیں دیتے" مسٹر جناح نے نہایت خاموشی سے اپنا پاس ان کو دے دیا وہ اندر چلی گئیں اور خود اپنے نوٹ بک سے ایک پرچہ لکھ کر والنٹیر سے کہا کہ وہ ڈائس پر پہنچا دے۔ تب تک میں اندر داخل ہو چکا تھا۔ دیکھا کہ پرچہ پہنچا اور ہل چل مچ گئی۔ خود حکیم اجمل خاں کھڑے ہو گئے اور تھوڑی دیر میں مسٹر جناح ڈائس پر آ گئے۔ یہ کانگریس میں ان کی آخری شرکت تھی۔ اس کے بعد وہ کانگریس سے مستعفی ہو گئے۔

ناز پروردۂ نعم نہ برد راہ بدوست   عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد

گاندھی جی نے یو پی کانگریس کے ڈیلیگیٹوں کو طلب کیا اور ان کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندو مسلمان کبھی متحد نہ ہو سکیں گے اگر گفتگو ہی درمیان میں حائل رہی۔ مولانا آزاد سبحانی نے کہا کہ گاندھی جی آپ جب اتنی بڑی قربانی مانگتے ہیں تو مقصد بھی بڑا ہونا چاہیے۔ آزادی کامل کو آپ تسلیم کر لیجیے۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ مولانا کا خیال ہے کہ بڑی برائی کو روکنے کے لیے بڑی قربانی دینی پڑتی ہے مگر یہ الیقین ہے کہ چھوٹی برائی کو روکنے کے لیے بھی بعض اوقات بڑی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس جلسہ میں گاندھی جی نے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ یو۔پی کانگریس پر حسرت کا بڑا اثر ہے۔ آپ لوگ یا حسرت کو لے کر رہیں یا مجھ کو۔ دونوں کو لے کر نہیں رہ سکتے۔ موتی چند ر جیسی جو بعد کو ریاستی پارٹی کے ایک رکن رہے اور ایم ایل اے ہوئے اٹھے اور کہا کہ ہم لوگوں پر حسرت کا اثر بہت ہے۔ گاندھی جی نے کہا آپ بیٹھ جائیے میں نے ایک حقیقت بیان کی ہے آپ سے رائے نہیں مانگی ہے۔ احمد آباد کانگریس میں میں نے عباس طیب جی کو دیکھا جن کے بال برف کی طرح سفید تھے نوجوان لڑکیاں ان کو ہر دم گھیرے رہتی تھیں اور وہ اپنی لڑکی کو اپنے ساتھ درمیان میں بنے پکڑے ہوئے گئے تھے جہاں سے انھوں نے ترانہ گایا تھا۔

اندرا گاندھی

مختلف جلسے سیشن کے اوقات کے باہر میدان میں ہوا کرتے تھے جن میں مختلف لیڈران تقریریں کرتے تھے ان جلسوں میں میں نے ایک چھوٹی سی لڑکی دیکھی جس کی عمر کا اندازہ اس وقت میں نے 6۔7 سال کیا۔ وہ گاندھی ٹوپی پہنے جہاں جاؤ دیکھو کہ بڑی ہی متانت سے خاموش بیٹھی ہوئی ہے۔ بی۔ اے میں میرا مضمون نفسیات (سائیکالوجی) تھا اور اس میں میں نے پڑھا تھا کہ سات سال سے کم عمر بچے سے یہ امید کرنا کہ وہ خاموش بیٹھے سخت ظلم ہے۔ اس لیے مجھے اس بچی کی متانت اور سنجیدگی دیکھ کر حیرت ہوئی اور میں نے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ یہ کون ہے۔ معلوم ہوا کہ جواہر لال جی کی لڑکی اندرا ہے۔

صلح کی بات

احمد آباد کانگریس میں یہ بھی مشہور تھا کہ وائسرائے گاندھی جی سے کہتے ہیں کہ صلح کر لیجیے۔ اور

مالوی جی نے ایک گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی تھی جو مسترد ہو گئی تھی لیکن گاندھی جی نے کہا کہ ابھی صلح کا وقت نہیں آیا ہے کیونکہ ابھی ہندوستان نے کافی تکلیف نہیں اٹھائی ہے۔ یہ بھی کہا کہ ابھی قوم میں ڈسپلن نہیں ہے ابھی تو ہم نے دیکھا کہ پنڈال کے اندر آتے جاتے لوگ ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہیں۔

احمد آباد کانگریس سے لوگ نئے عزم اور ولولے کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ لے کر واپس ہوئے ہیں۔ احمد آباد سے سیدھا لاہور اخبار زمیندار کی چیف ایڈیٹری کا چارج لینے روانہ ہو گیا۔

احمد آباد کانگریس کے بعد

احمد آباد کانگریس کے بعد تحریک زوروں سے چلی۔ گورنمنٹ گرفتاریاں کرتے کرتے تھک گئی تھی ورنہ لوگ اپنے کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے سے تھکتے نہ تھے۔ اخبارات پر چھاپے پڑتے تھے، پرچے ضبط ہوتے تھے، ایڈیٹر پرنٹر پبلشر گرفتار کیے جاتے تھے۔ دراصل یہ تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ ادھر اناطولیہ میں یونانیوں کے وحشیانہ مظالم کی روزمرہ خبریں آتی تھیں اور بچہ بچہ کو یقین تھا کہ یہ صرف برطانیہ کرا رہا ہے۔ اس لیے انگریز سے نفرت بہت ترقی کر گئی تھی۔ احمد آباد میں کام کو تیزی سے چلانے کے لیے کانگریس نے مہاتما گاندھی کو جملہ انتظامی اختیارات سونپ دیئے تھے۔

گاندھی جی سے لوگ سوال کرتے تھے جن میں بعض ہندوستان کے نامور لوگ اور بالخصوص معتدل طبقے کے لیڈران تھے کہ آپ نے ایک سال کے اندر سوراج دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ ایک سال گزر گیا اب آپ کو کیا کہنا ہے۔ گاندھی جی نے ایک طویل اور مدلل جواب ینگ انڈیا میں شائع کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سوراج تو ضرور نہیں ملا لیکن دماغ جو زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا آزاد ہو گیا ہے۔ یہ بھی لکھا کہ سوراج کے معنی گورنمنٹ کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ لوگوں کے دلوں میں حقیقی تبدیلی پیدا ہو جانا ہے۔ صحیح ہندو مسلم اتحاد ہو، لوگ چرخہ کاتنے لگیں اور عدم تشدد پر عمل پیرا ہوں۔ اب گاندھی جی نے زوروں کے ساتھ آزادی تحریر و تقریر و اجتماع و آزادی مطابع کا پروپیگنڈا بھی گورنمنٹ کی جابرانہ پالیسی کے مقابلے میں شروع کیا۔

آل پارٹیز کانفرنس

گورنمنٹ کا جبر و تشدد ان لوگوں کے لیے بھی ناقابل برداشت ہو گیا جو حکومت کے مخالف تو تھے لیکن تحریک ترک موالات کے حامی نہ تھے۔ چنانچہ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر جناح نے ایک آل پارٹیز کانفرنس بمبئی میں 14 جنوری 1922ء کو منعقد کی جس میں تین سو ڈیلیگیٹ آئے۔ حامیان ترک موالات کو بطور مدعوئین

خصوصی مدعو کیا گیا تھا۔ سر سنکرا نائر اس کانفرنس کے چیرمین قرار دیے گئے۔ این۔ سی کیلکر کی تجویز پر مہاتما گاندھی سب نا رکان موالات کی طرف سے واحد مقرر تھے۔ بانیان کانفرنس نے ایک مسودہ گورنمنٹ اور کانگریس کے درمیان صلح کا مرتب کیا تھا جس کا منشا یہ تھا کہ ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے اور اس میں پنجاب خلافت اور سوراج کا مسئلہ زیر بحث آکر طے کر دیا جائے۔ گاندھی جی نے کہا کہ کوئی گفتگو اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کل قیدی رہا نہ کر دیے جائیں۔ اس مسودہ میں علی برادران اور دوسرے قیدیوں کی رہائی کا ذکر نہیں ہے اسے ہونا چاہیے۔ اور گورنمنٹ کے جبر کی مذمت ہونی چاہیے۔ کانفرنس کا رخ دیکھ کر چیرمین صاحب کرسی چھوڑ کر بھاگ گئے اور ان کی جگہ سر وسیو اسرن چیرمین بنائے گئے۔ 17 جنوری 1922ء کو آخری فیصلہ ہوا مسودہ میں جبر کی مذمت اور قیدیوں کی رہائی بطور شرط اولین شامل کر دی گئی۔ اس پر گاندھی جی نے عارضی طور پر تحریک ترک موالات کو ملتوی کر دیا۔ 16 جنوری 1922ء سے جناح صاحب اور مالوی جی تار پر تار وائسرائے کو دیتے رہے مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ آخر کار 30 جنوری 1922ء کو ایک خط ملا جس میں وائسرائے نے ان شرائط کو ماننے سے مجبوری ظاہر کی تھی۔ اب تحریک پھر جاری ہوگئی اور یہ سب کوششیں بے سود رہیں۔

بردولی میں پھر سول نافرمانی

29 جنوری 1922ء کو ولبھ بھائی پٹیل نے بردولی میں سول نافرمانی کے آغاز کرنے کی اجازت طلب کی جائز نمائندوں کے سامنے جن میں پانچ سو عورتیں بھی تھیں۔ پٹیل صاحب نے ایک سنجیدہ اور ٹھوس تقریر کی اور سب سے عدم تشدد کا حلف لیا۔ 31 جنوری 1922ء کو ورکنگ کمیٹی نے بردولی میں عام سول نافرمانی کرنے کی اجازت دے دی۔ بردولی کی آبادی 78 ہزار تھی۔ مہاتما گاندھی نے یکم فروری 1922ء کو وائسرائے کو الٹی میٹم دیا کہ پنجاب خلافت اور سوراج کا مسئلہ حل کیا جائے ورنہ بردولی میں عام سول نافرمانی شروع کی جائے گی۔ 6 فروری 1922ء کو وائسرائے نے ایک کمیونک شائع کیا جس میں گاندھی جی کے مطالبات کو مدلل ماننے سے انکار کر دیا۔ 7 فروری 1922ء کو گاندھی جی نے اس کا جواب دیا اور گورنمنٹ جو جبر و تشدد کر رہی ہے اور وائسرائے نے جس سے انکار کیا تھا اس کی مثالیں پیش کیں جو حسب ذیل تھیں۔

(1) کلکتہ میں نہتوں پر گولی چلائی گئی۔

(2) سول گارڈس نے وحشیانہ سلوک پبلک کے ساتھ کیا۔

(3) ڈھاکہ اور علی گڑھ میں تمام پرامن جلسے زبردستی منتشر کیے گئے۔

(4) بہار کے بہت سے گاؤں لوٹ لیے گئے۔

(5) کانگریس اور خلافت کے والنٹیروں کو بہت جگہ شدت سے زدوکوب کیا گیا۔

(6) سورت پور میں کھدر، اور کانگریس اور خلافت کے دفتروں کے کاغذات جلا دیے گئے۔

(7) آدھی آدھی رات کو کانگریس اور خلافت کے دفتروں کی تلاشی لی گئی وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب خط و کتابت گاندھی جی بردولی سے کر رہے تھے جب وہ خود عام سول نافرمانی کی تیاری کے لیے موجود تھے۔ اب کل سامان تیار تھا صرف سگنل دینا تھا کہ ایک خطرناک رکاوٹ آگئی۔

چوری چورا کا واقعہ

8 فروری 1922ء کے صبح کے اخبار میں گاندھی جی نے چوری چورا کے واقعہ کی تفصیل پڑھی جو 5 فروری کو پیش آیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ چوری چورا میں ایک پر امن جلوس نکلا اور ختم ہو گیا۔ بعد کو کچھ لوگوں سے اور کانسٹبلوں سے گرم گرم بات چیت ہو گئی۔ کانسٹبلوں نے بدون سمجھے بوجھے فائرنگ شروع کر دیا اور جب تک ایک کارتوس بھی باقی تھا گولی چلاتے گئے۔ جب گولی ختم ہو گئی تب بھاگ کر تھانے میں پناہ لی۔ مجمع اس پر سخت مشتعل ہو گیا اور سب نے تھانہ کو گھیر لیا اور تھانہ کو آگ لگا دی۔ آگ لگنے پر کانسٹبل باہر نکلے تو 22 کانسٹبلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور ان کے جسم کے ٹکڑے آگ میں پھینک دیے۔ وہ جل کر خاک ہو گئے۔

گاندھی جی اس خبر کو پڑھ کر مضطرب ہو گئے۔ تحریک ان کی مدت کا سرمایہ تھی اس کو روکنا ایسی حالت میں جب کہ وہ وائسرائے کو چیلنج دے چکے تھے بہت ہی تکلیف دہ بات تھی۔ وہ سوچتے رہے اور آخر کار انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ شیطان کی آواز ہے وہ مجھے غرور کی تعلیم دے رہا ہے۔

گاندھی جی نے اعلان کیا کہ بردولی کی سول نافرمانی ملتوی کی جاتی ہے۔ 16 فروری کے ینگ انڈیا میں انھوں نے لکھا کہ خدا نے مجھے تین مرتبہ متنبہ کیا۔ اول بار جب رولٹ بل ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں احمد آباد ویرگام، امرت سر اور قصور نے تشدد پر عمل کر کے غلطیاں کیں اور میں خدا کے سامنے ذلیل ہوا۔ میں نے تسلیم کیا کہ مجھ سے ہمالیہ پہاڑ جیسی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ دوبارہ بمبئی میں اور اب چوری چورا میں یہ حادثے پیش آئے چنانچہ انھوں نے بطور تزکیہ نفس و سزا پانچ دن کے برت کا اعلان کیا۔

بردولی میں سول نافرمانی روکنے کا سب تحریکیوں اور پیروؤں پر بہت اثر پڑا۔ ہر شخص تلملا رہا تھا۔ جواہر لال نہرو نے جیل سے گاندھی جی کو احتجاج کے خطوط لکھے۔ سارے ملک میں مایوسی چھا گئی۔ محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری سابق ایڈیٹر ہمدرد نے جو حاجی بغلول کے نام سے مشہور ہیں اپنے خاص مزاحیہ انداز میں ایک استفتاء مسماۃ بردولی مستغیثہ بنام مہاتما گاندھی ملزم بدرگاہ رب العلیٰ شائع کیا۔ چھوٹے بڑے اپنے پرائے سب

مضطرب تھے مگر گاندھی جی اپنی جگہ مطمئن تھے وہ سب کو جواب دیتے تھے کہ تحریک عدم تشدد کے ساتھ ہی چل سکتی ہے۔ اور قوم میں ابھی عدم تشدد پیدا نہیں ہوا۔ لوگ کہتے تھے کہ بردولی چوری چورا سے بہت دور ہے۔ بردولی نے کیا کیا تھا۔ گاندھی جی کا جواب تھا کہ صرف بردولی ہندوستان نہیں ہے۔ بردولی سے شروع کر کے پورے ملک میں یہی کام کرنا ہے۔ جب تک پورا ہندوستان تیار نہ ہو ایک جگہ عام سول نافرمانی کیا کر سکے گی۔

گاندھی جی کی گرفتاری

تحریک میں اتنی تیزی آگئی کہ انگریز بدحواس ہوگیا اور اس نے اور سخت قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے ایک دلخراش تقریر میں ہندوستان کو دھمکی دی کہ ابھی گورنمنٹ کے پاس کچلنے کا سامان موجود ہے اور متنبہ کیا کہ لوگ وفاداری کی طرف لوٹ آئیں۔ 24 فروری 1922ء کو گاندھی جی نے اس کا دنداں شکن جواب دیا اور 10 مارچ 1922ء کو وہ گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری کے بعد گاندھی جی نے ایک بھجن سنا اور مولانا حسرت موہانی سے جو اتفاقاً آگئے تھے معانقہ کیا اور پولیس کی موٹر میں بیٹھ کر سبرامتی جیل روانہ ہو گئے۔ یہ عجیب اتفاق بھی حسرت کے لائق عمل پر لائق دجہد ہے وہ عمر بھر گاندھی جی کی مخالفت کرتے رہے لیکن گاندھی جی کی ہر تحریک میں جیل گئے اور آج جب گاندھی جی کے بارے میں گورنمنٹ کی پالیسی بدلی اور وہ گرفتار کیے گئے تو حسرت صاحب وہاں موجود تھے اور گاندھی جی نے جیل جانے سے قبل ان سے معانقہ کیا۔ یہ معانقہ اس بات کی دلیل تھی کہ دونوں کا مقصد ایک ہے۔ دونوں کے دلوں میں آگ سلگ رہی ہے۔ گاندھی جی کے ساتھ بنکر بھی تھے جنہیں گاندھی جی بہت مانتے تھے۔ 20 مارچ 1922ء کو سبرامتی جیل سے گاندھی جی یروداہ جیل بھیجے گئے اور وہاں بنکر کو گاندھی جی سے جدا کر دیا گیا۔

لندن کی بنچز آف ان BENCHES OF INN نے گاندھی جی کی بیرسٹری کی سند چھین لی جیل میں گاندھی جی کو اذیت دی جاتی تھی۔ روزانہ ان کی تلاشی لی جاتی تھی۔ اگرچہ وہ صرف ایک لنگوٹی پہنتے تھے۔ کمبل جھاڑ کر دیکھا جاتا تھا۔ ان کا برتن جیلر نے جوتے سے چھوا۔ سال میں ان کو صرف چار خط لکھنے کی اجازت ملی۔ انگریز اب اپنی شرافت ترک کر کے بزدلانہ انتقام پر اتر آیا تھا۔ گاندھی جی نے بحیثیت ستیہ گرہی سب کچھ برداشت کیا اور آخر کار حکام جیل نے معافی مانگی۔ ان کا چرخہ بھی دے دیا اور ان کا اعزاز و اکرام کرنے لگے۔ یعنی ظلم کی تلوار سچائی اور اہنسا کے روحانی ضرب سے ٹوٹ گئی۔

انگریز یہ سمجھتا تھا کہ گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد کوئی اور اتنا بڑا لیڈر نہیں ہے جو سارے ملک کو متاثر کر سکے لیکن کانگرس نے اپنا فرض پوری مستعدی سے ادا کیا۔ 7 جون 1922ء کو آل انڈیا

کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا جس کے سکریٹری راج گوپال آچاریہ تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو رہا ہو چکے تھے۔ وہ بھی شریک تھے۔ حکیم اجمل خاں، موتی لال نہرو، راج گوپال آچاریہ، ڈاکٹر انصاری، ولبھ بھائی پٹیل اور کستوری رنگا آئنگر کی ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی گئی کہ وہ 30 ستمبر 1922ء تک یہ رپورٹ دے کہ سول نافرمانی کو پھر کس طرح چلایا جائے۔ اوپر کے ناموں سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ ہندوستان قیادت کے معاملہ میں تہی دست نہ تھا۔

اگست 1922ء میں گورو کے باغ کا واقعہ پیش آیا۔ اکالی دل سکھوں کا اصلاح یافتہ طبقہ تھا یہ کل مندر پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ ایک جگہ کے مندر راضی نہ تھے۔ گورنمنٹ ان کے ساتھ تھی۔ جتھہ جاتا تھا اور اسے ڈنڈوں سے خوب مارا جاتا تھا اور وہ صرف "واہ گرو کی جے" "واہ گرو کی جے" کے نعرے لگاتے تھے۔ عدم تشدد کی اس شاندار مثال نے گاندھی جی کے فلسفہ کو بڑی طاقت دی اور بیرونی ممالک کے اخباری رپوٹر فوٹو لینے اور واقعات کا صحیح مرقع کھینچنے کے لیے دوڑ پڑے۔

30 ستمبر 1922ء کو کانگریس کی مقرر کردہ کمیٹی کی رپورٹ تیار ہوئی اور سی۔ آر۔ داس کو جو کانگریس کے صدر تھے دی گئی۔ رپورٹ کا منشا یہ تھا کہ سول نافرمانی ناقابل عمل ہے۔

20 اکتوبر 1922ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں یہ طے کیا گیا کہ صوبائی کمیٹیاں اپنی ذمہ داری پر انفرادی سول نافرمانی کی اجازت دے سکتی ہے۔ عام سول نافرمانی منظور نہیں ہوئی۔ دراصل گاندھی جی کے سوا اور کون اسے جاری کر سکتا تھا۔

دسمبر 1922ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ سیشن گیا میں ہوا۔ وہاں یہ تجویز پیش ہوئی کہ کونسلوں میں داخل ہو کر اندر سے اسے توڑا جائے۔ سی۔ آر داس نے اس کی تائید کی مگر یہ کہا کہ اگر خلافت کانفرنس اختلاف کرے گی تو کونسل کے داخلہ کو منظور نہیں کیا جائے گا۔ راج گوپال آچاریہ نے تجویز پیش کی کہ مکمل ترک موالات قائم رکھا جائے اور خلافت کانفرنس نے مکمل ترک تعاون ہی کی تجویز منظور کی۔ راج گوپال آچاریہ کی تجویز 1740 ووٹوں کی حمایت اور 890 ووٹوں کی مخالفت سے پاس ہوگئی۔ کانگریس نے یہ طے کیا کہ 25 لاکھ روپیہ جمع کیا جاوے اور پچاس ہزار والنٹیر بنائے جائیں۔

گاندھی اور مالویہ

ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں میں گاندھی جی کی ایک سال میں سوراج دلانے والی اسکیم پر یقین اور اعتقاد میں تذبذب بزدولی کی سول نافرمانی ملتوی کرنے کے وقت ہی پیدا ہو چکا تھا۔ کچھ لوگوں نے علانیہ

کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور اکثر لوگ زیر لب بڑبڑاتے تھے کہ جب پورا ہندوستان فرشتہ بن جائے گا تب ہم منزل کی جانب کوچ کریں گے۔ یہ کب ہوگا؟ کیا یہ ممکن بھی ہے؟ وہ کہتے تھے کہ ہندوستان کے ایک گوشہ کے واقعہ سے دوسرے گوشہ کو کیا تعلق ہے۔ کسی کو یہ بھروسہ نہ ہوتا تھا کہ کبھی ایسا ہوگا کہ پورے ہندوستان میں کہیں ایک پتہ نہ ہلے۔ خاص کر جبکہ گاندھی جی نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ مخالف بھی اگر تشدد کا باعث ہو تب بھی ذمہ داری ان کی ہے کیونکہ تحریک وہ چلا رہے ہیں۔ یہی وجوہ تھے کہ کچھ ہی دنوں کے بعد موتی لال نہرو اور سی آر داس نے داخلہ کونسل کا پروگرام بنایا اور گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد جب حکومت پر یہ واضح کرنا ضروری تھا کہ تحریک حکومت کی سخت گیری سے جس میں ان کے سب سے بڑے لیڈر کی گرفتاری بھی شامل ہے' دب نہیں سکتی اور کانگریس نے انفرادی سول نافرمانی کی اجازت صوبہ کانگریس کمیٹیوں کو دی۔

گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد ہی پنڈت مدن موہن مالوی میدان میں اُتر آئے اور انھوں نے سارے ہندوستان کا دورہ شروع کیا۔ وہ تحریک ترک موالات کی اپنی خود ساختہ تعبیر کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ترک موالات کی اسکیم میں عدالتوں اور اسکولوں کا بائیکاٹ شامل ہی نہیں ہے۔ یہیں سے ہندوستان میں چار سیاسی پارٹیاں ظہور پذیر ہوئیں۔

(1) وہ لوگ جو گاندھی جی کے پیچھے پیرو تھے اور جن کا عقیدہ ترک موالات، عدم تشدد، کھادی اور ہندو مسلم اتحاد پر تھا اور وہ چاہتے تھے کہ تحریک کا رنگ در رخ جو گاندھی کا نکھارا ہوا تھا غیر مبدل رہے۔

(2) کانگریس کے وہ لوگ جو گاندھی جی کی اسکیم سے اکتا چکے تھے اور کونسلوں کے اندر داخل ہو کر 1919ء کے مضحکہ خیز اصلاحات کو اندر سے توڑنے کے خواہشمند تھے ان میں ممتاز ہستیاں سی۔ آر داس، موتی لال نہرو، حکیم اجمل خاں وغیرہ کی تھیں۔

(3) انڈی پنڈنٹ جس میں مسٹر محمد علی جناح پنڈت مدن موہن مالوی وغیرہ تھے۔ یہ لوگ وائسرائے اور گاندھی جی میں صلح کرا کے کام استوار کرنے پر مصر تھے۔

(4) معتدل ماڈریٹ، جن میں سر تیج بہادر سپرو، مسٹر چنتامنی، سر شنکرا نائر وغیرہ تھے جو انگریز کے زیر سایہ حکومت اور آہستہ آہستہ اصلاحات اور ترقی پسندانہ قانون سازی کو ذریعہ بتلاتے ہیں۔

پنڈت مدن موہن مالوی جی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے ان کا دامن ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک تھا ہندو دھرم کے ایک سچے اور باوقار سرد ہوتے ہوئے ان پر تعصب یا تنگ نظری کا الزام کبھی عائد نہیں ہوا ان کی خدمات بھی عظیم تھیں اور بنارس ہندو یونیورسٹی ان کے پرشکوہ کارناموں کی با شوکت مثال تھی۔ ان کا لحاظ اور خیال گاندھی جی بھی کرتے تھے مگر ان کے خیالات انتہا پسندانہ کبھی نہیں رہے البتہ وہ انتہا پسندی کی مخالفت پر

بھی کبھی آمادہ نہ ہوئے۔ ان کی کوششیں صرف اصلاح حالات تک محدود رہیں۔

گاندھی جی کی عدم موجودگی میں پنڈت مالوی کے دورے اور ترک موالات کی انوکھی تشریح سے جس خطرے کا اندیشہ ہوسکتا تھا وہ بہرحال پیش نہیں آیا۔ گاندھی جی نے عوام کے دل و دماغ پر قبضہ جمالیا تھا۔

کونسلوں میں داخلہ

سی۔آر داس اور موتی لال نہرو نے یکم جنوری 1923ء کو سوراج پارٹی کی بنیاد رکھی اور یہ کہہ کر رکھی کہ یہ کانگریس کے اندر ایک پارٹی ہوگی۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ کونسلوں کو اندر سے توڑا جائے اور جب کانگریس میں اس پارٹی کی اکثریت ہو جائے گی تو وہ پھر کام کرے گی۔ مولانا حسرت موہانی نے کلکتہ جاکر داس اور نہرو سے مل کر لیا اور اخبارات نے صفحہ اول پر اسے موٹی موٹی سرخیوں سے درج کیا۔

یکم مئی 1923ء کو مولانا آزاد کانگریس کے صدر ہوئے۔ ستمبر 1922ء میں کانگریس کا اسپیشل سیشن دلی میں ہوا۔ اس وقت مولانا محمد علی رہا ہو چکے تھے اور اس جلسہ میں شریک تھے۔ اس اجلاس میں کونسلوں کا داخلہ منظور ہوگیا۔

سی آر داس اور موتی لال کا انخار کامیاب رہا۔ سوراج پارٹی الیکشن لڑی۔ کئی صوبوں میں اس نے اکثریت حاصل کرلی اور سنٹر میں آدھی سیٹیں جیت لیں۔

ترکی کا حال

نومبر 1922ء مصطفیٰ کمال نے ترکی کے ایک جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا اور سلطان وحید الدین کو معزول کردیا جو ایک انگریزی جہاز پر مالٹا بھاگ گئے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن   بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

اب سلطان عبدالمجید خاں ان کی جگہ خلیفہ مقرر کیے گئے۔ مگر ایک جمہوریہ کے ساتھ ایک بے اختیار سلطان کا بحیثیت خلیفۃ المسلمین کیا جوڑ ہوسکتا ہے۔ اور یہیں سے ہمارے ملک میں بحثیں شروع ہوئیں جن میں اکابرین علماء و زعماء نے حصہ لیا۔

1923ء

شبہات ـــــ کانگریس میں اختلاف آرار

گاندھی جی ابھی جیل ہی میں تھے کہ رفتہ رفتہ ہر مرحلہ پر ان کی تعلیمات کو دھکا لگنا شروع ہوا حکیم اجمل خاں سی آر داس، موتی لال نہرو وغیرہ تحریک کی اس شرط سے بیزار ہو گئے تھے۔ وہ متفق نہ تھے کہ سول نافرمانی کو تمام ہندوستان کے یک قلم عدم تشدد پر عمل پیرا ہو جانے پر منحصر کیا جائے۔ درحقیقت بردولی کی سول نافرمانی کو روکنے کا جو فیصلہ گاندھی جی نے کیا تھا اس سے ہندوستان کا کوئی بڑا یا چھوٹا لیڈر متفق نہ تھا بگر سول نافرمانی اور پھر عام سول نافرمانی کا ضلع بہ ضلع اجرا کرنا گاندھی جی کے سوا کسی دوسرے کے بس کی بات بھی تو نہ تھی۔ لوگوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اگر ملک کے کسی حصہ میں بلوہ ہو جائے تو سول نافرمانی ملک کے دوسرے حصہ میں بالکل رک رہ جائے گی۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ سول نافرمانی ایک قطعی ناقابل عمل چیز ہے کیونکہ حکومت کے لیے کسی ایک جگہ بلوہ فساد کرا دینا کون سا مشکل کام ہے۔ اور یوں بھی اتنے بڑے ملک کا ایک دم مطمئن ہو جانا بعید از قیاس ہے۔ اس لیے داس اور موتی لال نے یہ سوچا کہ صحیح نمائندوں کے نہ ہونے سے مظلومین کی فریاد لیجانے والا کوئی نہیں ہے۔ بھاری بھاری ٹیکس لگائے جا رہے ہیں اور عوام سخت مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اب اس وقت کا انتظار کرنے کے بجائے کہ جب سارا ہندوستان عدم تشدد پر عمل پیرا ہو جائے گا بہتر ہے کہ ہم کونسلوں اور مرکزی کونسل میں گھس کر نااہل لوگوں کو نکال دیں اور اندر سے ان اصلاحات کو توڑ دیں اور اس راستہ سے آزادی کی منزل کی جانب رواں ہوں۔ اس طرح ترک تعاون اور ترک موالات سول نافرمانی حتیٰ کہ سودیشی بھی۔ الغرض گاندھی جی کی کل تنظیم و تعلیم پیچھے رہ گئی اور لوگ الیکشن لڑنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

دوسرا سانحہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم اتحاد کو کئی طرف سے سخت دھکا لگا۔ ایک تو بڑے بڑے شہروں میں ہندو مسلم دنگے شروع ہو گئے جن سے اتحاد ریزہ ریزہ ہو گیا۔ دوسرے ضلع آگرہ میں ملکانہ راجپوت شہر آگرہ کے آس پاس رہتے تھے جو عرصہ ہوا مسلمان ہو چکے تھے۔ 1923ء میں آریہ سماج نے ان کی شدھی کرنے اور ان کو از سر نو ہندو بنانے کا فیصلہ کیا اور جوق در جوق لوگ شدھی ہونے لگے۔ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک آگ لگا دی۔ مذہبی جوش جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ بہت سے تبلیغی جماعتوں نے اطراف ہند سے مقابلہ کا کام کرنے لوگوں کو شدھی ہونے سے روکنے اور جو شدھی ہو چکے تھے ان کو مشرف بہ اسلام کرنے کا کام شروع کیا۔ اس تحریک شدھی کے لیڈر سوامی شردھانند جی تھے جو تحریک ترک موالات کے ابتدائی دور میں

جامع مسجد دلی میں موذن کے مکبرے پر سے تقریر کر چکے تھے۔ اس سے مسلمانوں میں بڑی آزردگی پیدا ہوئی اور اس سے مسلمانوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندو کسی حال میں مل جل کر کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ علماء حق نے بڑی کوشش کی کہ یہ مسئلہ باعث نزاع رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد خود آگرہ گئے اور وہاں سے واپس آکر لاہور ایک بیان دیا جو اخبار زمیندار لاہور کے 15 اپریل 1923ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ مولانا نے فرمایا:

"ہندوستان میں ہر شخص اور ہر جماعت کو حق حاصل ہے کہ جائز اور پر امن طریقہ سے اپنے مذہب کی اشاعت و تبلیغ کرے۔ اعتقاد در پسند کی آزادی انسان کا فطری حق ہے۔ انسان نے اپنے بہت سے حقوق کی طرح یہ حق بھی کھو دیا تھا۔ تیرہ سو برس ہوئے قرآن نے از سر نو اس کا اعلان کیا۔
لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

مولانا نے اس طرح یہ تعلیم دی کہ جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے مسلمانوں کو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس پر معترض ہوں بلکہ چاہیے کہ وہ اپنا فرض انجام دیں۔ لیکن مولانا نے یہ بھی لکھ کر ملکانہ میں جو ہو رہا ہے وہ بطور ایک تحریک کے ہے اور جن لوگوں نے اس کا آغاز کیا ہے انھوں نے ملک کا عام مفاد نظر انداز کر دیا ہے۔ لوگوں کو اس وقت ان تمام باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے تھا جو ملک کے جذبات اور توجہ کو ملکی اتفاق اور مشترک جدوجہد سے ہٹا کر کسی اشتعال انگیز مقصد کی طرف لے جائیں۔

یہ ہوشمندانہ دانشورانہ اور غیر جانبدارانہ مشورہ نہ ہندوؤں کی سمجھ میں آیا نہ مسلمانوں کی۔ چنانچہ پنجاب میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے اس کے مقابلہ میں "تبلیغ اور تنظیم" کی تحریک شروع کر دی اور ملک کی کل طاقت اسی نزاع میں صرف ہونے لگی

میں نے اخبار زمیندار میں ایک سلسلہ مضامین اس پر لکھا جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ کس طرح مسلمان کلمہ تک سے ناواقف ہیں۔ ایسی جگہیں ہیں جہاں کوئی نماز جنازہ پڑھنے والا نہیں ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ علماء کی ایک جماعت مسلمانوں کی اصلاح میں لگ جائیں اور قومی کام جو ہو رہا ہے اسی طرح ہوتا رہے اور جو جماعتیں کر رہی ہیں وہ کرتی رہیں۔ یہ ایک علیحدہ تعمیری کام ہے جو خالص مذہبی رنگ میں کیا جائے۔ اخبار ہفتہ وار "الامان" جس کے ایڈیٹر مولانا مظہر الدین تھے اور جو میرے کرم فرما تھے وہ اس سے شدت سے اختلاف کرتے تھے اور دونوں اخباروں میں مضامین کا سلسلہ جاری رہا آخر کار "الامان" نے تسلیم کیا کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی صحیح ہے۔ اس پر مولانا ظفر علی خاں نے حسب ذیل شعر لکھا تھا۔

فیصلہ عدیل پر آخر کار ہے عمل   مان گیا ہے "الاماں" بھی آپ کے اجتہاد کو

اس کے علاوہ بنگال کی تشدد انگیز انقلابی پارٹیاں جو گاندھی جی کی وجہ سے دب گئی تھیں وہ ابھر آئیں اور انھوں نے ڈکیتی لوٹ اور تشدد کا بازار گرم کر دیا۔

اس طرح ہر چہار جانب سے گاندھی جی کے فلسفہ سے عملاً انحراف شروع ہو گیا۔

گاندھی جی کی رہائی

جیل کے اندر گاندھی جی کی آنتوں میں پھوڑا نکل آیا۔ وہ پونا کے سیلون اسپتال منتقل کیے گئے وہاں ان کا آپریشن ہوا صحت کی خرابی کے باعث وہ 5 فروری 1924ء کو رہا کر دیے گئے اور 10 مارچ 1924ء کو وہ جو ہو صحت بنانے چلے گئے۔ اپریل کے پہلے ہفتہ میں انھوں نے ینگ انڈیا کا چارج لیا اور ہندو مسلم اتحاد پر مسلسل مضامین لکھتے رہے 19 جون 1924ء کو انھوں نے کانگریس کی تنظیم نو کا پروگرام بھیجا جو 27 جون 1924ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں پیش ہوا۔ وہاں گاندھی جی نے جو منظر دیکھا اس سے وہ دل برداشتہ ہو گئے اور 30 جون 1924ء کے ینگ انڈیا میں انھوں نے لکھا کہ مجھ کو شکست ہو گئی اور میں شرمندہ ہوں کہ انھوں نے اجلاس کے آخر میں بڑی دلگیری کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میں تم لوگوں کا رنگ رخ خوب دیکھ رہا ہوں اور سمجھ رہا ہوں۔ ادھر امیٹھی سنبھل اور گلبرگہ میں بلوے ہو چکے تھے اب کوہاٹ میں بڑا زبردست ہندو مسلم بلوہ ہوا۔

گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے 18 دسمبر 1924ء کو 21 دن کے برت کا اعلان کیا۔

ملاپ کانفرنس

اس کے نتیجہ میں ایک ملاپ کانفرنس منعقد کی گئی جس میں ملک کے تمام ممتاز لیڈر شریک ہوئے کانفرنس کے صدر موتی لال نہرو تھے۔ ایک حصہ بانس سے الگ گھیرا ہوا تھا اس میں تمام لیڈر بیٹھے تھے۔ اس کے پیچھے آرام کرنے کا یا باہمی گفت و شنید تنہائی میں کرنے کا انتظام تھا۔ دوسری جانب تمام پبلک کو آنے اور بیٹھنے کی اجازت تھی۔ میں مولانا عبد الحلیم اور مولانا محمد عرفان کے ساتھ (دونوں میرے رفیق اور جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں تھے) برابر شریک رہا۔ اس کانفرنس میں مختلف مسائل زیر بحث آئے اور سب پر بحث و گفتگو کے بعد اتفاق رائے ہو گیا۔ اس طرح اس وقت گویا تمام ہندو مسلم مسائل طے ہو گئے تھے۔

جس دن گائے کی قربانی پر بحث آنے والی تھی اس کے ایک دن قبل تمام مسلم لیڈر حکیم اجمل خاں

کے مکان پر جمع ہوئے اور وہاں یہ طے ہوا کہ سب مسلمان لیڈر چپ بیٹھے رہیں اور جب سب لوگ کہہ لیں تو صرف مفتی کفایت اللہ جواب دیں۔ لیکن ہوا یہ کہ جیسے ہی جلسہ شروع ہوا مولانا مظہر الدین کھڑے ہو گئے اور انھوں نے ایک مہمل سی تقریر کر دی۔ اس کا تو کسی نے لحاظ نہیں کیا کیونکہ ان کی کل ہند پوزیشن ہی نہ تھی۔ لیکن مولانا محمد علی نے یہ ضابطہ توڑ دیا اور ایک تقریر کے دوران کہہ دیا کہ "اگر ہندو میری بیوی یا میری ماں کی عصمت دری کریں تب بھی میں ہندوؤں سے نہیں لڑوں گا۔" اس جملے سے مسلمانوں میں بڑا ہیجان پیدا ہوا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد میں تھوڑی دیر ٹھہر گیا۔ دیکھا کہ حکیم اجمل خاں مولانا محمد علی سے کہہ رہے ہیں کہ جب یہ طے ہو گیا تھا کہ کوئی تقریر نہیں کرے گا تو آپ نے کیوں تقریر کی۔ مولانا محمد علی جھلا گئے اور غصے سے بھری ہوئی آواز میں کہا "میں ایسا ذلیل نہیں ہوں کہ آپ مجھے ڈانٹیں۔" میں یہ جواب سن کر سکتے میں رہ گیا۔ عصر کی نماز کے لیے مولانا عرفان، مولانا عبدالعلیم، مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کے قریب کی مسجد میں گئے وہاں ہُو کا عالم تھا۔ مولانا مدنی نے دریافت کیا کہ نماز عصر کا کیا وقت مقرر ہے۔ تو ان دونوں نے (جو ان کے مرید بھی تھے) کہا کہ کوئی وقت مقرر نہیں ہے جب لوگ آ جاتے ہیں نماز ہو جاتی ہے۔ مولانا مدنی مسکرائے اور کہا کہ صاف کیوں نہیں کہتے کہ نماز باجماعت پڑھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوتا ہے۔ وہاں مولانا عبدالعلیم نے یہ بھی مولانا مدنی سے کہا کہ مولانا محمد علی نے اپنی بیوی کی عصمت دری کے بارے میں کہا تو خیر مگر ماں کے لیے کیوں کہا کیونکہ وہ تو ہم سب کی بھی ماں ہیں۔ مولانا مدنی کچھ مسکرائے اور کہا کہ ان کو بھی تو آپ کہہ دیں گے کہ ہماری بہن ہیں۔ گویا کہ کسی اشتعال میں نہیں آئے اور ٹال گئے۔ یہ ٹال جانا مولانا محمد علی کی زندگی میں ناپید تھا۔

کانفرنس نہایت سادگی کے ساتھ منعقد ہوئی کوئی آرائش نہ تھی۔ خطبۂ استقبالیہ اور خطبۂ صدارت میں بھی وقت نہیں لگایا گیا۔ براہ راست کام کی باتیں شروع ہوئیں۔ پہلی تجویز مندروں کے گرائے جانے پر آئی۔ فوراً کسی صاحب نے یہ ترمیم پیش کر دی "مساجد" کا لفظ مندروں کے بعد بڑھا دیا جائے۔ اس پر گرم بحثیں ہونے لگیں مولانا ابوالکلام آزاد کھڑے ہوئے اور انھوں نے ترمیم کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ایک حرف "ابھری ہوئی حقیقتیں ہیں" نمایاں کا سلیس ترجمہ "ابھری ہوئی" پہلی مرتبہ لوگوں نے مولانا آزاد کی زبان سے سنا اور تعجب کیا۔ جن صاحب نے یہ ترمیم پیش کی وہ کسی مسجد کے گرائے جانے کی مثال نہ پیش کر سکے اور ترمیم واپس لے لی۔

بڑا معرکہ اس دن ہوا جب گائے کی قربانی کا مسئلہ پیش ہوا۔ مسلمان سب خاموش رہے۔ پٹیل لنگوٹی پہنے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں بھی ہندو ہوں۔ گائے میرے نزدیک مقدس اور متبرک ہے لیکن مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ گائے کے بارے میں ہم اپنا عقیدہ مسلمان بھائیوں

زبردستی ہو ہیں۔ البتہ اگر وہ خود برضا و رغبت اسے ترک کر دیں تو بہتر ہے۔ اس کے بعد لالہ لاجپت رائے کھڑے ہوئے اور انھوں نے طنزیہ انداز میں تقریر شروع کی اور کہا کہ میں ہندوؤں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آج ان میں ایک کا اضافہ ہوا ہے۔ کل مجھ سے جینی جی نے کہا تھا کہ میں ہندو نہیں ہوں اور آج کہہ رہے ہیں کہ میں ہندو ہوں۔ لالہ جی کے مکمل امتناعِ گاؤکشی کی تجویز پیش کی۔ پنڈت مدن موہن مالوی جی نے ایسی شستہ اردو میں تقریر کی کہ ہم سب محوِ حیرت رہ گئے۔ انھوں نے کہا کہ درمیانی راستہ بہتر ہے۔ جہاں کہیں قربانی ہوتی ہے وہاں ہندو کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں اور نہ قانونی جبر ڈالا جائے لیکن جہاں نہیں ہوتی ہے وہاں مسلمان نئے سرے سے گائے کی قربانی نہ کریں۔ کچھ اور تقریروں کے بعد مفتی کفایت اللہ نے بڑی مدلل تقریر کی اور ذبیحہ گاؤ اور قربانی گاؤ کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ مولانا محمد علی نے کہا کہ مسلمان گائے کا ذبیحہ بالکل بند کر دیں۔ بحث ختم نہیں ہوئی۔ دوسرے دن میں نے دیکھا کہ پنڈت مالوی جی مولانا کفایت اللہ صاحب سے کہہ رہے تھے کہ "مولانا ذرا غور کیجئے۔ اس پر نظر دوڑائیے کہ ہم ہندوؤں کے جذبات گائے کے بارے میں کیا ہیں پھر بھی ہم اس پر راضی ہیں کہ جہاں گائے کی قربانی ہوتی ہے ہو اور اس پر بھی راضی ہیں کہ قانون سے کہیں روکا نہ جائے۔ جب ہم اس حد تک جھک رہے ہیں تو آپ بھی اپنی جگہ سے کچھ ہٹیے۔ آخر اس میں آپ کو کیا قباحت ہے کہ آپ یہ تسلیم کر لیں کہ جہاں نہیں ہوتی ہے نہ ہو ہم تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ جہاں آج تک گائے کی قربانی ہوئی نہیں صرف انہیں جگہوں پر آپ برضا و رغبت آئندہ بھی نہ کریں"۔ مفتی صاحب پہلے تو اڑے مگر اڑنے کی گنجائش کہاں تھی۔ آخر کار مان گئے۔ اور پنڈت مالوی کی تجویز پاس ہو گئی۔ افسوس ہے کہ بعد میں کوئی اس پر قائم نہ رہا اور شاید اس عہد کو توڑنے کی پہل مسلمانوں ہی نے کی۔

کانفرنس میں سی آر داس موجود نہ تھے۔ ان کو کلکتہ تار دیا گیا اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ آئے۔ سنا کہ پہنچتے ہی پوچھا کہ مجھے کیوں بلایا گیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ گاندھی جی برت رکھ رہے ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کے راستہ کی رکاوٹیں دور کرنی ہیں۔ داس نے جواب دیا کہ گاندھی اپنے ضمیر کی آواز پر برت رکھ رہے ہیں۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے وہ کسی کے کہنے سے اس کو روک نہیں سکتے۔ رہا ہندو مسلمان کا معاملہ تو میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان میری کیا ضرورت ہے۔ دوسری ٹرین سے واپس آ گئے۔ غرض اسی طرح بہت سے نزاعی امور پر بحث رہی اور آخر کار کل مسائل اتفاق رائے سے طے ہو گئے مگر اختلاف کی جڑیں زیادہ گہری تھیں۔ صرف مسجد کے سامنے باجہ، دنگا فساد، گائے کی قربانی وغیرہ فروعی مسائل پر بحث آئی اور بظاہر اتحاد قائم ہو گیا جو دیرپا ثابت نہیں ہوا۔

خلافت کانفرنس بلگام

بلگام میں 24 دسمبر 1924ء کو خلافت کا اجلاس ہوا اور 26 دسمبر 1924ء یہیں کانگریس کا جلسہ ہوا۔ مہاتما گاندھی اس اجلاس کے صدر تھے۔ بڑی مشکل سے ان کو صدارت قبول کرنے پر راضی کیا گیا تھا۔ خلافت کانفرنس کے صدر ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے۔ 30 دسمبر 1924ء کو بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اجلاس میں مسٹر جناح نے مسلمانوں کی جداگانہ نیابت کی اسکیم پیش کی تھی۔ مسٹر جناح کا فرقہ پرستی کی جانب یہ پہلا قدم تھا۔ اس سے پہلے وہ مشترکہ انتخاب کی تائید میں فرمایا کرتے تھے کہ "اگر مسلمان سیاست میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو وہ صدر دروازے سے آئیں نہ کہ عقبی دروازے یعنی کھڑکی سے۔

بلگام میں کانگریس ہی کے پنڈال میں 27 دسمبر 1924ء کو ہندو مہاسبھا کا بھی اجلاس ہوا جس کی صدارت پنڈت مدن موہن مالوی نے کی۔ اس میں کانگریس کے لیڈروں نے بھی شرکت کی۔ مالوی جی نے دعویٰ کیا کہ ہندو مہاسبھا کوئی فرقہ وارانہ جماعت نہیں ہے۔

بلگام میں آخر کار گاندھی جی نے سپر ڈال دی اور گاندھی نہرو داس معاہدہ تیار ہوا جس کا منشا یہ تھا کہ کونسلوں کا داخلہ منظور کر لیا جائے اور چرخہ کاتنا ممبری کے لیے ضروری قرار دیا جائے۔ گاندھی جی نے ترک موالات کو خیرباد کہا اور اپنے آشرم میں واپس چلے گئے۔

16 جون 1925ء کو سی آر داس کا انتقال ہو گیا جس کا پورے ہندوستان نے ماتم کیا۔ اور 16 جولائی 1925ء کو گاندھی جی نے کانگریس کا کل انتظام پنڈت موتی لال نہرو کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ 22 ستمبر 1925ء سے سوراج پارٹی کانگریس بن گئی۔

یہ ایک درمیانی وقفہ ہے جس کا نام گاندھی جی نے ——— MASTERLY INACTIVITY ماہرانہ تعطل) رکھا تھا اور ان کا یہ بھی منشا تھا کہ لوگ بہت تکلیف اٹھا چکے کچھ دنوں آرام کر لیں۔ گاندھی جی نے ہندوستان کو خودشناسی اور آزادی کی امنگ کی جس راہ پر ڈال دیا تھا وہاں سے واپس ہونے کا تو کوئی سوال تھا ہی نہیں۔ بلگام کے جلسے میں گاندھی جی کی جیت ہوئی تھی۔ مگر انھوں نے آبدیدہ ہو کر یہ کہا تھا کہ ان عظیم رفیقوں کے بغیر کیا کام ہو سکے گا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بھی آنکھیں نم تھیں۔ گاندھی جی نے خود جو سپر ڈال دی وہ ان کی وسعت قلبی تدبر کی مہارت حقیقت پسندی اور اخلاص کا پتہ دیتی ہے۔ گاندھی جی اپنے دیدۂ بینا سے یہ دیکھ رہے تھے کہ پھر بگل بجے گا اور ان کی منڈی دل فوج پھر جمع ہوگی اور پھر وار دیس کی دعوت دی جائے گی۔

تیرھواں باب

خلافت کا خاتمہ

مصطفیٰ کمال نے وحید الدین خاں کو معزول کر کے سلطان عبد المجید خاں کو خلیفہ مقرر کیا اور ترکی کو ایک یورپین طرز کی جمہوریہ قرار دے کر سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ یہ واقعہ یکم نومبر 1922ء کو پیش آیا۔

3 مارچ 1924ء کو مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کا بھی خاتمہ کر دیا اور ترکی دیگر حکومتوں اور سلطنتوں کی طرح ایک دنیوی حکومت رہ گئی۔ اس واقعہ نے ہندوستان میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑا دی۔ اور وہی مصطفیٰ کمال جو مسلمانوں کا اب تک ہیرو تھا، سب و طعن کا نشانہ بننے لگا۔ کچھ لوگ اس حد تک تجاوز کر گئے کہ اسے اسلام سے منحرف بلکہ اسلام کا دشمن قرار دینے لگے۔ وفاداران حکومت اور انگریز کے پٹھو اخبارات کی خوب بن آئی۔ وہ خوب بغلیں بجاتے اور مضحکہ اڑاتے تھے کہ آخر یہ سب کرنے سے کیا حاصل ہو۔

گاندھی جی جب جیل سے رہا ہو کر آئے تو ان سے بھی لوگوں نے یہی سوالات کیے۔ گاندھی جی نے اپریل 1924ء کے پہلے ہفتہ میں ینگ انڈیا کا چارج لے لیا تھا اور اولین فرصت میں انھوں نے اس موضوع پر ایک طویل مضمون لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا:

> اگر میں کوئی پیغمبر ہوتا اور مجھے غیب کا علم دیا گیا ہوتا اور میں جانتا کہ تحریک خلافت کا یہ انجام ہوگا تب بھی میں خلافت کی تحریک میں اسی انہماک سے حصہ لیتا۔ خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی اب میں پھر اسے سونے نہ دوں گا۔

گاندھی جی کے یہ زریں الفاظ ان لوگوں کے تمسخر کا کافی و شافی جواب ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے تحریک خلافت شروع کرنے میں ایک بھیانک غلطی کی تھی۔ گاندھی جی جن کا اصول سچائی تھا اور جو کبھی حق گوئی سے انحراف نہیں کرتے تھے۔ تحریک خلافت کو ہندوستان کی بیداریٔ عوام کا سبب قرار دیتے ہیں اور تحریک خلافت

کی حمایت میں بس یہ کافی ہے۔

مسلمانوں کا جوش و خروش بدستور قائم تھا۔ خلافت کمیٹیاں کام کر رہی تھیں، جلسے ہو رہے تھے اور کوشش کی جا رہی تھی کہ مصطفیٰ کمال اپنا فیصلہ بدل دیں۔ اپنے کو تسکین دینے کے لیے علم و ذہانت کی پوری طاقت لگ رہی تھی۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس عظیم حادثہ کے بعد ہی ایک مضمون "النبا العظیم" کے عنوان سے لکھا جو خلافت بمبئی اور زمیندار لاہور میں بالقسط شائع ہوا۔ یہ مضمون اگرچہ عزل خلافت ہی سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس میں خلافت کے سلسلہ کے بہت سے مسائل پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ جہاں تک نفس مسئلہ عزل خلافت کا براہ راست تعلق ہے ہم مولانا کی عبارت درج کرتے ہیں:۔

"اسلامی خلافت سے مقصود دراصل حکومت ہے اور خلیفہ وہ ہے جو اس حکومت کا رئیس ہو . . .

اب غور کرنا چاہیے کہ خلافت کی موقوفی سے مقصود کیا ہے؟ کیا یہ ہے کہ آئندہ سے ترکی حکومت موقوف کردی گئی یا آئندہ سے ترکی حکومت ایک مسلمان حکومت نہیں رہے گی؟ کیونکہ یہی دو صورتیں خلافت کی منسوخی ہو سکتی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ترکی کی مسلمان حکومت اب بھی موجود ہے

" انھوں نے ترکی حکومت کو جمہوریت کے نظام میں بدل دیا تھا تو اسلامی نقطۂ خیال سے یہ کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی بلکہ ان مطلوبات میں سے تھا جن کا صدیوں سے مصلحین اسلام کو انتظار تھا۔ لیکن اس کے بعد یہ نہیں ہونا چاہیے تھا کہ حکومت سے الگ خلیفہ کا ایک منصب قرار دیا جائے . . . اگر اصلی عثمانی خاندان کے خلاف نہ ہوتی تو چاہیے تھا کہ جمہوریہ کے صدر عبدالمجید ہوتے۔ اگر وہ اس کے خلاف تھی تو چاہیے تھا کہ جو صدر منتخب ہوتا وہی خلیفہ ہوتا۔ اس کے کوئی معنی نہ تھے کہ اسلام میں پوپ کے روحانی تاج و تخت کا ایک نیا ہیکل تیار کیا جائے۔

"گزشتہ سال جنوری میں جیل سے رہا ہوا ہوں۔ یہ مضمون ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا ہے اور ایسوسی ایٹڈ نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں نے کہا تھا کہ اسلام میں پوپ کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اور ضروری ہے کہ اس معاملہ پر نظر ثانی کی جائے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ مسلمانان ہند نے اس کے خلاف کوئی علانیہ مظاہرہ نہیں کیا کیونکہ ترک ابھی ابھی جنگ سے نکلے تھے۔ صلح کی گفت و شنید مکمل نہیں ہوئی تھی۔ مخالفین ان کی ہر مخالفت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس لیے مصلحت کے خلاف تھا کہ ان کے خلاف عام لوگوں میں ہیجان پھیلایا جائے۔ ضرورت تھی کہ اندرونی طور پر اصلاح حال کی کوشش کی جائے اور آئندہ کے لیے ایک اسلامی نظام قرار پائے۔ چنانچہ اسی غرض سے طے پایا تھا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا وفد انگورہ جائے۔ اس کے

اغراض و مقاصد میں ادلین مقصد اسی غلطی کی اصلاح تھی۔ علاوہ بریں پرائیویٹ طور پر بھی اعیان انگورہ کو ان کی غلطی پر برابر متنبہ کیا گیا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۲۳ء سے اس وقت تک متعدد مراسلات بعض اعیان حکومت کے نام بھیج چکا ہوں اور ان کے عذرات و توجیہات معلوم کر چکا ہوں۔"

مولانا نے نامہ نگار کے ایک سوال کے جواب میں کہ "کیا اب ترکی میں اسلامی خلافت باقی نہیں رہی" جواب دیا کہ:۔

"مجھے تعجب ہے کہ میرا اتنا سا جواب سن کر بھی آپ اسلامی خلافت کا صحیح تخیل پیدا نہ کر سکے۔ خلافت سے مقصود اسلامی حکومت ہے۔ جس وقت تک ترکی میں خود مختار حکومت باقی ہے اور اسے مسلمان حکومت ہونے سے انکار نہیں اس وقت تک اسلامی خلافت بھی وہیں ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسری خود مختار طاقتور مسلمان حکومت موجود نہیں۔ خلافت کوئی مجرد منصب نہیں کہ معزول یا موقوف ہو جائے۔ وہ ایک واقعہ ہے یعنی اسلامی حکومت کی موجودگی۔ جب تک یہ واقعہ غیر واقع نہ ہو جائے ہم اس کے وجود سے کیونکر انکار کر سکتے ہیں۔ البتہ اس صورت میں ہمارا اعتقاد یہ ہوگا کہ موجودہ خلافت ایسے لوگوں کے قبضہ میں آگئی ہے جو ایک سخت غلطی اور گمراہی کے مرتکب ہوئے ہیں اور خلافت کا نظام صحیح نہیں رہا۔ اور اس لیے تمام عالم کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح اور درستگی کی کوشش کریں۔"

آج پچاس سال کے بعد جب ہم یہ بیان پڑھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انتہائی مایوسی میں مولانا یا تو اپنے آپ کو تسکین دے رہے تھے یا ملت اسلامیہ ہند سے مایوسی دور کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ جو دلیلیں مولانا نے دی ہیں وہ ایک لمحہ کا منطقی تجزیہ برداشت نہیں کر سکتیں۔ ترکوں نے اگرچہ اپنے دستور میں یہ لکھ دیا تھا کہ حکومت کا مذہب اسلام ہوگا۔ لیکن صرف اتنا لکھ دینے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ جس نہج پر انگورہ کی حکومت چل رہی تھی اس سے یہ اندازہ کر لینا چنداں دشوار نہ تھا کہ اب وہاں کی حکومت اسلامی حکومت نہ ہوگی۔ مثلاً یک بجنش قلم دینی امور اور اوقاف کی وزارتیں موقوف کر دی گئیں اوقاف کا صیغہ وزارت مال کے سپرد کر دیا گیا۔ اور دینی تعلیم کا انتظام وزیر تعلیم کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ قدیم دینی مدارس جو قسطنطنیہ اور دیگر شہروں کی مساجد میں قائم تھے توڑ دیے گئے۔ اگرچہ عصمت پاشا نے ان امور کی تاویل کی اور مولانا نے بھی یہی سوچا کہ یہ محض اصلاحات ہیں لیکن وہ یہ کہنے سے باز نہ رہ سکے کہ "میں ترکی کی برسر اقتدار جماعت سے اس میں (اصلاحات میں) کچھ زیادہ خوش آئند توقعات نہیں رکھتا۔"

اس لیے کہ حکومت ترکیہ کے سربراہ مسلمان تھے ترکی اسلامی حکومت ہو نہیں سکتی تھی چہ جائیکہ خلافت جس کا

اصل کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ بقول مولانا آزاد چونکہ دنیا میں کوئی دوسری خود مختار مسلم حکومت موجود نہیں ہے اس لیے ایک حکومت ترکی جو باقی رہ گئی ہے وہ خواہ مخواہ مرکز خلافت بن جائے۔ پھر یہ بھی صحیح نہیں تھا کہ کوئی خود مختار مسلم حکومت روئے زمین پر موجود نہیں تھی۔ افغانستان کی خود مختار حکومت عالم وجود میں آ چکی تھی۔ بغرض یہ محض لفظی کھینچ تان تھی اور اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اکابرین ملت اسلامیہ پر یاس و حرمان ناکامی و نامرادی کی بجلی گری تھی اور وہ اسے یک لخت تسلیم کر لینے کے بجائے اپنی تسکین کا سامان فراہم کر رہے تھے۔ ایک بڑی چیز جو مولانا آزاد نظر انداز کر گئے وہ اماکن مقدسہ کی حفاظت اور آزادی کا مسئلہ تھا۔ عرب باغی ہو چکے تھے اور ترک اپنے وجود کی پریشانی میں عرب پر تسلط کا مطالبہ ہی نہیں کر رہے تھے۔ مولانا محمد علی جب لندن وفد لے کر گئے تو انھوں نے وہاں اس نکتہ کو بہت اجاگر کیا تھا اور اس بات کا زبردست مطالبہ کیا تھا کہ عراق عرب یعنی اماکن مقدسہ ترکوں کے تصرف میں رکھے جائیں۔ لائیڈ جارج کا جواب یہ تھا کہ عرب اندرونی آزادی چاہتے ہیں اور وہ ترکوں کی ماتحتی میں رہنا نہیں چاہتے تو ان کو کسی قانون انصاف سے اس پر مجبور کیا جائے۔ مولانا محمد علی کا جواب یہ تھا کہ ان کو اندرونی آزادی دے دی جائے لیکن ترکی کا اقتدار نہ چھینا جائے۔ اسی لیے جب لائیڈ جارج سے وہ مایوس ہوئے تو انھوں نے عرب لیڈروں سے رابطہ پیدا کیا اور ان کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ اپنا موقف بدل دیں اور اندرونی آزادی کے ساتھ ترکوں کے زیر اقتدار رہیں۔ مولانا محمد علی کے دلائل کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ ان کا مذہبی جوش ان کی شخصیت ان کے اصرار کا طریقہ اور ان کے منطقی دلائل سب کو مبہوت کر دیتے تھے اور ظاہری طور پر لوگ کہہ دیتے تھے کہ واللہ باللہ ہم خلافت مرکزیہ اسلامیہ کے خلاف نہیں ہیں اور کبھی شریف مکہ اور کبھی امیر فیصل کا یہ اعلان اخبار میں آجاتا تھا کہ ہم خلافت کے خواستگار نہیں ہیں اور اس غیر متعلق بات کو لوگ خوب پھیلاتے تھے لیکن اصل مسئلہ سے یعنی یہ کہ وہ ترکی کے زیر اقتدار رہنے پر راضی ہیں ہمیشہ اجتناب اور فرار ہی رہا۔ اس لیے ترکی میں خلافت کے قیام کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

ڈاکٹر کے کروجرا اپنی کتاب کمالسٹ ٹرکی اینڈ دی مڈل ایسٹ کے صفحہ 24 پر لکھتا ہے کہ:۔

ترکی نے 1922ء کے نومبر میں سلطانی کو منسوخ اور ترکی کو آزاد جمہوریہ قرار دیا اس کے اسباب حسب ذیل تھے۔

(1) ہندوستانی مسلمان فوجیں شام، فلسطین اور خاص کر میسوپوٹامیہ میں ایک ہم مذہب سے عیسائی افسران کی ماتحتی و نگرانی میں لڑیں اور ایک دفعہ بھی بغاوت یا عدول حکمی کا پیش نہیں آیا۔

(2) زار کے روس میں مسلمان جبراً فوج میں بھرتی سے بری تھے لیکن تاتار ان تاتاری تو شروع جنگ عظیم سے آخر تک انقطاع تاف کے محاذ پہ تو ترکی کے لیے موت و حیات کی جنگ تھی ترکوں کے خلاف

اور روسیوں کی جانب سے اسی طرح لڑتے رہے۔ یہاں بھی کوئی واقعہ بغاوت یا عدول حکمی کا پیش نہ آیا۔

(3) عرب جو سلطنت عثمانیہ کی آبادی کے سب سے بڑے جزو تھے جنگ عظیم کے آغاز کے پہلے سے ترکوں کو پریشان کر رہے تھے اور پوری قوت سے ترکوں کے خلاف دول متحدہ کے ساتھ لڑتے رہے اگر خلیفہ کا حکم نافذ ہوتا تو شام، فلسطین میسوپوٹامیہ، اور تمام ملک عرب اتنی آسانی سے ان سے چھین نہ لیے جاتے۔

(4) مسئلہ خلافت محض جذبات میں رہ گیا تھا۔ اس کا کوئی مادی وجود باقی نہیں تھا۔ صرف وہی لوگ اس کو مانتے تھے جو اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے اس لیے قدرتاً مصطفیٰ کمال نے سبقت لی اور خلافت کا خاتمہ کر دیا۔

احیائے خلافت اسلامیہ کی ایک اور کوشش

عزل خلافت کے بعد ہندوستان میں خلافت کمیٹیاں قائم رہیں اور یہ اسکیم بنتی رہی کہ حکومت انگورہ کو مشورہ دیا جائے وہاں وفد روانہ کیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ خلافت کو قائم کریں۔ ان لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ خود مصطفیٰ کمال کو خلیفۃ المسلمین بنا دیا جائے لیکن یہ سب خواب تھے جو نہ شرمندہ تعبیر ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے۔

انگریزوں نے عالم اسلامی کے رائے عامہ کے دباؤ سے نجد اور حجاز پر حکم برداری قائم نہیں کی اس کامیابی میں ہندوستان کی تحریک خلافت کا کافی حصہ تھا اور یہ اصل طرۂ امتیاز تحریک خلافت کی خدمت اسلام کا تھا۔

1924ء میں نجد کے شہزادہ عبدالعزیز نے حجاز پر حملہ کر کے طائف اور مکہ پر قبضہ کر لیا۔ نجد کے شہزادہ عبدالعزیز کے خاندان اور شریف مکہ کے خاندان سے پرانی عداوت تھی۔ اب شریف مکہ کے خلاف جو عام بیزاری پیدا ہوئی تو اس کا فائدہ شہزادہ عبدالعزیز کیوں نہیں اٹھاتے۔ اور فوراً ہی یا کچھ دنوں کے اندر وہاں کے تمام بزرگوں کے مزارات مقابر کے ساتھ مسمار بھی ڈھا دیے گئے۔ حتیٰ کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا مزار بھی مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا روضہ بھی گرا دیا گیا۔ غدار شریف حسین کی ہزیمت سے سب کو خوشی ہوئی تھی اور اب مولانا محمد علی نے یہ امید قائم کی کہ حجاز میں عالم اسلامی کے مشورے سے ایک حکومت الٰہیہ قائم کی جائے اور اسی کو مرکز خلافت قرار دیا جائے۔ اور چونکہ اماکن مقدسہ سب یہیں تھے اس لیے بات مناسب نظر آتی تھی۔ یہ امید اس لیے بھی قائم ہوئی تھی کہ سلطان عبدالعزیز نے اعلان

کیا تھا کہ ان کو حکومت کی خواہش نہیں ہے۔ شریف حسین کے نکل جانے کے بعد مسلمان جس کو چاہیں امیر منتخب کرلیں۔ ہمارے ملک کے مسلمان رہنما جو دوسری اسلامی سلطنتوں کو مشورے دینے میں انتہائی فیاض واقع ہوئے تھے شہزادہ عبدالعزیز کو صلاح دی کہ وہ خلافت الٰہیہ حجاز میں قائم کریں اور وہاں ایک جمہوری حکومت بنائی جائے۔

شاہ معین الدین احمد لکھتے ہیں:۔

"حجاز میں سلطان عبدالعزیز کے قبضہ کے بعد یہ خبر مشہور ہوگئی کہ نجدی فوجوں نے طائف میں قتل عام کیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا روضہ اطہر مسمار کر دیا ہے۔ مکہ پر بھی مظالم کیے ہیں اور یہاں کے مشاہد کو ان کے ہاتھوں نقصان پہنچ جانے کا خطرہ ہے۔ نجدیوں کے بعض عقائد سے عام مسلمان پہلے سے بدگمان تھے اس لیے اس خبر سے اور تشویش بڑھ گئی اور جمعیۃ الخلافت نے حرمین کے تحفظ ان کے احترام اور قیام امن کے لیے سلطان عبدالعزیز شریف علی جمعیۃ الاقوام برطانیہ اور دوسری طاقتوں کو تار دیے۔"[1]

یہ مجلس ہے کہ شریف حسین اپنے لڑکے شریف علی کے حق میں دستبردار ہوگئے تھے اور شریف علی نے جدّہ میں جاکر قیام کیا تھا۔

شریف علی نے جواب دیا کہ وہ خود حجاز میں امن و امان چاہتے ہیں اور محض حرم کو خونریزی سے بچانے کے لیے وہ مکہ سے جدّہ چلے آئے ہیں۔ اور یہ خواہش کی کہ کوئی شخص درمیان میں پڑکر دونوں میں صلح کرادے اور سلطان عبدالعزیز نے اپنا مقصد سلطان شریف حسین اور ان کی ذریت سے حجاز کو پاک کرنا بتایا تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ "میرا مقصد مکہ معظمہ پر قبضہ نہیں ہے بلکہ وہاں کے باشندوں کو مظالم اور ناقابل برداشت ٹیکسوں سے نجات دلانا اور مہبط وحی و الہام میں شریعت کا احیاء اور احکام الٰہی کا نفاذ ہے۔ مکہ سے جملہ مسلمانان عالم کا تعلق ہے اس لیے وہاں کی پالیسی دنیائے اسلام کی مرضی کے مطابق طے ہوگی۔ ہم ان سب کی نمائندہ کانفرنس مکہ میں منعقد کریں گے اور اس مسئلہ پر ان کی رائے لی جائے گی جس سے بیت اللہ گناہوں اور ذاتی اغراض کی تحریکوں سے محفوظ ہو جائے۔"[2]

بس اس اعلان کا ہونا تھا کہ عاشق اسلام وفدائے خلافت الٰہیہ مولانا محمد علی جوش مسرت میں آپے سے

---

[1] حیات سید سلیمان ص 23

[2] حیات سید سلیمان ص 23

باہم ہوگئے اور سلطان عبدالعزیز کی پرزور حمایت شروع کر دی۔ اس حمایت میں ان کے ہمنوا وہ تمام لوگ تھے جو غیر مقلدانہ خیالات رکھتے تھے۔ لیکن بریلوی حضرات خواجہ حسن نظامی خانقاہوں کے پیر اور خود ان کے پیرومرشد حضرت مولانا عبدالباری ان کے خلاف ہوگئے۔ مولانا حسرت موہانی نے مولانا عبدالباری کے ساتھ ہوکر ایک زبردست محاذ قائم کر دیا۔ اب مولانا محمد علی تھے اور یہ دنیا بھر کی مخالفتیں۔ اگر وہ اپنی زبان اور قلم پر ذرا قابو رکھتے تو بات بنی نہ بگڑتی مگر ان کی یہ فطرت نہ تھی۔ زبردست معرکہ پیدا ہوا اور مولانا محمد علی کو وہابی کا لقب بھی عطا ہوگیا۔ اب جو قبوں کے انہدام کی خبریں آئیں تو پورا ہندوستان ماتم کدہ بن گیا۔ شیعہ حضرات نے بڑے زور و شور سے زنجیری ماتم لکھنؤ میں کیا۔ آخر حکومت کو دفعہ ۱۴۴ نافذ کرنی پڑی۔ صفی لکھنوی نے لکھا ہے

مدینہ ڈھایا مکہ ڈھایا نجدی بدخصالوں نے　　وہ کافر بھی نہ کرتے جو کیا اسلام والوں نے

مولانا عبدالماجد بدایونی جو ہندوستان کے ممتاز علماء اور قائدین تحریک خلافت میں تھے کہتے تھے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی چکی سلطان ابن سعود نے توڑ ڈالی۔ اس چکی سے کیا بت پرستی ہوتی تھی۔ اگر لوگ ازراہ محبت اسے چومتے تھے تو یہ توحید اسلام پر ضرب کس طرح ہے اور مانا کہ ہے تو جرمنی کے ہاتھ ایک کروڑ روپیہ میں بیچ دینے توڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی جو ایک محقق اور روشن خیال علماء میں مشہور ہوتے تھے سلطان ابن سعود کے سامنے جو تقریر کی اس سے اندازہ ہوگا کہ جذبات کی گہرائیاں کیا تھیں۔ آپ نے فرمایا:۔

"مذہبی حیثیت سے مقابر و مآثر کی حیثیتیں الگ الگ ہیں۔ مقابر کی تعمیر و بنا کے متعلق احادیث و فقہ میں ممانعت کے صریح الفاظ ملتے ہیں لیکن مآثر یعنی وہ مقامات مقدسہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے کوئی خاص نسبت ہے ان کی حفاظت یا ان کی تعمیر و بنا کی ممانعت سے احادیث نبوی کا تمام دفتر خالی ہے۔ لہٰذا مآثر میں اگر جاہل مسلمان ایسے اعمال کریں جو خلاف شرع ہوں تو دوسری چیزوں کی طرح حکومت کا فرض ہے کہ وہاں نگراں یا پولیس کے سپاہی مقرر کرے جو زائرین کو ان اعمال سے باز رکھیں"

مولانا محمد علی کا عذر یہ تھا کہ سلطان عبدالعزیز کی عدم موجودگی میں یہ قبے گرائے گئے ہیں اور ان کو کوئی علم اس کا نہیں ہوا۔ اب مسائل کی بحث چلی۔

(۱) کیا مزارات پر قبے بنانا جائز ہے؟

(۲) اگر ناجائز ہے اور بن گئے تو کیا ان کا گرانا جائز ہے؟

(3) اور اگر گرا دیے گئے تو کیا پھر ان کا بنانا جائز ہے؟

مارچ 1926ء میں علامہ سید سلیمان ندوی نے معارف کے شذرات میں لکھا:

"گزشتہ ملکی تحریک سرد پڑ جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں پھر فرقہ آرائیوں اور ہنگامہ آرائیوں کی گرم بازاری ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کے لیے گویا نجد و حجاز کی جنگ خود ہندوستان میں ہو رہی ہے۔ وہاں اگر تیغ و تفنگ کی لڑائی ہے تو یہاں حق و زبان و دست و قلم کی معرکہ آرائیاں ہیں۔ وہاں اگر یہ مسئلہ سیاسی و وطنی حیثیت رکھتا ہے تو یہاں دین و مذہب کی۔ مگر اے کاش ہماری قوم کو یہ معلوم ہو سکتا کہ ہم جن کی تائید میں مذہبی دعووں اور حجتوں سے جذبات ابھار رہے ہیں ان کی نگاہ میں اس کی کیا وقعت ہے۔"

جمعیۃ خلافت نے ایک وفد علامہ سید سلیمان ندوی کی قیادت میں روانہ کیا جس کے اراکین مولانا عبد الماجد بدایونی اور مولانا عبد القادر قصوری بھی تھے۔ اس طرح یہ وفد پورے ہندوستان کی نمائندگی کرتا تھا۔ مگر شریف علی نے جمعیۃ خلافت کی اس تجویز کو کہ حجاز میں اسلامی جمہوری حکومت عالم اسلامی کی رائے سے قائم ہو نامنظور کر دیا اور وفد کو آگے جانے کی اجازت نہ دی اور وفد واپس آیا۔

نجد و حجاز کی لڑائی جاری تھی اور ہندوستان میں گرم بحثیں ہو رہی تھیں کہ اچانک مستند خبر رساں رپورٹر نے یہ خبر دی کہ سلطان عبد العزیز نے مدینہ منورہ میں روضہ مبارک پر گولہ باری کر دی ہے۔ اب تو بڑا ہنگامہ پیدا ہوا جو مولانا محمد علی کے بھی بس کا نہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ اصل حالت کی جانچ وہاں جو وفد مقیم ہے اس سے کرائی جائے مگر کون سنتا تھا۔ بالآخر یہ پتہ چلا کہ روضہ مبارک پر نہیں مدینہ منورہ میں کسی دوسری جگہ اثنائے جنگ میں گولہ باری ہوئی تھی مگر یہ سب تحقیق تو بعد کو ہوئی۔ اس زمانہ میں سلطان ابن سعود سے مخالفت بہت بڑھ گئی تھی کہ ایک جماعت غدار شریف حسین کی پرزور طرفداری ہو گئی۔ ان میں بریلوی اور خانقاہوں کے سجادہ نشین آگے آگے تھے۔ خیر یہ جماعت تو زیادہ موثر نہ ہو سکی لیکن مولانا عبد الباری جن کا تمام ہندوستان میں بڑا وزن تھا میدان میں آ گئے اور ان کے ساتھ مولانا حسرت موہانی، مولانا عبد الماجد بدایونی، مولانا نثار احمد کانپوری وغیرہ تھے۔ دوسری طرف مولانا محمد علی، ظفر الملک، چودھری خلیق الزماں۔ دونوں کا مرکز لکھنؤ تھا۔

چنانچہ عبد الباری کے ایما سے ایک انجمن خدام الحرمین قائم ہوئی۔ اس انجمن میں شیخ مشیر حسین قدوائی، سید جالب دہلوی بھی شریک تھے۔ ارباب فرنگی محل تو تھے ہی جو بذات خود بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے ایک عظیم الشان جلسہ رفاہ عام میں کیا اور دل کھول کر سلطان ابن سعود کو برا بھلا کہا اور جب بعدہ مولانا محمد علی نے وہاں جلسہ کرنا چاہا تو وہ کامیاب نہیں ہوئے اور مجمع نے ان کی تقریر سننے سے

دو بار دو جلسوں میں انکار کر دیا۔ اللہ اللہ، یہ وہی محمد علی ہیں جن کے لیے قوم آنکھیں بچھاتی تھیں چراغاں کرتی تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلم قوم کو مخاطب کر کے کیا خوب فرمایا:

"تم جس تیزی سے دوڑ کر آتے ہو اسی تیزی سے فرار بھی کر جاتے ہو پس نہ تمہاری تحسین کی کوئی قیمت نہ تمہاری توہین کا کوئی وزن۔ تم نہ دل رکھتے ہو نہ دماغ۔ وساوس ہیں جنھیں افکار سمجھتے ہو۔ خطرات ہیں جنھیں عزائم کہتے ہو۔"

اس بحث و تکرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ اودھ میں دو خلافت کمیٹیاں قائم ہو گئیں۔

سلطان عبدالعزیز کو جمعیۃ خلافت نے تار دیا تو انھوں نے جواب دیا کہ مقابر و آثار و مشاہد کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ ان کا مقصد حجاز میں اپنی حکومت قائم کرنا نہیں ہے بلکہ حرم کی تطہیر اور شریف حسین کے مظالم سے اہل حجاز کو نجات دلانا ہے۔ حجاز پر قبضہ کے بعد وہ دنیائے اسلام کے مشورے سے حکومت کا نظام بنائیں گے اور اس غرض کے لیے انھوں نے دعوت نامہ بھی جاری کر دیا ہے۔ ایک وفد ہندوستان سے موتمر اسلامی کے انعقاد کی تجویز لے کر گیا۔

بحثیں اور گفتگوئیں جاری رہیں آخر کار جب 1925ء تک عبدالعزیز نے کل حجاز کو فتح کر لیا تو قاہرہ کے ایک تار مورخہ 10 جنوری 1926ء سے اچانک اہالیان ہند کو معلوم ہوا کہ ابن سعود نے ملک النجد والحجاز ہونے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ 24 اکتوبر 1924ء کو خلافت کمیٹی کی تجویز کا جواب سلطان ابن سعود یہ دے چکے تھے کہ آخری فیصلہ دنیائے اسلام کے ہاتھ میں ہے۔ بہر حال پھر بھی سلطان عبدالعزیز نے مصر، بیروت، شام، فلسطین، سوڈان، عسیر، نجد، یمن، روس، ترکی، افغانستان، جاوا اور ہندوستان کو دعوت نامے جاری کیے۔ ہندوستان میں دعوت نامے تین جماعتوں کو بھیجے گئے تھے جمعیۃ علماء ہند، جمعیۃ خلافت اور اہلحدیث کانفرنس۔ چنانچہ جمعیۃ العلماء کا وفد مفتی کفایت اللہ کی قیادت میں تیار ہوا اس کے اراکین مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد سعید اور مولانا عبدالحلیم تھے۔ جمعیۃ خلافت کے وفد کے رئیس علامہ سید سلیمان ندوی اور اراکین مولانا محمد علی مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی تھے۔

اس وفد کے اراکین مئی 1926ء میں جدہ پہنچے دوسرے دن مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ 27 کو سلطان سے ملاقات ہوئی۔ حسب عادت مولانا محمد علی نے پرزور بے باک اور جذباتی تقریر کی مگر واضح ہو گیا کہ عبدالعزیز سلطان نجد و حجاز بن چکے ہیں اور اس میں کسی قسم کا تغیر نہ ہوگا۔ 30 مئی کو مولانا سید سلیمان ندوی، مفتی کفایت اللہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی پھر سلطان سے ملے اور کہا کہ مدینہ منورہ کے مقابر و مشاہد کے متعلق ہم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ موتمر اسلامی کے فیصلے کے بغیر ان کے بارے میں کوئی اقدام نہ کیا جائے

کا لیکن ان کی خلاف ورزی کی گئی، اور دنیائے اسلام کے جذبات کے خلاف ان کے استصواب کے بغیر ان کو منہدم کر دیا گیا۔ سلطان نے جواب دیا کہ اگر ہم مزارات کو منہدم نہ کرتے تو ہماری قوم باغی ہو جاتی اور ان کا مطالبہ غیر شرعی بھی نہ تھا۔ سلطان نے یہ بھی کہا "آپ نے جو کچھ کہا وہ صحیح ہے میں بھی دل سے یہی چاہتا تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ آپ لوگ ہماری قوم سے واقف نہیں ہیں۔ ان کے متعصب قبائل نے دھمکی دی کہ ہم نے جہاد میں اپنا جان و مال قربان کیا تھا کہ مراسم شرک کا استیصال اور قرآن و سنت کو قائم کیا جائے اس لیے جلد سے جلد ان عمارتوں کو منہدم کر دیا جائے ورنہ ہم خود ان کو گرا دیں گے۔ اس دھمکی کے بعد ہمارے لیے دو صورتیں تھیں یا ان کو بزور روکتے یا گرانے کی اجازت دیتے۔ پہلی صورت میں خانہ جنگی کا اندیشہ تھا دوسری صورت میں فتنہ و فساد کا جس سے اہل مدینہ کو کسی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑتا اور دوسری جماعتوں کو بھی صدمہ پہنچتا۔ ان کا مطالبہ غیر شرعی بھی نہ تھا بلکہ خدا اور رسول کے حکم اور کتاب و سنت کے مطابق تھا۔ اس لیے میں نے قاضی القضاۃ سے خواہش کی کہ وہ خود مدینہ جا کر اس کام کو انجام دے دیں جو چیز خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ہے۔ اس میں اختلاف نہ ہونا چاہیے۔

سلطان کا یہ بیان گو بیانات سے قطعی مختلف نہ تھا لیکن منطقی تھا جب ان لوگوں نے کیا تھا ان کی عدم موجودگی میں بلا ان کے علم و اطلاع کے سب ہوا ہے اور جس پر مولانا محمد علی نے بڑا غصہ کیا تھا۔

مولانا محمد علی کے دل میں تو آگ جل رہی تھی۔ بڑی امیدوں سے وہ یہاں آئے تھے۔ ان کی غرض تھی کہ یہاں اسلامی جمہوری حکومت قائم ہو جائے اور مزارات دوبارہ تعمیر ہو جائیں۔ لیکن یہاں یہ حال ہوا کہ:

بڑی آرزو تھی گلی کی تری　　　سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

دونوں میں ناکامی دیکھ کر وہ اہل نجد سے حق گوئی سے باز رہنا تو ان کا شیوہ ہی نہ تھا۔ اور اسی سبب تمام عمر بھگتتے رہے۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے سلطان سے کہا کہ "آپ سے دنیائے اسلام کی بڑی توقعات تھیں اور وہ آپ کو ملک الحجاز کے منصب سے کہیں زیادہ جلیل القدر منصب پر دیکھنا چاہتے تھے۔ سلطان اس چھوٹے سے منصب پر کیوں راضی ہو گئے اور انھوں نے اس کو کیوں اپنا مطمح نظر بنایا۔ اردو کا یہ شعر

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے　　　آنکھوں میں وہ قطرہ ہے جو گوہر نہ ہوا تھا

پڑھ کر کہا کہ وہ قطرہ جو صدف میں جا کر موتی بننے پر قانع ہے، پیرس کے رقاصہ کے گلے کی زینت بھی بن سکتا ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ سلطان وہ قطرۂ آب ہوں جو ایک مسلمان کی آنکھ سے آنسو بن کر روضہ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر گرایا جائے۔" مولانا سید سلیمان ندوی نے تاثر اور مشاہدے کے فرق کو پھر نمایاں کیا، اور حادثہ

کے حوالے سے مأخذ کے قیام دبقا کی ضرورت واضح کی۔ یہ تقریر اتنی عالمانہ فاضلانہ اور پرمغز تھی کہ اس کا جواب کسی سے نہ بن پڑا۔ سلطان نے کہا کہ میں مذہبی عالم نہیں ہوں۔ اس بات کو آپ مجلس علماء میں پیش کیجیے۔

چنانچہ 31 مئی 1926ء مجلس العلماء کا انعقاد ہوا۔ یہاں علامہ رشید رضا مصری نے سلطان کی مدح وثنا میں تقریر کی اور پھر چہار جانب سے یہی سلسلہ شروع ہوگیا اور علامہ سید سلیمان ندوی نے جو مذہبی اور علمی بحث چھیڑی تھی اس کا کسی نے نوٹس نہ لیا۔ نہ جواب دیا اور نہ بحث کی۔ مثل مشہور ہے کہ کامیابی سے بڑھ کوئی چیز کامیاب نہیں ہوتی۔ حکومت بنا لینے کے بعد انھیں کسی کی کیا فکر تھی۔ مگر اس نظر انداز کردینے کی اہانت مولانا محمد علی برداشت نہ کرسکے تلملا اٹھے اور ایک پرزور تقریر کی۔ کہا کہ:

"ہم ان کتاب وسنت کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ آپ ملوکیت چھوڑ کر جمہوریت اختیار کیجیے اور قیصر وکسریٰ کی سنت کے بجائے صدیق وفاروق کی سنت کو تازہ کیجیے۔"

یہ نعرہ مستانہ کتنا عجیب اور کتنا بہار راز تھا۔ مولانا عبدالعلیم مفتی کفایت اللہ نے دوسرے فرقوں کے ساتھ رواداری برتنے پر تقریریں کیں۔ ان تقریروں سے سلطان اور قاضی القضاۃ بہت مشتعل ہوگئے۔ اور معاملہ کی کیا نوعیت ہے سب پر ظاہر ہوگئی لیکن پھر بھی وقتاً فوقتاً اسی طرح اجلاس ہوتے رہے۔ تقریریں ہوئیں۔ کچھ تجویزیں منظور ہوئیں جو بہرحال مفید تھیں لیکن قیام خلافت وقیام نظام جمہوریت کا اصل مقصد ناکام رہا اور ناکام وفد اواخر جولائی 1926ء میں واپس آیا۔ مولانا محمد علی کی یہ آخری کوشش جس کے لیے انھوں نے اپنوں اور بیگانوں کی طنز وتضحیک برداشت کی برباد ہوگئی اور دنیا میں قیام خلافت کا اب کوئی امکان باقی نہیں رہا لیکن خلافت کمیٹی پھر بھی باقی رہی۔ اس سے پہلے ہی جوش ختم ہوچکا تھا۔ چنانچہ آخر دسمبر 1925ء میں خلافت کانفرس کا جلسہ کانپور میں ہوا تھا کوئی جوش وخروش نہ تھا۔ لوگ مرجھائے ہوئے تھے جبکہ اس سے قبل چراغاں تک کیا جاتا تھا۔ لوگ سوچتے تھے کہ ع

اب کیا رہا ہے جس پہ رقیبوں کا غم کریں

اس وقت وہاں لوگوں نے اصلاحی کاموں پر توجہ مبذول کرنے کی ٹھان لی تھی اور سب سے زیادہ تعلیم کی جانب رجوع ہوئے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام یک گونہ تسکین کے لیے کافی تھا۔ اب سب نے محسوس کیا کہ مسلمانوں میں دماغی انقلاب لانے کی ضرورت ہے تب کوئی بڑا کام کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ طے ہوا کہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں تک میں مکاتب دارالمطالعہ اور مدارس شبینہ قائم کیے جائیں۔ اس طفل تسلی پر احساس ختم ہوا لیکن بعدہٗ اس محاذ پر کبھی ادنیٰ ترین توجہ بھی کسی نے نہ دی اور نہ اس کو ادوارات

ضروریات واسباب ووسائل پر غور کیا۔ ایک سنہری تجویز جو انتہائی مایوسی کے عالم میں منظور کی گئی تھی اور کاغذ کے قلوب کو قدرے سکون دینے کے لیے درج کر دی گئی تھی اور بس۔

خلافت کانفرنس لکھنؤ

یہ حال تو دسمبر 1925ء کا تھا جب جون 1926ء میں وفدِ خلافت حجاز سے ناکام واپس آیا تو اب کوئی اسکیم کسی کے پاس نہ تھی لیکن قائدینِ خلافت اب بھی اصول کو تھامے ہوئے تھے اور تحریک کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس کا نہایت پُر اثر اور صحیح نقشہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے کھینچا ہے۔ جس کے جستہ جستہ فقروں کو نقل کر دینے کے بعد کسی تنقید کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ یہ 1927ء ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

> خلافت والے یہ دن کو بیٹھے کون تھا۔ سارا جوش و خروش 1921ء اور 1923ء تک ختم ہو چکا تھا۔ یہ کچھ تو 1924ء اور 1925ء تک ساتھ دیتا رہا۔ اب کہیں خلافت کانفرنس ہوتی تھی اور نہ خلافت کے مرکزی ہاتھ رہ گئے تھے۔ ایک خواب شیریں تھا جسے دیکھنے کے بعد مسلمان عرصہ ہوا کب کے جاگ چکے تھے۔ شوکت علی غریب بمبئی میں مرکزی خلافت کمیٹی کو سینے سے چمٹائے بیٹھے تھے۔ ... بہرحال 1926ء کے آخر میں مرکزی خلافت کمیٹی نے طے کیا کہ خلافت کانفرنس کا جلسہ ایک بار پھر ہو اور بہتر ہے کہ اس کے ضمیمے کے طور پر موتمر عالم اسلامی کا جلسہ بھی رکھ لیا جائے۔ خلافت کے صدر سیٹھ چھوٹانی طے پائے اور موتمر کے صدر حکیم اجمل خاں۔ مقام اجلاس کے لیے قرعۂ فال لکھنؤ کے نام پڑا اور تاریخیں آخر فروری 1927ء کی قرار پائیں۔ ہم سب دلشدوں اور کارکنوں کی ٹولی جب لکھنؤ پر دوڑ پڑی اور جلوس بازار سے نکلا تو مجھے دیر گنج کی ایک بوڑھیا کا فقرہ نہیں بھولتا جس نے یہ مختصر جلوس دیکھ کر دو بولی "اے لو خلافت پھر نکلی" عوام کے دل سے اس کا تصور مٹ چکا تھا اب جو نام سنا تو جیسے بھولا ہوا خواب پھر یک بیک یاد آ گیا![1]

اور وہ خلافت کمیٹی کے صدر مولانا عبدالماجد دریابادی تھے ان ہی کو مجلس استقبالیہ کا صدر مقرر کیا گیا۔

اب پھر مولانا ہی کا بیان سنیے۔

> "بارات کے دولہا اب بھی وہی دو بھائی (علی برادران) تھے۔ تحریک خلافت کا دم واپسیں تھا۔ خلافت خود بھی مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں خلافت کمیٹی کی روح رواں کا سہرا بھی دو بھائی تھے۔ اتفاق سے خلافت کانفرنس کے صدر منتخب تھے اور موتمر عالم اسلامی کے صدر منتخب۔ سیٹھ صاحب

---

[1] محمد علی حصہ اول ص 395

کی قائم مقامی مولوی حاجی شفیع داؤدی مظفرپوری نے کی۔ حکیم اجمل خاں کی جانشینی ڈاکٹر انصاری کے حصہ میں آئی:

"ذیل میں اپنا پورا خطبۂ مجلس استقبالیہ درج کیے دیتا ہوں، جس سے ایک اجمالی خاکہ اس دور کی سیاست اور اس وقت کے مسائل کا نظر کے سامنے آجائے گا (ہم اس کے جستہ جستہ فقرے نقل کریں گے)

"آج مختلف سمتوں سے یہ صدائیں بلند ہو رہی ہیں کہ اب خلافت کمیٹی کی ضرورت کیا باقی رہی اور کچھ ضرورت ہو بھی تو کیا ضرور ہے کہ اس کو اسی نام کے ساتھ باقی رکھا جائے۔ حیران ہوں کہ ان سوالات کا کیا جواب دوں۔ اس سے زیادہ بڑھ کر حیرت یہ ہے کہ یہ سوالات کسی مسلمان کے دل میں پیدا کیونکر ہوئے۔

"ہم سے پوچھا جاتا ہے طنز و بے دردی کے لہجہ میں پوچھا جاتا ہے کہ اب تک خلافت کمیٹی نے کیا کیا ہے۔ سوال ہم سے پوچھا جاتا ہے اس کا جواب ہم دیں؟ اس کا جواب اگر لینا ہے تو انگریزی عدالتوں کے در و دیوار سے پوچھو، پولیس کے رجسٹروں سے پوچھو، جیل خانوں کے در و دیوار اور پھاٹکوں سے پوچھو، وہ بے کس بنی ہوئی ہتھکڑیوں سے پوچھو اور ڈاکوؤں اور خونیوں کے سروں پر تنے دن بھر کی بھاری بیڑیوں سے پوچھو۔ اس کا جواب مصر سے، فلسطین سے، حجاز سے، ترکی سے، افغانستان سے، جاوا سے، جزائر اور تمام اسلامی ملکوں سے اور ساری دنیائے اسلام سے لو، اور اس پر بھی تشفی نہ ہو تو اللہ کے پاک فرشتوں کی زبان سے سنو اور انھیں آپس میں یہ چرچا کرتے ہوئے سنو کہ جب آزمائش کا وقت آیا، جب خلافت اسلامیہ کے لیے خطرے کی گھڑی آئی، جب اسلام کی موت و زیست کا سوال پیش ہوا تو اس وقت اللہ کے نام پر، اس کے آخری رسول کے پیام پر، اس کی شریعت کے احترام پر اپنا مال لٹا دینے والے، اپنی عزتیں اور شہرتیں قربان کر دینے والے، اپنا عیش و آرام نثار کر دینے والے، اپنی دنیا تاراج و برباد کر دینے والے، اپنی جانوں کو اپنی ہتھیلیوں پر رکھ کر لبیک کہنے والے، بیڑیاں پہننے کے شوق میں، طوق و زنجیر کے ذوق میں ننگے اور بھوکے رہنے کے اشتیاق میں، پھانسی کے تختہ پر چڑھنے کی تمنا میں، سینہ پر گولیاں کھانے کی طلب میں، میدان میں اپنی تڑپتی ہوئی لاشوں کو بے گور و کفن چھوڑ کر جانے کے ارمان میں جو خاک کے پتلے سب سے پہلے آگے بڑھے وہ غلام ہندوستان کے غلام مسلمان، وہ مجبور ہندوستان کے مجبور امتیان رسول، وہ اسی ظلمت کدہ کے بسنے والے خدمت گزاران خلافت ہی تھے۔ زود فراموش انسان، حیلہ باز انسان اور صبر و ضبط سے گھبرا جانے والا انسان ممکن ہے کہ ان واقعات کو آج بھول جائے یا قصداً بھلا دے لیکن اوراق لیل و نہار پر، روئے زمین کے ذرات پر، صحیفۂ کائنات کے ایک ایک صفحہ پر جس وقت تک ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فداکاری، اسماعیل ذبیح اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قربانی اور حسینؓ ابن علیؓ کے ذوق شہادت کے واقعات ثبت ہیں۔ اس وقت تک ان نامور سرداروں کے ادنیٰ سپاہیوں، خلافت اسلامیہ کے خدمت گزاروں اور تحریک خلافت کے

ظلم پروردوں کی حقیر و ناچیز کوششوں کا نقش صفحۂ ہستی سے مٹ نہیں سکتا۔"

آخر میں مولانا دریاآبادی نے خلافت کمیٹی کے دو کام بتائے۔

(۱) خلافت کمیٹی کو بقدر وسعت و مقدرت کے موافق آج خلافت راشدہ کی جانشینی کرنا ہے اس لیے اس کے حدود میں ساری دنیائے اسلام آجاتی ہے۔ ہندوستان بھی ہندوستان کے باہر بھی۔ لیکن اس کا اصلی اور مرکزی تعلق قدرتاً اسلام کے مرکز اصلی سے ہے...... ہندوستان پر اگر کوئی مصیبت آئی تو وہ یقیناً ہماری مصیبت ہوگی۔ ترکی و مصر و افغانستان و مراکش میں ہمارے بھائیوں کو دکھ پہنچے تو وہ دکھ بھی ہمارا دکھ ہوگا۔ لیکن اگر خدانخواستہ اس مرکز اسلام قبلۂ دین مرکز ایمان کو ذرا بھی گزند پہنچی تو یہ ہمارے جسم کا صدمہ نہ ہوگا، خطرہ ہوگا ہماری جان کا، ایمان ہوگی ہماری روح کی، صدمہ ہوگا ہمارے ایمان کا!... ہمارے ایمان پر سینکڑوں ہندوستان اور ہزاروں افغانستان، مصر و مراکش اور بے شمار ترکی قربان ہیں۔ اس ارض پاک کے چپہ چپہ پر نثار ہیں۔ اس دیار حبیب کے ذرہ ذرہ پر کروڑوں کا شمار۔ اگر یہ کہہ کر بھی کہ "برطانوی قوم کو برطانیہ کی سلطنت جس حد تک قبول ہے مگر شیکسپیئر سے دست بردار ہونا قبول نہیں"، دانا وں میں باقی رہ سکتا ہے تو ایک مسلمان بھی ارض حجاز کے متعلق اس واجب عقیدت کو بیان کرنے سے نادانوں کے زمرہ میں نہیں آجاتا۔ لیکن اگر یہ نادانی ہے تو اس پر ہزاروں دانائیاں قربان اور اگر جنون ہے تو اس جنون پر ہزاروں خردمندیاں تصدق۔"

آج اس ارض نور کے مطلع پر... ملوکیت اور استبداد کا بادل چھایا ہوا ہے اس کو جائز و مناسب تدبیروں سے دور کرنا اور سرزمین قبلہ کو پھر اہل قبلہ کے سپرد کر دینا خادمان خلافت کا پہلا اور سب سے بڑا فرض ہو۔ چاہیے یہ جائز و مناسب تدبیریں کیا ہیں اور کیونکر اختیار کی جائیں اس کا فیصلہ کرنا قوم کے ارباب حل و عقد کا فرض ہے۔

(۲) ارض حجاز کی اس خدمت کے ساتھ ہی ساتھ خود اپنے وطن میں کام کا نہایت وسیع میدان موجود ہے۔ مشکل کیا ہے کہ ایک طرف موتمر کے ذریعہ ہم خدمت حجاز میں لگے رہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ دوسری طرف اپنے ملک میں اپنی تعلیمی، تنظیمی، معاشرتی، سیاسی، دینی ہر قسم کی کوششوں کو بھی جاری رکھیں۔ ہر ہر مقام پر لڑکوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے رہیں۔ بے روزگاروں کو روزگار سے لگائیں۔ دکانیں کھلوائیں۔ چرخہ اور کھدر کی ترویج کرتے رہیں۔[1]

اتنا لکھ کر شاید مولانا کو خیال آیا کہ ان کاموں کے لیے تو اور بھی انجمنیں پہلے سے موجود ہیں چنانچہ فرمایا کہ خلافت کمیٹی کسی کی حریف و رقیب نہیں ہے اور اس لیے مسلم اور غیر مسلم تمام انجمنوں کی جانب اشتراک کا ہاتھ بڑھایا جائے۔

---

[1] محمد علی حصہ اول ص 395

ان سب کا منشا یہ ہے کہ خلافت کمیٹی کو مولانا محمد علی زندہ رکھنا چاہتے تھے اور حجاز میں اسلامی جمہوریہ سلطنت یہ بالفاظ دیگر خلافت الہیہ کے قیام کی سعی کرنا اب بھی چاہتے تھے۔ مولانا محمد علی نے یہ غور نہیں کیا کہ اگر سلطان ابن سعود راضی بھی ہو جاتے تو حجاز میں خلافت الہیہ کا بار اٹھانے کی طاقت نہیں تھی۔ مسلمان حکومتوں کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ یہ جلے بھی ہوئی شمع کی آخری لو تھی اور اس کے بعد اگرچہ خلافت کمیٹی برائے نام قائم رہی اور اب بھی کہیں کہیں یہ نام سنا جاتا ہے۔ لیکن اصلاً و عملاً خلافت کمیٹی کا کام ختم ہو چکا تھا اور وہ از سر نو زندہ نہ ہو سکی۔ لیکن جو اہل دل ہیں وہ ان کے بانیوں اور کارکنوں کے بارے میں یہی کہیں گے ؂

بنا کر دند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن خدا رحمت کند بر عاشقان پاک طینت را

ایک آخری سوال

اس سے پیشتر ہم لکھ چکے ہیں کہ مہاتما گاندھی جو ایک مذہبی آدمی تھے اور اپنے کو سناتن دھرمی کہتے تھے اور پنڈت مدن موہن مالویہ جو ہندو قوم کے مسلّم لیڈر اور بڑے ہی دھارمک انسان تھے نے کرو شنکر آچاریہ، آریہ سماج کے لیڈر سوامی شردھانند اور دوسرے کل ہند سیاسی لیڈروں مثلاً پنڈت موتی لال ... سی۔ آر۔ داس اور لالہ لاجپت رائے وغیرہ نے بقائے خلافت میں مسلمانوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ یہ ایک بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ خلافت کے قیام سے کسی وطنی جذبہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔

خلافت اور ... EXTRA TERRITORIAL PATRIATISM... (بیرون ملکی حب الوطنی) دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ غیر ملکی وطن پرستی میں جارحانہ وطنیت کا عنصر شامل ہے اور اس کی بنیاد مادی ہے جبکہ خلافت خالص مذہبی اور دینی اور روحانی چیز ہے اور اس کا وطن دوستی سے ذرہ برابر بھی تصادم نہیں ہے۔

وقت کے تقاضوں نے انگریز کی سو سال کی محنت کو اگر اکارت نہیں کیا تو کم از کم پوری طرح وہ پھل نہیں لایا۔ یہ تو ہوا کہ ترکی اپنی عظیم مملکت سے محروم ہو گیا۔ یہ بھی ہوا کہ عرب ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ یہ بھی ہم نے دیکھا کہ جن عربوں نے ترکی سے بغاوت کی وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیے گئے۔ اور شام وغیرہ پر یورپ کی حکم برداری اس ذلت خیز شرط کے ساتھ حاوی کی گئی کہ ان کو تہذیب اور اپنا انتظام خود کرنے کا فن سکھانا ہے۔ لیکن آج ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ یہ سب آزاد ہو چکے ہیں۔

حکم برداری کے قیام کے کچھ ہی دن بعد وہاں احتجاج شروع ہو گیا تھا اور فرانس سے بیک بینی و دو گوش جانے والا تھا۔ اسی پر علامہ اقبال نے لکھا تھا ؂

شاہ سے ہونے کو رخصت ہے وہ ظلم یزل — لکھ کے بھیجا ہے کہ سارے قاعدے بالائے طاق
یا اگر سچ ہے تو ہے کس درجہ حیرت کا مقام — رنگ یک پل میں بدل جاتا ہے یہ نیلی رواق
حضرت کرزن کو کچھ فکر مسند و اب مزید — حکم برداری کے عہدے میں ہے درد لایطاق

تحریکِ خلافت کے انعامات و تاثرات

تحریک خلافت نے ہندوستان کو اور ہندوستان کے مسلمانوں کو کیا دیا، اس کا تذکرہ جستہ جستہ مختلف مقامات پر آیا ہے لیکن یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مجملاً کل کو اس طرح نمبروار یکجا کر دیا جائے کہ بات مکمل اور ذہن نشین ہو جائے چنانچہ ذیل میں اس کو بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) تحریک خلافت نے ہندوستان کے تمام باشندوں کو خواہ وہ کسی مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں ہندو ہوں یا بودھ، جینی یا برہمو سماجی سناتن دھرمی ہوں یا آریہ سماجی سکھ عیسائی پارسی ہوں یا مسلمان سب کو پردۂ غفلت سے نکال کر زنگ کا لوث دور کرنے کی جستجو دی اور ان کی نظرت کی نگاہ میں آزادی ہمکنار کیا۔ اس بات کی مزید وضاحت کے لیے اس زمانے کے ماحول اور عام فکر اور دماغی و ذہنی حالات پر گہری نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ آج ہم ذہنی آزادی کی جس منزل پر پہنچ گئے ہیں اس کے پیش نظر اس پستی کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کا ہر فرد انگریز کے اس جادو کا شکار ہو گیا تھا کہ انگریز اپنی تعلیم اور تہذیب میں ہم سے بہت بلند ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ مہذب اور ہم غیر مہذب ہیں اور وہ ہمیں دنیا کو جہل و کم فہمی سے نکال کر انسانیت کے اس اعلیٰ معیار پر پہنچانا چاہتے تھے جہاں سفید فام باشندے پہنچ گئے ہیں اس لیے ہم اس پر راضی ہو گئے تھے کہ ان سے ان کی تہذیب سے اکتساب فیض کریں۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے کو ہندوستانی کہنے میں شرم اور تاج برطانیہ کی رعایا قرار دینے میں عظمت محسوس کرتا ہے۔ اس میں کسی کی تخصیص یا تجزیہ نہ تھی اور نہ کوئی استثنا تھا۔ مسلم لیگ وغیرہ کی تو بات ہی کیا تھی سر سید خصوصیت سے اس کے شکار تھے۔ ان کی تحریک علی گڑھ کا مفصل ذکر آ چکا ہے۔ جس کسی نے سرسید کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سرسید انگریزوں کو بہت مہذب اور شریف اور ہندوستانیوں کو غیر مہذب اور گنوار سمجھتے تھے۔ مثلاً وہ انگریزوں کے میز پر چھری کانٹے سے کھانے کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ اور ہندوستانیوں کے دسترخوان کا طریقہ وحشیانہ اور دقیانوسی قرار دیتے ہیں۔ غسل کرنے کے طریقہ کا، طشت میں ہاتھ منہ دھونے اور کلی کرنے کے انداز کا طرح طرح سے مذاق اڑایا ہے۔ انگریزوں میں جو بے جا شرم اور تکلف کسی سے ملنے میں ہے کہ جب تک کوئی تعارف نہ کرائے وہ کسی اجنبی سے خطاب نہیں کرتے۔ اس کا مقابلہ ہندوستان کی بدگوئی اور بے تکلفی

سے کرتے ہوئے اس طرح مذاق اڑاتے ہیں کہ ہندوستانی یہاں تک دریافت کرتے ہیں کہ کیا آپ بدھ کے دن انڈے کھاتے ہیں۔ یہی حال خط نویسی کا ہے۔ انگریز اگر کم شناسائی ہو تو صرف "ڈیئر سر" لکھ دیتے ہیں۔ اور ہندوستانی سب سے القاب و آداب میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ اسی کتاب میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر جگہ اور ہر مجلس میں ایک جذبہ کارفرما ہے کہ ہم برطانیہ کی رعایا ہیں گویا کہ ایک طے شدہ بات ہے اور اس میں شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ انگریز کا جال ایسا پھیل گیا تھا اور ہمارے سب لوگ اس طرح احساس کمتری کے شکار ہو گئے تھے کہ اگر کسی کو گورنمنٹ راجہ کا خطاب دے دیتی تھی تو وہ تو رنگا کر مسند پر اس طرح بیٹھتا تھا گویا وہ واقعی مطلق العنان راجہ ہے اور اس کے بزرگ (چچا وغیرہ) سب اس کے سامنے مودب آتے تھے اور اس کو "مہاراج" کہتے تھے۔ دماغوں میں اس طرح کا خلل ڈال دینا انگریز کی عظیم فسوں کاری تھی۔

کانگریس کے معتدل لیڈر جو مطالبے کرتے تھے وہ چند حقوق کے بارے میں تھے۔ انگریزی غلامی سے نجات کے بارے میں نہیں تھے اور اسی کو اس وقت بڑی بیباکی ہوئی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا مولانا حسرت موہانی نے جب آزادی کامل کا نعرہ لگایا تو ان پر انگریزوں کی عدالت میں بمبئی ہائی کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ ماسوا اللہ سے خوف نہ کرنے والا یہ درویش بوریہ نشین مرد خود آگاہ و حق پرست ذرا بھی نہ سہما اور اپنا مقدمہ خود بحث کیا۔ وکیل بھی نہ رکھا۔ انگریز جج نے فیصلہ دیا کہ محض خیال کی تبلیغ کوئی جرم نہیں ہے اور چونکہ ملزم نے کوئی فعل ایسا نہیں کیا جس سے آزادی کامل قائم ہو جائے اس لیے بری کر دیا۔ لیکن مولانا یہ واحد استثنا ہے۔ لوکمانیہ تلک نے ضرور کہا کہ "سوراجیہ ہمارا حق ہے" اور وہ ضرور انتہا پسند تھے لیکن کانگریس میں ہمیشہ ان کی اقلیت رہی۔

تحریک خلافت نے علی گڑھ تحریک کو پارہ پارہ کر دیا۔ برطانیہ کے رعایا ہونے کے خیال کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ہندوستانی ہونے اور اپنے کو ہندوستانی کہنے پر فخر کرنا سکھایا۔ دلوں کی کدورتوں کو دھویا اور ارفع و اعلیٰ خودداری اور خود اعتمادی کے خیالات پیدا کیے۔ تحریک خلافت نے ان سب کا بیج بو دیا تھا جو پروان چڑھ کر اب تناور درخت بن گیا ہے۔ اس نے دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا سکھایا اور انسان کو غلامی سے نکال کر آزادی کامل کی وادی میں لا کھڑا کیا۔ میدان تحریک خلافت ہی نے آراستہ کیا۔ منزل کی نشاندہی اسی تحریک کی بدولت ہوئی۔ یہ دیوانگی از خود رفتگی یہ اپنے وجود کے احساس کی نعمت خلافت تحریک کی دین ہے۔ انفرادی قربانیوں اور آزادی کے لیے مر مٹنے کی آرزو سرے سے مفقود نہ تھی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ عام بیداری جمہور تحریک خلافت ہی سے پیدا ہوا

اور اس کی دو وجہیں تھیں۔

الف) پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست اور دول متحدہ کی اسلام دشمنی سے اب آخری وقت آگیا ہے اور مسلمانان ہند میں یہ احساس پیدا ہوگیا تھا کہ دنیا میں ایک ملت کی حیثیت سے جس کے پاس طاقت دفاع بھی ہو ان کا وجود خطرے میں ہے اور اس سے یہ بھی خطرہ ہوتا ہے کہ ان کی مقدسات کی حفاظت کا کوئی سامان نہ رہ جانے والا ہے۔ واللہ علم کیا ہو جائے۔ اس پر مسلمانوں نے آخری خندق کی لڑائی لڑنے کا فیصلہ کیا اور برطانیہ کے مقابلہ میں بڑے جوش و اشتعال کے ساتھ میدان جما دیا۔

ب) تحریک خلافت کو مسلمانوں کا مذہبی اور دینی خوش نصیب عظیم، راست گفتار و راست کردار بلند ہمت اور جری قائد مل گیا۔ مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا آزاد سبحانی، مولانا احمد سعید، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی وغیرہ جیسے شعلہ بیان مقرر اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، مفتی کفایت اللہ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں جیسے اہل علم اور ہندوستان کے تمام مسلم و غیر مسلم لیڈر مہاتما گاندھی جی کے ساتھ ہوگئے اور تحریک خلافت تحریک آزادی ہند میں تبدیل ہوگئی۔ اپریل 1924ء کے ینگ انڈیا میں گاندھی جی نے خود لکھا:

"خلافت کی یہ تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی اب میں بیدار سے سونے نہ دوں گا۔"

اور واقعہ یہ ہے کہ اس عظیم احساس نے قوم کو جاگتے ہی رکھا تا آنکہ آزادی کا آفتاب طلوع ہوگیا۔

وطنی جذبہ

تحریک خلافت نے مسلمانوں میں ایک عظیم وطنی جذبہ پیدا کیا۔ ان کو محسوس ہوا کہ وہ ایک بڑی طاقت ہیں اور اگر وہ اس طاقت کو استعمال کریں تو برطانیہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینک سکتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی محسوس ہوا کہ اس طاقت کے استعمال کے لیے ملک کی تمام جماعتوں سے اتحاد و اتفاق لازمی ہے ہجرت کی تحریک جس طرح ناکام ہوئی اس نے بھی مسلمانان ہند میں اپنے ملک اور وطن سے محبت کے احساس کو تیز کر دیا۔

جو نظارہ ہندو مسلم اتحاد کا خلافت تحریک کے زمانہ میں آنکھوں کے سامنے آیا اس کو پھر دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئیں۔ تحریک آزادی نے عوام کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب صرف ایک جذبہ کارفرما

تھا کہ انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے اور اس لیے سارا ہندوستان پھٹے کپڑوں ننگے سر اور ننگے پیر والے رضاکاروں سے بھر گیا۔ لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر نکل آئے اور صرف تین نعرہ ہندو مسلمان مل کر لگاتے تھے "اللہ اکبر" مہاتما گاندھی کی جے۔ مولانا محمد علی کی جے۔ کالجوں اور اسکولوں سے ہندو اور مسلمان لڑکے نکل پڑے اور دوش بدوش کام شروع کر دیا۔ ایک لہر تھی جو موج دریا کی طرح رواں دواں تھی کہیں اختلاف یا منافرت کا ایک دوسرے سے نام و نشان نہ تھا۔

حب الوطنی کا یہ بھی تقاضا ہے کہ انسان کو اپنے وطن کی بنی ہوئی چیزوں سے محبت ہو۔ انگریز اپنے بدیشی مال اور خاص کر کپڑے سے جو لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیے ہوئے تھا اس کا پورا جواب کھدر چرکھے و سودیشی سے دیا گیا۔ بدیشی کپڑوں کی گاؤں ہولی منائی گئی۔ اس کی مذمت میں گانے لکھے گئے۔ ہائے ہائے "توبہ توبہ" کے نعرے لگے اور ہندوستان اپنے کو کپڑوں کے معاملے میں خود کفیل بنانے کی منزل کی طرف چل پڑا۔

تحریک خلافت نے ہندوستان کے اندر ایک عام جذبہ منزل آزادی کامل کی جانب عزم و ہمت سے چلنے کا اور راہ کی مشکلات و مصائب پر استقامت بالحق اور تمنائے سرفروشی سے کام کرنے کا عملی سبق دیا ہم چلے اور گرے ہم کو ٹھوکریں لگیں ہمارے لیڈروں نے غلطیاں کیں لیکن جو کارواں روانہ ہوا تھا اس کا بانگ جرس خاموش نہیں ہوا۔ اور اس جذبہ کو تحریک خلافت نے جنم دیا تھا۔

شعرا نے اپنے کلام سے جوش بھر دیا۔ علامہ شبلی تو راہی ملک بقا ہو گئے مگر ان کی نظم ولولہ تازہ دینے کے لیے باقی رہ گئی۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک — چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے — فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو — یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی — دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

مولانا ظفر علی خاں ایک بڑے لیڈر اور ایک عظیم صحافی بھی تھے مگر سب سے پہلے وہ شاعر تھے۔ ہندوستان کے ایک ممتاز اور نامور عالم مولانا داؤد غزنوی جب گرفتار ہوئے تو انھوں نے خود اپنے پیروں سے چل کر جیل جانے اور جیل سے آنے سے محض بعض طبع اور انگریز سے اظہار حقیقت کے لیے انکار کر دیا تو ان کو دو کانسٹبل کندھے پر اٹھا کر لاتے اور لے جاتے۔ ظفر علی خاں کو اس سے اچھا مواد کہاں مل سکتا تھا۔ فرمایا

دی حضرت داؤد کو جو زحمت پولیس نے — احباب نے پوچھا بہ تبسم کہ یہ کیا ہے

کیوں روش حکومت پہ چلے ہو کے سر آپ — حضرت کی سواری کا وظیفہ یہ نیا ہے
سن کر کے یہ فرمایا کہ جب عالم دیں ہوں — در مرتبہ سرکار میں عادۃ کا گزرا ہے
کیوں آج یہ خوش ہو کے مری ران کھینچے — خود حضرت عیسیٰ کی سواری کا گدھا ہے

لاہور میں لارنس کا مجسمہ کھڑا تھا، پبلک اسے "توڑ ڈالنا" چاہتی تھی۔ گورا فوج کا پہرہ لگا رہتا تھا۔ اسی درمیان ہندو اور مسلمانوں نے مل کر میونسپلٹی کی زمین پر مسجد اور مندر بنا دیا۔ مسلمانوں نے مندر ڈھایا اور ہندوؤں نے مسجد۔ گورنمنٹ نے مسجد اور مندر دونوں کو گرا دیا۔ ظفر علی خاں کا طنز دیکھیے۔

اک روز میں نے عرض یہ سرکار سے کیا — لے دے کے مجھ کو تجھ سے مجال سخن نہیں
اے وہ کہ ہے زمیں تری ہیبت سے دم بخود — اور آسمان کو حوصلۂ دم زدن نہیں
سنتے ہیں تیرے دور میں قانون کا ادب — تر مسجد و دیانت مندر کسی نہیں
پھر کیوں خدا کے گھر کو ڈھایا حضور نے — بت پر حضور کس لیے ہوئے برزن نہیں
مجرم یہ بت بھی ہے جو خدا سے تعصو دار — اس کا بھی اعتراف ہے حاجت جتن نہیں
نادم ہے سوال کو اس عذر لنگ سے — سرکار سے جواب کچھ آیا جو بن نہیں

انگریز وحشیانہ تعصب سے پاک ہے
محمود غزنوی کی طرح بت شکن نہیں

علامہ اقبال کی تحریک پر کچھ نہیں کہہ رہے تھے ظفر علی خاں نے ان پر بھی نظم لکھی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا

ع تو خلافت کے مضامین تو پامال نہیں

مسلم لیگ اگرچہ سیاسی نہیں تھی مگر تھی وہ جب تعلقہ داروں اور سرمایہ داروں کی جماعت۔ اس کے اراکین کوئی عملی حصہ نہیں لے رہے تھے اور حقیقت تو یہ تھی کہ خلافت کمیٹی نے مسلم لیگ کو عضو معطل بنا دیا تھا۔ 1922ء میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ سر آغا خاں ہندوستان صلح کرانے کے لیے آ رہے ہیں۔ اور وہ مسلم لیگ کو آلۂ کار بنا دیں گے۔ ظفر علی خاں نے فوراً کہا ؎

سنتے ہیں کہ کرزن کے ستارے پہ سر آغا — ظلمت کدۂ ہند کو آباد کریں گے
وہ لیگ برس بھر میں بدلتی ہے جو کروٹ — اس مرتبہ آپ اس میں کچھ ارشاد کریں گے
خسرو سے چھڑائیں گے ادھر دامن شیریں — شیریں کو ادھر مائل فریاد کریں گے
کہہ دو یہ سر آغا سے کہ اسلام کے فرزند — خود اپنے خدا سے طلب امداد کریں گے
ہرگز نہ گدائی کے لیے جائیں گے لندن — ترک آج سے یہ شیوۂ معتاد کریں گے

اسلام کے دربار سے جو فیصلہ ہوگا
انگریز اسی فیصلہ پر صاد کریں گے

مولانا حسرت موہانی تو پکے سیاسی آدمی تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد حصول آزادی کامل تھا۔ ان کی شاعری تو انگریز دشمنی اور مجاہدانہ عمل کے جذبہ سے بھری ہوئی ہے ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی　　اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

روح کو محو جمال رخ تاباں کرلیں　　ہم اگر چاہیں تو زنداں کو گلستاں کرلیں

ہے تو کچھ اکھڑا ہوا بزم رقیباں کا رنگ　　اب یہ شراب و کباب دیکھیے کب تک رہے
حسرت آزاد پر جور غلامان وقت　　از رہ بغض و عناد دیکھیے کب تک رہے

گاندھی جی کے بعد حسرت بھی گرفتار ہوئے اور سابرمتی جیل میں بند کیے گئے۔ وہاں ایک غزل کہی۔

کچھ یاد بھی ہے وہ عہد سابق　　اے دشمن دوستان صادق
کچھ بات ہے سبب حسن ظن کی　　ہے جور ترا کرم پہ فائق
حسرت کو دیار عاشقی کی　　زنہار نہیں ہوا موافق

یہ تو بڑوں کا حال تھا۔ ایک ظریف شاعر "احمق پھپھوندوی" سے زمیندار میں اپنی مزاحیہ نظمیں بھیجیں۔ غلام رسول مہر مرحوم سے ساتھ وہاں جو مُنت پذیر تھے ان کی رائے ہوئی کہ ان کو بڑھاوا دیا جائے۔ چنانچہ ان کی نظموں پر وہ اصلاح دے کر اسے شائع کیا کرتے۔ رفتہ رفتہ اکثر اخبار زمیندار میں ان کی نظمیں آنے لگیں اور وقت کے ساتھ کلام پختہ ہوتا گیا اور آخر میں تو بہت اچھے مزاحیہ شاعر ہوگئے تھے۔ تحریک خوب لکھی جیل بھی گئے۔ اب انتقال ہو چکا ہے۔ ان کا ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے۔ ع

جیل خانہ میں ہے سسرال کی لذت احمق

تک بندیاں تو اتنی ہوئیں کہ ان کا شمار نہیں۔ ہر شخص اپنی طبیعت کی جولانی دکھاتا تھا۔ ایک صاحب نے جب حیدرآباد میں تقریر کرتے ہوئے امیر فیصل پر اعتراض کرنا چاہا تو کہا کہ ع "امیر فیصل جو اک مرد فضول ہے"

انگریز سے دشمنی

عیسائیوں کا ایک اصول ہے اپنے دشمنوں سے محبت کرو۔ مہاتما گاندھی تو خیالات و افکار

اور اصول کی ایورسٹ کی چوٹی سے بات کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میں انگریزوں سے کوئی عداوت نہیں رکھتا میں تو صرف نظام حکومت کی مخالفت کرتا ہوں جو شیطانی ہے۔ مگر جب بیداری عوام کا مرحلہ سامنے تھا و اس بلندی سے تو کام ہو نہیں سکتا تھا۔ اپنے ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کے لیے آقایان فرنگ سے نفرت پیدا ہو جانا لازمی تھا جو اس شیطانی حکومت کے بانی تھے۔ کوئی چاہے یا نہ چاہے خلافت تحریک کا ایک تحفہ انگریز دشمنی بھی تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن تو اس معاملہ میں سب سے آگے تھے اور انہی کے ساتھ تمام تحریک خلافت میں کام کرنے والے اس معاملہ میں ان کے پیرو تھے۔ چنانچہ انگریز سے دشمنی پیدا کرنے کے لیے طرح طرح کے افسانے اور واقعات گھڑے جاتے تھے۔

گاندھی جی تو روحانیت، اخلاق، صبر، درگزر اور عفو و کرم کی بات کرتے تھے اور دلوں کی گہرائی سے کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ ان اقوال پر مضبوط تھا۔ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ اگر کوئی تمہیں دھوکا دے تو پھر اس پر بھروسہ کرو اور پھر دھوکا دے تو پھر بھروسہ کرو۔ دھوکا دینے والا گھاٹے میں ہے دھوکا کھانے والا فائدہ میں ہے۔ اور گاندھی جی کی تعلیم بے اثر بھی نہیں رہی۔

ہندوستان اس خون خرابے سے بچ گیا جس سے فرانس، روس اور چین اپنے انقلاب کے دوران گزرے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اسامیوں نے زمینداروں کا اور مزدوروں نے سرمایہ داروں کا خون نہیں بہایا جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ہوا۔ تحریک خلافت نے وہ پردہ جو ذہنوں پر پڑا ہوا تھا ہٹا دیا اور مسلمان کھل کر سامنے آگیا۔ جو پیغام تحریک خلافت نے دیا وہی ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد بنا اور اسی پر آئندہ جدوجہد کا تعمیر ہوا جس سے ہم آزادی کامل سے دوچار ہوئے۔ گاندھی جی کی قیادت میں مسلمانوں نے عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا اور وہ سمجھتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد اور سودیشی کھدر چرخہ کی راہ سے وہ انگریز کو نکال سکیں گے۔ ان کی اسکیم یہ تھی جو مولانا محمد علی بار بار دہراتے تھے کہ اگر ہم انگریز کو ہندوستان سے خارج کر دیں تو اس کا نوآبادیاتی نظام درہم برہم ہو جائے گا اور دوسرے ممالک بھی آزاد ہو جائیں گے تو انگریز اپنے چھوٹے سے جزیرہ میں جا کر بند ہو جائے گا جو یوپی سے بھی کم ہے اور جس میں آلو کے سوا کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح انگریزوں نے بلاد اسلامیہ کو جو زبردست نقصان پہنچایا ہے اس کا بھرپور انتقام بھی مل جائے گا اور آئندہ کے خطرے سے بھی ہم محفوظ ہو جائیں گے۔ مولانا محمد علی بار بار کہتے تھے کہ چرخہ ایک توپ ہے جس کا گولہ براہ راست برطانیہ کے قلب پر گرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تحریک آزادی میں آگے آگے ہو گیا اور سارا ہندوستان جاگ اٹھا۔ تحریک خلافت کا یہ سب سے بڑا عملی نتیجہ تھا۔ یعنی تحریک خلافت ختم ہو کر کل ہندوستان کو تحریک آزادی وطن دے گئی۔

سادگی اور خود آگاہی

علم النفس کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ انسان کا باطن اس کے ظاہر سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی لیے انگریزی کی ایک مثل ہے "درزی انسان کو شریف بناتا ہے" یعنی کسی کو اچھے کپڑے پہنا دو تو وہ مہذب کلام اور مہذب عمل کرنا شروع کر دے گا۔ ہندوستان کی غلامی کا نتیجہ یہ تھا کہ اپنی تمام روایات سے بیزاری پیدا ہوگئی تھی۔ اسی میں اپنا لباس بھی شامل تھا۔ انگریزوں کی طرح کا لباس پہننا، انگریزی بولنا اور ہر بات میں انگریز کی تقلید کرنا طرۂ امتیاز شمار ہوتا تھا۔ یہ گاندھی جی کی عظیم ذہانت اور ان کے تفکر و تدبر کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے چرخہ کھدر اور سودیشی کو رواج دیا اور بیک جنبش سارا مغربیت کا قلعہ مسمار ہوگیا۔

مسلمانوں میں تقلید فرنگ اور امارت پسندی و وجاہت طلبی کا زور دوسروں سے زیادہ تھا گاندھی جی کی تعلیم کے ماورا مسلمانان ہند جو دل کھول کر طرابلس الغرب اور بلقان کی جنگ میں اپنے جذبات کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ اب اس وقت جب ترکی کی عظیم الشان سلطنت پارہ پارہ ہو رہی تھی اور حجاز مقدس تک اغیار کے قبضہ میں جانے والا تھا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ یہ سب محض ان کی بداعمالیوں اور سیہ کاریوں کے نتائج تھے۔ اس لیے سب کی جبین نیاز بارگاہ قدس کی چوکھٹ پر جھک گئی تھی اور سب نے احکام الٰہیہ کے سامنے سر خم کر دیا تھا۔ اس میں پہلی چیز جو نظر آتی تھی وہ یہ کہ تقریباً سب نے سروں کے انگریزی بال کٹا دیے۔ کرتا پائجامہ بغل میں ایک جھولا اور گاندھی ٹوپی اختیار کر لی اور سادہ سے سادہ زندگی گزارنے لگے۔

لباس کی سادگی اسلام کی خصوصیات میں ہے۔ مسلمانوں نے یہ سادگی مذہبی نقطۂ نظر سے اختیار کی تھی۔ اس سے خیالات میں بلندی، فکر میں پختگی اور ذہن میں حق شناسی کے جذبات پیدا ہوئے۔ مسلمانوں نے گاندھی ٹوپی بھی اختیار کر لی۔ انگریز کے پٹھو جو ہر جگہ اسلام کا نام محض انگریز کی حمایت کے لیے لیتے تھے فوراً دوڑ پڑے اور کہا کہ گاندھی ٹوپی کا پہننا جائز ہے؟ جواب دیا گیا لیکن سب سے زیادہ موثر جواب یہ تھا کہ خود علماء نے گاندھی ٹوپی پہن لی ہے۔

عصر جدید

خلافت کی تحریک نے اس عہد نو کی خبر دی جو پرانے معتقدات اور اقدار زندگی کو پارہ پارہ کر کے ایک نئے زمانہ کو جدید خیالات و افکار کے ساتھ وجود میں لانے والا تھا جب انسان استبداد اور استعماریت جاگیرداری اور غلامی کی تاریکی سے نکل کر آزادی انصاف مساوات اور خودگری و خودنگری کی شعاع نور میں

داخل ہونے والا تھا۔ علامہ اقبال کی دیدہ وری نے اس کی پیشین گوئی کر دی تھی۔

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک ۔۔۔ نوجواں اقوام نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش

آج ایشیا اور افریقہ خواب سے بیدار ہو چکے ہیں بے شمار آزاد سلطنتیں بن گئی ہیں۔ یورپ کی استعماریت ان کا غرور، معنی تہذیب ان کی طاقت و قوت کا زور ان کا سیاہ فام باشندوں پر حکومت کرنے کا حق غرضیکہ ہر وہ چیز جو دراصل بلا اور آفت تھی لیکن شرافت اور خدمت کا فرضی لبادہ اوڑھے تھی فنا ہو چکی ہے۔ برطانیہ کو ناز تھا کہ ان کی مملکت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ آج ان کے چھوٹے سے ملک پر کہر چھایا ہوا ہے۔ غرضیکہ خلافت کی تحریک وہ پہلا قدم تھا جس نے افریقہ اور ایشیا کی آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے دیکھا جس سے وہ آج تک بے خبر تھے کہ:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی ۔۔۔ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا ۔۔۔ جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس ۔۔۔ کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم ۔۔۔ حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

اس نقطۂ نگاہ سے تحریک خلافت پر نظر ڈالنی چاہیے۔ ناشکری ہوگی اگر مہاتما گاندھی کا بھی ذکر نہ کیا جائے۔ جس عہد نو کا پیغام لے کر تحریک خلافت آئی تھی اسے عملی جامہ پہنانا اور اسے فروغ دینے کا کام اسی مرد خود آگاہ اور درویش خو کا کام تھا جو تدبر و فراست کے ساتھ حقانیت، سچائی، جرأت اور بہادری انسانیت سے محبت اور جد و جہد میں پامردی کا مجسمہ تھا اور اس کی قیادت نے وہ کام انجام دیا جس کا نعرہ تحریک خلافت نے دیا تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ اگر تحریک خلافت کو اس عظیم انسان کی قیادت میسر نہ ہوتی تو نہ تحریک خلافت کا وجود ہوتا اور نہ اس کے ہمہ گیر اثرات پیدا ہوتے اور غالباً یہ ملک ہندوستان بھی آزادی کامل سے اس قدر جلد ہمکنار نہ ہوتا۔

کتابیات

۱۔ آپ بیتی، حصہ اول	ظفر حسن ایبک
2۔ آپ بیتی، حصہ دوم	" "
3۔ آتم کتھا	ڈاکٹر راجندر پرشاد
۴۔ آثار جمال الدین افغانی	قاضی محمد عبدالغفار
5۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
۶۔ امارت شرعیہ	مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی
۷۔ اسرار خودی	علامہ اقبال
۸۔ اسباب بغاوت ہند	سر سید احمد خاں
۹۔ پیام مشرق	علامہ اقبال
۱۰۔ تاریخ انگورہ	محمد الدین فوق
۱۱۔ تبرکات آزاد	غلام رسول مہر
۱2۔ جمعیۃ العلماء پر ایک تاریخی تبصرہ	مولانا حفیظ الرحمٰن
13۔ جمعیۃ العلماء کیا ہے حصہ اوّل	مولانا سید محمد میاں
۱۴۔ جمعیۃ العلماء کیا ہے حصہ دوم	" "
15۔ حسرت	ڈاکٹر احمر لاری
۱۷۔ حیات سلیمانی	شاہ معین الدین احمد ندوی
18۔ خلافت اور انگلستان	ڈاکٹر سید محمود (ترجمہ از انگریزی)
19۔ خطبہ صدارت مولانا محمد علی مونگیری (اجلاس جمعیۃ علماء بہار)	بہ تحریر سید شاہ نور الحسن ناظم مجلس استقبالیہ
20۔ خلفاء راشدین	شاہ معین الدین احمد ندوی
21۔ خلافت و ملوکیت	ابو الاعلیٰ مودودی
22۔ ذکر آزاد	عبدالرزاق ملیح آبادی

23۔ رموز بے خودی	علامہ اقبال
24۔ روداد چمن	مولانا محمد علی مرتبہ محمد شمس العارفین
25۔ رئیس الامرار	عزیز الرحمن جامعی
26۔ سیاسیات ہند 1832 لغایۃ 1932	ترجمہ سرجان کننگ
27۔ سیرۃ محمد علی	رئیس احمد جعفری
28۔ علمائے حق حصہ اول	مولانا سید محمد میاں
29۔ علمائے حق حصہ دوم	" "
30۔ کمال اتاترک	محمد توفیق
31۔ محمد علی حصہ اول (ذاتی ڈائری کے چند ورق)	مولانا عبد الماجد دریابادی
32۔ محمد علی حصہ دوم (ذاتی ڈائری کے چند ورق)	" "
33۔ محمد علی کی یاد میں	صباح الدین عبد الرحمن
34۔ مقالات محمد علی حصہ اول	مرتبہ رئیس احمد جعفری
35۔ مقالات محمد علی حصہ دوم	" "
36۔ محکمہ قضا	مولانا عبد الصمد رحمانی
37۔ مسئلہ امارت	" "
38۔ مسئلہ خلافت	امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد
39۔ مضامین محمد علی	مرتبہ محمد سرور
40۔ مقالات جمال الدین افغانی	سید مبارز الدین رفعت ایم۔ اے
41۔ مولانا محمود حسن	اقبال حسن
42۔ نقش حیات جلد اول	مولانا حسین احمد مدنی
43۔ نقش حیات جلد دوم	" "
44۔ برہان ستمبر 1972ء	دہلی
45۔ زمیندار 1921ء لغایۃ 1923ء	لاہور
46۔ مشرق 1918ء لغایۃ 1922ء	گورکھپور
47۔ معارف نومبر 1972ء لغایۃ 1973ء	اعظم گڑھ